رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

علمی خطبات

حصہ اول

خطابات

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

مرتب

محمد سعید پالن پوری

استاذ جامعۃ الانور دیوبند

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : علمی خطبات حصہ اول
خطابات : حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند
مرتب : محمد سعید پالن پوری استاذ جامعۃ الانور دیوبند
08057477475
طباعت : محرم الحرام ۱۴۳۱ھ مطابق جنوری ۲۰۱۰ء
کمپیوٹر کتابت : روشن کمپیوٹرز، محلہ اندرون کوٹلہ دیوبند
کاتب : مولوی حسن احمد پالن پوری
M.09997658227
مطبوعہ : ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرس، دریا گنج نئی دہلی 110002

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند
اردو بازار نزد جامع مسجد دیوبند
09358914948-09997866990

مکتبہ حجاز دیوبند

فہرست مضامین

پیش لفظ ۱۷-۲۵

① خطبۂ مسنونہ کے مضامین

خطبہ مسنونہ میں بہت قیمتی مضامین ہیں: ۲۶
اللہ تعالیٰ کی تعریف ۲۷
اللہ سے مدطلبی ۲۷
کوتاہیوں کی معافی ۲۸
آدمی کا نفس برا ہو جائے تو پھر خیر نہیں! ۲۹
بخیلی فطری امر ہے، مگر دل کا بخل بری چیز ہے ۳۰
برے اعمال سے پناہ طلبی ۳۱
جسے اللہ ہدایت دے: اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا ۳۱
نومسلموں کا حال مسلمانوں سے بہتر! ۳۳
جسے اللہ گمراہ کریں اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں! ۳۴
ہدایت وضلالت میں بندے کی مشیت کا دخل ہوتا ہے ۳۴
توحید ورسالت کی گواہی ۳۶
رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی اپنی رسالت کی گواہی دینا ضروری تھا ۳۶
انبیاء پر زکوٰۃ فرض کیوں نہیں؟ ۳۷
عبدیت اور رسالت کا اجتماع ۳۷
سابقہ ادیان اگرچہ برحق تھے مگر اب منسوخ ہیں ۳۸
حضورؐ خاتم النّبیین ہیں ۳۹
نجات کے لئے گذشتہ نبیوں کے ساتھ حضور پر بھی ایمان لانا ضروری ہے ۴۰
کیا نجات کے لئے صرف عقیدۂ توحید کافی ہے؟ (ایک اہم آیت کی تفسیر) ۴۰
جنت کسی کے باپ کی جاگیر نہیں! ۴۱
رسول پر ایمان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟ ۴۳
حضورؐ کی دو ذمہ داریاں ۴۴

مکتبہ حجاز دیوبند

ایمان اور اعمال صالحہ کا بدلہ اس دنیا میں نہیں ۴۴
قیامت کے سامنے حضورؐ کو بھیجنے کا مطلب ۴۵
قرآن ہی کی حفاظت کی ذمہ داری کیوں لی؟ ۴۵
میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے: کا مطلب ۴۶
نزولِ عیسیٰ علیہ السلام سے اعتراض کا جواب ۴۶
حضرت عیسیٰؑ ہی کو کیوں اٹھایا گیا اور انہی کو کیوں اتارا جائے گا؟ ۴۷
ختم نبوت کی تین صورتیں ۴۷
مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت ۴۹
قادیانی دھوکہ ۵۱
ایک اور دھوکہ: کہ نبوت رحمت ہے: اس کو جاری رہنا چاہئے ۵۲
قادیانیوں کے تذکرے کی ضرورت ۵۳
اطاعت کامیابی کی کنجی ہے ۵۳
اللہ ورسول کی نافرمانی اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہے ۵۴

② قرآنِ کریم متقیوں کے لئے راہ نما کتاب ہے

سورۂ فاتحہ کسی پارے کا جزء نہیں ۵۵
قرآن میں کہیں انگلی رکھنے کی جگہ نہیں ۵۶
قرآنِ کریم پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے ۵۸
متقی کون ہے؟ ۵۸
ماہِ رمضان کے روزے کیوں فرض ہیں؟ ۵۹
رمضان میں قرآنِ کریم سے تعلق بڑھاؤ ۶۰
عربوں اور عجمیوں میں فرق ۶۰
قرآن کا ادب ۶۱

③ حدیث اور سنت میں فرق اور حجت سنت ہے، حدیث نہیں

حدیث اور سنت میں فرق ۶۲
حدیث کی تعریف ۶۳

مکتبہ حجاز دیوبند

قولی حدیث کی مثال ۶۳

حدیث إنما الأعمال بالنیات کا تعلق عبادات سے ہے ۶۳

فعلی حدیث کی مثال ۶۵

تقریر نبوی کی مثال ۶۵

بیع سلم کے جواز کی حکمت ۶۶

اوصاف نبوی کی مثال ۶۷

سنت کے معنی ۶۷

نسخ شریعتوں میں ہوتا ہے، دین میں نہیں ہوتا ۶۹

شریعت کے اندر بھی نسخ ہوتا ہے ۶۹

شراب چار مرحلوں میں حرام ہوئی ہے ۷۰

قرآنِ کریم میں کوئی ایسی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو ۷۲

حدیث کی کتابوں میں منسوخ حدیثیں بھی ہیں ۷۳

وہ روایتیں جو صرف حدیث ہیں، سنت نہیں ۷۳

وہ حدیثیں جو نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہیں ۷۵

نکاح میں حضورؐ کے لئے غیر محدود اور امت کے لئے محدود تعداد کیوں؟ ۷۵

اللہ نے عورتوں پر بھاری ذمہ داری نہیں رکھی! ۷۶

تعدد ازدواج مرد کی بھی ضرورت ہے ۷۷

نبی کا خواب وحی ہوتا ہے اور اس کی بھی تعبیر ہوتی ہے ۷۸

غیر مقلدوں کے نزدیک نکاح میں کوئی تحدید نہیں! ۸۰

مغرب سے پہلے نفلیں پڑھنا سنت نہیں ۸۱

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا سنت نہیں ۸۱

ایک لطیفہ ۸۲

حیض کے زمانے میں بیوی کو ساتھ لٹانا سنت نہیں ۸۲

حالتِ حیض میں بیوی سے کتنا قریب ہو سکتے ہیں؟ ۸۳

بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھنا سنت نہیں! ۸۴

ناسمجھ بچوں کو مسجد میں لانا ممنوع ہے ۸۵

سنت کی کسوٹی صحابہ کا عمل ہے ۸۵

زور سے آمین کہنا حنفیہ کے نزدیک سنت نہیں ۸۶

خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کا حکم ۸۷

خلفائے راشدین کی سنتوں کو مضبوط پکڑنے کا حکم کیوں ہے؟ ۸۹

وہ روایتیں جو حدیثیں بھی ہیں اور سنت بھی ۸۹

ضعیف روایات موضوعات کے ہم پلہ نہیں ۹۰

البانی صاحب کا کارنامہ ۹۱

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سنت ۹۲

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنتیں ۹۳

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سنتیں ۹۴

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سنت ۹۴

حدیث یا سنت کا فیصلہ کون کرے گا؟ ۹۵

تقلید صرف تین قسم کے مسائل میں ہے، اور ان میں تقلید کے بغیر چارہ نہیں ۹۵

نص فہمی میں اختلاف کی مثالیں ۹۶

روایات میں بھی اختلاف اور تطبیق میں بھی اختلاف ۹۹

استنباطی مسائل میں اختلاف ۱۰۰

آیتِ وضو میں پانچ استنباطی مسائل اور ان میں اختلاف ۱۰۰

حدیث کے حجت ہونے کی کوئی دلیل نہیں ۱۰۲

اجماع بھی حجت شرعیہ ہے! ۱۰۳

ناچنا نہیں آنگن ٹیڑھا! ۱۰۴

قیاس محض آلۂ استنباط ہے ۱۰۴

ایک چیلنج! ۱۰۴

④ اصلی سلفی اور آج کے سلفی

دین کے دو حصے: عقائد اور اعمال ۱۰۵

مکتبہ حجاز دیوبند

عقائد میں اختلاف صحابہ کے بعد ہوا ۱۰۷
صحابہ کے بعد اختلاف کی وجوہ ۱۰۸
قرونِ ثلاثہ زمانہ کے عرض میں ایک ساتھ ہیں ۱۰۹
دو مکتبِ فکر: حجازی اور عراقی ۱۱۰
دونوں مکاتبِ فکر کا اصلی اور ذیلی کام ۱۱۱
چار مکاتبِ فکر کیسے وجود میں آئے؟ ۱۱۲
تابعین کے دور میں چار گمراہ فرقے وجود میں آئے ۱۱۳
صفات متشابہات اور غیر متشابہات ۱۱۴
صفات کے تعلق سے مختلف فرقے وجود میں آئے ۱۱۵
خلفائے عباسیہ معتزلہ کے خیالات سے متاثر ہوئے ۱۱۶
صفتِ کلام کی بحث ۱۱۶
اصلی سلف اور بعد کے سلف میں اختلاف ۱۱۸
استواء علی العرش کا مسئلہ ۱۱۹
استواء علی العرش میں سلف کا مذہب ۱۲۰
کلام نفسی کی بات ایک تاویل ہے ۱۲۴
سلفی، اشعری اور ماتریدی: سب اہل حق ہیں ۱۲۵
فقہی مکاتب فکر میں سے چار ہی مکاتب برحق ہیں ۱۲۵
اہل حق وہ ہیں جو دونوں سلسلوں سے برحق ہوں ۱۲۷
ہندوستان کے غیر مقلد: سلفی کب سے بنے اور کیوں بنے؟ ۱۲۷
خلاصہ کلام ۱۲۸
اللہ کہاں ہیں؟ ۱۳۰
مچھلی کے ڈبے پر مذبوح کا لیبل! ۱۳۰

⑤ روزے اور زکوٰۃ کے ضروری مسائل

دو قسم کی عبادتیں ۱۳۱
بدنی عبادتیں دو اور مالی عبادت ایک کیوں ہے؟ ۱۳۱

مکتبہ حجاز دیوبند

صوم وصال سے منع کرنے کی وجہ؟ ۱۳۳
حج بدنی عبادت ہے یا مالی؟ ۱۳۴
زکوٰۃ عام مال میں ہے، خاص مال میں نہیں ۱۳۵
زکوٰۃ میں غناء کا لحاظ ہے ۱۳۶
زکوٰۃ اصل مال میں نہیں، بڑھے ہوئے مال میں ہے ۱۳۶
جو اموال گردش میں رہتے ہیں ان میں زکوٰۃ کم رکھی ہے ۱۳۷
سونا، چاندی اور اموال تجارت کا نصاب ۱۳۷
مخلوط اموال کا نصاب ۱۳۸
قیمتی کرنسی میں سونے کا اعتبار ہے یا چاندی کا؟ ۱۳۸
اموالِ زکوٰۃ کے نصابوں کی پانچ اجناس، اور بڑا نصاب ۱۳۹
اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کی زمینوں میں عشر کا مسئلہ ۱۳۹
چھوٹا نصاب اور اس سے متعلق احکام ۱۴۱
تجارت کا مال کونسا ہے؟ ۱۴۱
زکوٰۃ میں کونسا قرض منہا اور کونسا شامل ہوتا ہے؟ ۱۴۲
مصنوعات اور خام مال کا حکم ۱۴۳
تجارتی مال میں اعتبار مارکیٹ ویلیو کا ہے یا خرید قیمت کا یا نفع کا؟ ۱۴۴

⑥ روزوں کے تعلق سے رمضان کی تخصیص

خاص رمضان کے روزے کیوں فرض کئے گئے ہیں؟ ۱۴۵
کپڑا ٹخنے سے اوپر پہننے کی حکمت ۱۴۶
کیا روزانہ کپڑے بدلنے ضروری ہیں؟ ۱۴۷
اصل بات کا جواب نہ دینا اور بات کا رخ پھیر دینا ۱۴۸
میانہ روی سے خرچ کرنا آدھی کمائی ہے ۱۴۹
مال مایۂ زندگانی ہے ۱۵۰
فرد کی مالداری قوم کی مالداری ہے ۱۵۰

مکتبہ حجاز دیوبند

احکام کی سب سے بڑی حکمت اللہ ورسول کا فرمان ہے ۱۵۱
روزے: رمضان ہی کے کیوں فرض ہیں؟ ۱۵۱
قرآنِ کریم کی تین صفتیں ۱۵۲
گفتگو کے مواقع مختلف ہوتے ہیں ۱۵۲
خیر کی طرح شر بھی اللہ کے قبضہ میں ہے ۱۵۴
قرآن میں ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں ۱۵۵
قرآن: فرقان ہے! ۱۵۵
رمضان میں دو چیزیں اہم ہیں ۱۵۵
روزہ اور تراویح مؤمن کے لئے سفارش کریں گے ۱۵۶
بھاری عبادتوں کو آسان بنانے کا فارمولہ ۱۵۶
چند مکفرات جمع ہوتے ہیں تو جلا پیدا ہوتی ہے ۱۵۸
رمضان میں دو نمازیں الگ الگ ہیں ۱۵۹
تراویح کی نماز آسان ہے، لوگوں نے اس کو مشکل بنادیا ہے ۱۵۹

⑦ نمازِ عید سے پہلے خطاب

عید کی نماز اور تکبیرات زوائد کا قرآن سے استنباط ۱۶۱
عید کی نماز کے بعد دعا اور دعا کا ادب ۱۶۲
عید کی نماز کا طریقہ ۱۶۳
خطبہ سننا واجب ہے ۱۶۵
عید کی نماز کے بعد مصافحہ ومعانقہ کا حکم ۱۶۵
عید کے دن شیر خرما کا حکم ۱۶۶
صدقۂ فطر واجب ہے ۱۶۷
شوال کے چھ روزے ۱۶۷

⑧ ختم نبوت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کے بقاء کا سامان کیا ہے ۱۶۸
انسان کی دو ضرورتیں: جسمانی اور روحانی ۱۶۹

نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول ہیں ۱۶۹
تمام انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں ۱۷۰
آدم ونوح علیہما السلام کے درمیان انبیاء کی تعداد ۱۷۱
رسول اور نبی میں فرق کی مزید وضاحت ۱۷۱
نبیوں اور رسولوں کی تعداد کتنی ہے؟ ۱۷۲
حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی ہیں ۱۷۲
لے پالک کی مطلقہ سے نکاح جائز ہے ۱۷۳
ظہار سے بیوی ماں نہیں ہو جاتی ۱۷۳
حضرت زیدؓ کو گود لینے کی داستان ۱۷۳
آپؐ نے متعدد نکاح کیوں کئے؟ ۱۷۶
حضرت سودہؓ سے نکاح خانگی ضرورت سے کیا ۱۷۶
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح بہ اذنِ الٰہی ہوا ۱۷۷
آنحضورؐ نے حضرت خدیجہؓ اور حضرت سودہؓ کے علاوہ تمام نکاح ملی، ملکی اور شخصی مصلحتوں سے کئے ہیں ۱۷۸
حضرت عائشہؓ اور حضرت زینبؓ سے نکاح ملّی مصلحت سے کیا ہے ۱۷۹
ملّی، ملکی اور شخصی مصلحتوں کی مثالیں ۱۸۰
حضرت عائشہؓ سے نکاح کی مصلحت ۱۸۰
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نصف دین کی حامل ہیں ۱۸۱
حضرت زینبؓ سے نکاح لے پالک کی رسم ختم کرنے کے لئے کیا ہے ۱۸۱
منہ بولے بیٹے بیٹی سے پردہ واجب ہے ۱۸۲
حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح ملکی (سیاسی) مصلحت سے کیا ہے ۱۸۲
حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے بھی نکاح ملکی مصلحت سے کیا ہے ۱۸۴
حضرت حفصہؓ سے نکاح حضرت عمرؓ کی دلجوئی کے لئے کیا ہے ۱۸۴
حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی نکاح شخصی مصلحت سے کیا ہے ۱۸۶
نبی ﷺ کسی مرد کے باپ نہیں ۱۸۶

حضور اقدس ﷺ کی دو خوبیاں ۱۸۷

رسول اللہ ہونے کی وضاحت ۱۸۷

خاتم النّبیین کی وضاحت ۱۸۷

آپ ؐ نبوت کے ساتھ بالذات اور دوسرے انبیاء بالعرض متصف ہیں ۱۸۸

عیسیٰ علیہ السلام نبی ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے ۱۸۹

نزولِ عیسیٰ کا ثبوت قرآنِ کریم سے ۱۸۹

انجیل: تورات کا ضمیمہ ہے ۱۹۰

قرآن وحدیث کی تقدیم اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہے ۱۹۰

آپ ؐ خاتم رُتبی بھی ہیں اور زمانی بھی! ۱۹۲

خاتَم (بفتح التاء) اور خاتِم (بکسر التاء) کے ایک معنی ہیں ۱۹۲

⑨ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ایک مقصد نبی ﷺ کی خبر دینا ہے ۱۹۴

احمد وصفی نام ہے اور محمد ذاتی نام ۱۹۵

انجیل میں نبی ﷺ کا وصفی نام احمد ہے ۱۹۵

ویدوں اور پرانوں میں آنحضور ﷺ کی بشارت ۱۹۵

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ختم نبوت کا نمونہ تھی ۱۹۶

عیسائیوں کو لفظ روح اللہ اور کلمۃ اللہ سے دھوکہ ہوا ۱۹۶

ہندوؤں کے عقیدۂ اوتار کی حقیقت ۱۹۷

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ خدا ہیں، نہ خدا کا کوئی حصہ! ۱۹۷

روح اللہ کی حقیقت ۱۹۸

اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے بنایا ۱۹۸

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ۱۹۹

کلمۃ اللہ کی حقیقت اور آیت کی تفسیر ۲۰۰

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا مطلب ۲۰۰

عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی دھوکہ کا سبب بنا ۲۰۱

مکتبہ حجاز دیوبند

اگر بغیر باب کے پیدا ہونا خدائی کی دلیل ہے تو آدمؑ اس کے زیادہ مستحق ہیں ۲۰۲
ہر نوع کا پہلا جوڑا براہِ راست مٹی سے پیدا کیا گیا ہے ۲۰۲
حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر ماں باپ کے کیوں نہیں پیدا کئے گئے ۲۰۴
الوہیت اور احتیاج میں منافات ہے ۲۰۴

⑩ اسلام میں پورے پورے آجاؤ، شیطان کی پیروی مت کرو

دین کی تجدید ۲۰۶
انبیاء کے طریقِ دعوت میں اور مصلحین کے طریقِ دعوت میں فرق ۲۰۷
اسلامی فرقے اور فرقۂ ناجیہ ۲۰۸
فرقۂ ناجیہ کی پہچان ۲۰۸
دین ہمیشہ ایک رہا ہے اور شریعتیں مختلف ۲۰۹
غیر محرم قریبی رشتہ دار سے نکاح جائز ہے ۲۰۹
رشتے کل چار ہیں اور ان رشتوں سے ساری دنیا ایک فیملی ہے ۲۱۰
دلیل نقلی ۲۱۱
دلیل عقلی ۲۱۱
یہ آیت دو عیدوں کے موقعہ پر نازل ہوئی ہے ۲۱۳
اسلام میں پورے آجاؤ ۲۱۵
صرف خود کو دین دار بنالینا کافی نہیں ۲۱۵
لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کا مطلب ۲۱۶
حدیث جبرئیل علیہ السلام ۲۱۸
بھلی بری تقدیر کا مطلب ۲۱۸
تقدیر مفصل ہے، مجمل نہیں ۲۱۹
گواہی کہاں دی جاتی ہے؟ ۲۲۰
گواہی کس طرح دینی چاہئے؟ ۲۲۱
انسان کا کمال کیا ہے؟ ۲۲۲

مکتبہ حجاز دیوبند

خلاصہ کلام ۲۲۳

⑪ دنیا کی زندگی کس مقصد کے لئے ہے؟

تین زندگیاں ۲۲۴
دنیوی زندگی کیوں ہے؟ ۲۲۶
قرض پر وصیت کی تقدیم کی وجہ ۲۲۶
عیسیٰ کی وفات کا پہلے تذکرہ کرنے کی وجہ ۲۲۷
جسم اور روح کے ساتھ آسمان پر جانا خدا ہونے کی دلیل نہیں ۲۲۸
دنیا جہنم بھرنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی ہے ۲۲۸
زمین اتنی خوبصورت کیوں بنائی ہے؟ ۲۲۹

⑫ قیامت کے دن ذرّہ ذرّہ کا حساب ہوگا

انسان کی تین زندگیاں ۲۳۲
روح کیا چیز ہے؟ ۲۳۲
یہودیوں نے تین سوال دیئے ۲۳۳
قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بے شمار بندوں کے گناہ معاف کردیں گے ۲۳۸

مکتبہ حجاز دیوبند

⑬ موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے

ایک غلط فہمی کا ازالہ ۲۴۲
مراحلِ حیات ۲۴۲
روحوں کے نکلنے کی صورت کیا ہوئی؟ ۲۴۳
اخذ میثاق کے بعد روحوں کا مستقر ۲۴۳
آدم علیہ السلام کی جنت میں کوئی اولاد نہیں ہوئی ۲۴۴
حضرت آدم علیہ السلام کیا چیز بھولے تھے؟ ۲۴۴
انبیاء سے گناہ نہیں ہوتا، زلّت ہوتی ہے ۲۴۵
﴿وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ کا مطلب ۲۴۶
زمین اترنے کے بعد آدمؑ کی اولاد ہوئی ۲۴۷

عہدِ الست کی دلیل کیا ہے؟ کسی کو اس عہد کی باتیں یاد نہیں! ۲۴۸
اصحابِ فترت اور شواہق جبال کے رہنے والوں کا حکم ۲۴۹
حساب کتاب اس دنیا میں ہوگا ۲۵۰
قبر میں جزاؤ سزا روح اور جسم دونوں کو ہوتی ہے ۲۵۲

⑭ آخرت کی نعمتیں دنیا کی چیزوں سے بدرجہا بہتر ہیں

دینی مجلس میں بیٹھنے کا ادب ۲۵۵
لوگوں کے لئے دنیا کی چیزیں مرغوب بنائی گئی ہیں ۲۵۵
لوگوں کے لئے دنیا کی چیزیں مرغوب کیوں بنائی گئی ہیں؟ ۲۵۶
دنیا کی چیزیں چند روز استعمال کے لئے ہیں! ۲۵۶
اعمالِ صالحہ کا اجر دنیا میں کیوں نہیں ملتا؟ ۲۵۷
آیتِ پاک کا خلاصہ ۲۵۹
دنیا کی چیزوں سے بہتر جنت کے سدابہار باغات ہیں ۲۵۹
جنت میں پاکیزہ عورتیں ملیں گی ۲۶۰
زمانۂ حیض کے احکام ۲۶۰
جنت کی سب عورتیں پاکیزہ ہونگی ۲۶۰
جن کا دنیا میں نکاح نہیں ہوا ۲۶۱
دنیا کی عورتیں بھی حور ہیں: ۲۶۱
جس عورت کے چند نکاح ہوئے: وہ کس کو ملے گی؟ ۲۶۱
موت سے نکاح ختم ہوجاتا ہے ۲۶۲
غیر محرم میت کا چہرہ دیکھنا ۲۶۳
جنت میں اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی ۲۶۴
آخرت کی نعمتیں کس کو ملیں گی؟ ۲۶۴
ایمان پر غرّہ نہیں چاہئے ۲۶۵
دعائیں ضروری ہیں ۲۶۶

مکتبہ حجاز دیوبند

دعا کی رسم ۲۶۷

دعا میں ہیئتِ اجتماعی اور التزامی ختم کیا جائے ۲۶۷

دعا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے ۲۶۸

باقی آئندہ ۲۶۸

⑮ آخرت کی نعمتیں کن لوگوں کو ملیں گی؟

دنیا کی بہار چند روزہ ہے ۲۶۹

دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۲۷۰

جنت کے لئے کونسے اعمال ضروری ہیں؟ ۲۷۱

صبر کیا چیز ہے؟ ۲۷۱

صبر کی ضرورت کب پیش آتی ہے؟ ۲۷۲

سچ بولنا جنت میں لے جاتا ہے ۲۷۳

مقصد کی پردہ پوشی (توریہ) جائز ہے ۲۷۴

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا توریہ ۲۷۴

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی سادگی کا ایک واقعہ ۲۷۵

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی سادگی کا دوسرا واقعہ ۲۷۶

توریہ کا ایک واقعہ ۲۷۶

توریہ کا دوسرا واقعہ ۲۷۷

چوتھی صفت: اطاعت شعاری ۲۷۸

تکبر کیا ہے؟ ۲۷۸

اللہ کے راستے میں خرچ کرنا جنت نشیں بناتا ہے ۲۷۹

آخرت کو آباد کرنے کی راہیں ۲۷۹

مال خرچ کرنا مشکل کیوں ہے؟ ۲۸۰

خرچ کرنے کی درمیانی راہ ۲۸۰

مال لوگوں کے لئے سہارا ہے ۲۸۰

مکتبہ حجاز دیوبند

مال اللہ کا ہے: بندے اس میں نائب ہیں ۲۸۱
سحری کا وقت قیمتی وقت ہے ۲۸۱
گناہوں کی معافی کے لئے تین شرطیں ۲۸۲

⑯ نیکیوں کا پورا اجر آخرت میں ملے گا

ایمان کے بغیر نیک کام کی آخرت میں کوئی قیمت نہیں ۲۸۴
نیکی اور برائی میں تین فرق ۲۸۵
نیکی کا اجر کتنا بڑھتا ہے؟ ۲۸۶
ثواب کیسے بڑھتا ہے؟ ۲۸۷
عذابِ قبر کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ۲۹۲

مسائل

(۱) بے روزگاری کے وظیفہ کا حکم ۲۹۴
(۲) حکومت بوڑھوں کو جو وظیفہ دیتی ہے: اس کا لینا جائز ہے ۲۹۴
(۳) غریب کے پاس جب تک مال بعینہٖ موجود ہو زکوٰۃ کی نیت کی جاسکتی ہے ۲۹۶
(۴) سونے چاندی کے دانتوں کے ساتھ نماز درست ہے ۲۹۷
(۵) حرام گوشت کا پیسہ بھی حرام ہے ۲۹۸
(۶) ایسی ہوٹل میں ملازمت کرنا جہاں حرام چیزیں بیچی جاتی ہیں ۲۹۸
(۷) کوٹ پتلون کے ساتھ مسجد میں نماز کے لئے آنا ۲۹۹
(۸) روزے میں بھول معاف ہے: نماز میں کیوں معاف نہیں؟ ۳۰۰
لوگ نفل روزے کم کیوں رکھتے ہیں؟ ۳۰۰
نماز میں لاعلمی اور بھول معاف نہیں ۳۰۱
نماز اور روزے میں عقلی فرق ۳۰۱
(۹) وضوء کے تین ضروری مسئلے ۳۰۲
(۱۰) اگر علاج کے لئے بڑی رقم کی ضرورت ہو تو زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟ ۳۰۴
(۱۱) قضاء عمری پہلے پڑھے یا سنتیں نفلیں؟ ۳۰۴

مکتبہ حجاز دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اللہ جل شانہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے اور انھیں گمراہی سے بچانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا، جس کی آخری کڑی فخر کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ آپؐ نے اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچایا اور بندوں کا رشتہ معبود حقیقی سے جوڑا، آپؐ کے بعد علمائے کرام پر یہ ذمہ داری عائد ہوئی، انھوں نے بھی ہر زمانہ میں اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا، کتاب وحکمت کی تعلیم کے ساتھ وعظ وارشاد سے بھی تزکیۂ نفوس فرمایا۔ اور العلماء ورثة الأنبياء کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کردیا۔

انہی عظیم المرتبت علماء میں سے ایک تابندہ شخصیت: محدث جلیل، متکلم اسلام، شارح حجۃ اللہ البالغہ، فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) کی ہے۔ جن کے مواعظ کی یہ پہلی جلد بنام ’علمی خطبات‘ ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے، حضرت موصوف کو حق تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے اور کمالات سے نوازا ہے، آپ کا ذوق لطیف، طبیعت سادہ اور نفیس ہے، مزاج میں استقلال واعتدال ہے، حق وباطل اور صواب وخطا کے درمیان امتیاز کرنے کی وافر صلاحیت رکھتے ہیں اور حقائق ومعارف میں یکتائے زمانہ ہیں، چونکہ حضرت والا نے شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کی مایہ ناز تصنیف ’حجۃ اللہ البالغہ‘ کی شرح لکھی ہے، جس کا نام ’رحمۃ اللہ الواسعہ‘ ہے (یہ شرح پانچ جلدوں میں مطبوعہ اور مقبول خاص وعام ہے) اور ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں پندرہ بیس سال تک اس کا کامیاب درس

دیا ہے، اس لئے حکمت شرعیہ سے آپ کو خاص مناسبت ہے، چنانچہ موصوف کا ہر درس، ہر تقریر اور ہر تحریر علمی نکات ولطائف اور اسرار وحکم سے لبریز ہوتی ہے۔ موصوف آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے رازہائے سربستہ سے اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے جیسے علوم وفنون کا ایک بحر ذخار موجزن ہے، خداوند قدوس نے آپ کو رسوخ فی العلم کے ساتھ مرتب گفتگو کا سلیقہ بھی عطا فرمایا ہے، جس کی نظیر نہ صرف ہم عصروں میں بلکہ زمانہ ماضی میں بھی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ آپ کی ہر تقریر اور ہر تحریر حسن ترتیب اور مشکل کو آسان بنانے میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور گنجینۂ علم وحکمت ہوتی ہے۔

آپ کے سحر آفریں، علم وحکمت سے لبریز، لاجواب اور بے مثال خطابات کو عوام وخواص بہت دلچسپی اور شوق سے سنتے ہیں، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان موصوف مخصوص افہام وتفہیم اور حکیمانہ اسلوبِ بیان کی وجہ سے خاص طور پر مقبول ہیں۔ بظاہر تقریر میں نہ جوش وخروش ہوتا ہے، نہ پُر تکلف انداز بیان، نہ خطیبانہ ادائیں، مگر خطابات اس قدر مؤثر اور مسحور کن ہوتے ہیں کہ سامعین سراپا گوش بن جاتے ہیں اور اہل علم عش عش کرتے ہیں۔

* * *

حضرت والا مدظلہ باہر کے اسفار تقریباً تین دہائیوں سے کر رہے ہیں، سب سے پہلے بولٹن (برطانیہ) کا سفر فرمایا، اس سفر کے محرک جناب مولانا قاری یعقوب صاحب نانجی زید مجدہم بنے۔ قاری صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں۔ اور بولٹن کی مسجد طیبہ کے امام تھے، قاری صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ آپ رمضان میں ہمارے یہاں تشریف لائیں۔ والد صاحب نے جواب دیا: میں آکر کیا کروں گا؟ میں مقرر نہیں ہوں، مدرس ہوں، اور مدرس کی باتیں عام مسلمانوں کے لئے دلچسپی کا باعث نہیں ہوتیں، قاری صاحب نے جواب دیا: ہم نے رمضان المبارک میں تقریر کی درخواست نہیں کی تھی، صرف تشریف لانے اور ساتھ رہنے کی استدعاء کی ہے۔ اب والد صاحب کے لئے انکار کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلا سفر برطانیہ کا اس وقت کیا جب برطانیہ کی ایمبیسی بھی ہندوستان میں نہیں تھی، ویزا ہیتھرو ایرپورٹ پر ملتا تھا۔

جب والد صاحب بولٹن پہنچے تو لوگوں نے تقریر کے لئے اصرار کیا، چنانچہ آپ نے اپنے تدریسی انداز پر تقریر شروع کی، لوگوں نے اس کو بہت دلچسپی سے سنا اور عصر کے بعد جب کہ گرمیوں میں دو گھنٹے کا وقت ہوتا تھا، لوگ روزہ کی حالت میں بہت دلچسپی سے تقریر سنتے تھے، پھر کئی سال تک بولٹن ہی جانا ہوا۔ اور تقریروں کا سلسلہ جاری رہا، اس زمانہ کی زیادہ تر تقریریں محفوظ نہیں۔

اور شہر لندن میں حضرت والا کے ایک پرانے شاگرد جناب مولانا اسماعیل صاحب سیدات زید مجدہم ہیں، جو اسٹامفورہیل کی مسجد قبا کے امام تھے، واپسی میں حضرت والا ان کے گھر ایک دن قیام فرماتے تھے، انھوں نے درخواست کی کہ ایک رمضان حضرت والا ان کی مسجد میں قیام فرمائیں۔ پہلے تو حضرت والا نے انکار کیا اور فرمایا: بولٹن والے کسی قیمت پر اجازت نہیں دیں گے۔ آپ چاہیں تو ان سے بات کر دیکھیں، چنانچہ مسجد قبا والوں نے بولٹن والوں سے بات کی اور باہم مشورہ سے یہ طے پایا کہ حضرت والا ایک سال بولٹن میں رہیں اور ایک سال لندن میں قیام فرمائیں۔ چنانچہ اسی طرح پروگرام چلتا رہا۔

لندن کی مسجد قبا میں غیر مقلدین اور خلافت کمیٹی والے چھائے ہوئے تھے، وہ پورے رمضان پمفلٹ تقسیم کرتے تھے، اور مسجد میں اور مسجد کے باہر ہنگامہ کرتے تھے، چنانچہ حضرت والا نے یکم رمضان سے تقریر شروع فرمائی کہ اسلام میں گمراہ فرقے کیسے وجود میں آئے؟ اور ان کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اِس زمانہ میں گمراہ فرقے کون کونسے ہیں؟ اور ان کے خیالات کیا ہیں؟ یہ تقریر رمضان المبارک کی پہلی رات سے شروع ہوئی تھی اور ستائیسوں رات میں پوری ہوئی، روزانہ تراویح کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیان ہوتا تھا، پورے رمضان مسلسل یہی موضوع چلتا رہا اور لوگ گہری دلچسپی سے سنتے رہے، مگر افسوس کہ یہ تقریر محفوظ نہیں۔

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ اس مسجد سے دونوں فتنے فرو ہوئے، اور کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ حضرت والا سے آکر دوبدو گفتگو کرے، بس ایک مرتبہ خلافت کمیٹی والوں نے گفتگو کے لئے وقت لیا، حضرت نے وقت دیدیا، وہ رات بارہ بجے آئے جب حضرت والا تقریر سے

فارغ ہو چکے تھے، حضرت نے ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا، اور ناشتہ کرایا، ناشتہ سے فارغ ہو کر جب بیٹھے تو ایک نوجوان نے سوال کیا: حکومت اسلامیہ قائم کرنے کا کیا حکم ہے؟ حضرت والا نے جواب دیا: فرض ہے! وہ یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے، پھر کافی دیر کے بعد ان میں سے ایک بولا: جب فرض ہے تو آپ ہمارے کاز میں کیوں شریک نہیں ہوتے؟ والد صاحب نے فرمایا: آپ نے درمیان میں ایک سوال چھوڑ دیا، وہ کہنے لگے: وہ کیا ہے؟ والد صاحب نے فرمایا: اب پوچھو کہ کہاں؟ یعنی حکومت اسلامیہ قائم کرنا کہاں فرض ہے؟ وہ کہنے لگے: ہاں! یہ سوال رہ گیا، والد صاحب نے فرمایا: جہاں اس کے امکانات ہیں وہاں اس کی سعی فرض ہے، جیسے مسلمانوں کے ممالک: مصر، عراق، ایران، ترکی، اردن، بنگلہ دیش، پاکستان وغیرہ ہیں وہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کا امکان ہے، آپ حضرات کو چاہئے کہ وہاں جا کر محنت کریں۔ وہ کہنے لگے: وہاں تو گردن اڑتی ہے، والد ماجد نے فرمایا: پھر یہاں برطانیہ میں جو مسلمانوں کو سکون کا سانس لینے کا موقع ملا ہوا ہے، جہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں، یہاں آپ حضرات ہنگامہ آرائی کر کے مسلمانوں کا سکون کیوں برباد کرتے ہیں؟ وہ یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے، اور ایسے گئے کہ مسجد قبا سے یہ فتنہ بھی گیا۔

کئی سال تک اسی طرح سلسلہ چلتا رہا، پھر ٹورنٹو (کناڈا) میں حضرت والا کے ایک پرانے شاگرد مولانا ابراہیم صاحب شاجی ہیں، انھوں نے والد صاحب کو لکھا کہ ایک رمضان حضرت والا وہاں بھی گذاریں، والد صاحب نے جواب دیا: لندن اور بولٹن والوں سے بات کرو۔ انھوں نے مولانا اسماعیل سیدات صاحب سے بات کی، اور ان کو باصرار راضی کر لیا، چنانچہ کئی سال پہلے آپ ٹورنٹو تشریف لے گئے، اس وقت ٹورنٹو میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، اور مسجدیں بھی دو ایک تھیں۔ چنانچہ آپ نے مولانا سید عبدالحق صاحب کے گھر میں قیام فرمایا۔ اور مصلے مصلے جا کر تراویح کے بعد وعظ کہا، الحمد للہ! اس کے بہت اچھے اثرات ظاہر ہوئے، پھر مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور مسجدیں بھی بنتی گئیں، اور تھورن کلف میں مسجد دارالسلام کا قیام عمل میں آیا، اس کے بعد حضرت والا نے مسجد میں قیام فرمایا، اب طریقہ یہ رہا

کہ ایک سال لندن میں، اور ایک سال ٹورنٹو میں قیام فرماتے تھے، اور لوگوں کی وعظ ونصیحت کے ذریعہ تربیت فرماتے تھے۔

پھر امریکہ کے شہر شکاگو اور نیویارک کے احباب نے درخواست کی کہ آپ ایک رمضان وہاں بھی گذاریں، آپ نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ ٹورنٹو اور لندن والوں سے بات کرو، انھوں نے بات کی اور منظوری مل گئی۔ چنانچہ ایک سال امریکہ میں رمضان گذارنے کا سلسلہ شروع ہوا، امریکہ میں کسی خاص جگہ رہنے کے بجائے مختلف علاقوں کا دورہ فرماتے ہیں اور جگہ جگہ اصلاحی بیانات ہوتے ہیں، لوگ آپ کے وعظ میں جوق در جوق بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے ہیں، خاص طور پر علماء کا رجوع بہت زیادہ ہوتا ہے، جہاں بھی حضرت تشریف لے جاتے ہیں علماء آپ کے وعظ میں اہتمام سے شرکت کرتے ہیں، اور آپ کے مواعظ علمیہ سے خوب استفادہ کرتے ہیں۔

* * *

تدریس وتقریر میں جوڑ نہیں، جو تدریس میں کامیاب ہوتا ہے وہ تقریر میں ناکام رہتا ہے، اور جو تقریر میں ید طولی رکھتا ہے اس کا درس پھیکا پڑ جاتا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تدریس کا انداز برہانی ہوتا ہے اور تقریر کا خطابی، برہانی یعنی دلائل سے مضبوط بیان، اور خطابی یعنی دلوں کو چھو لینے والا انداز، چاہے کہی ہوئی باتیں کمزور ہی کیوں نہ ہوں، درس میں کمزور باتیں نہیں چلتیں، مضبوط باتیں ہی تدریس میں جان ڈالتی ہیں، اور خطاب میں اگر مضبوط باتیں بیان کی جائیں تو بیان میں جوش پیدا نہیں ہوتا اس لئے خطاب میں خطابی باتیں ضروری ہوتی ہیں۔

غرض: دونوں خوبیوں کو جمع کرنا ضدین کو جمع کرنا ہے، پھر اگر تدریس غالب آجاتی ہے تو عوامی خطاب میں بھی وہی رنگ جھلکتا ہے۔ اور خطابی انداز غالب آجاتا ہے تو مختصر المعانی کے درس میں بھی سیرت النبی کا مزہ آتا ہے۔

حضرت والد صاحب مدظلہ پر تدریس کا انداز غالب ہے، وہ ہمیشہ برہانی باتیں بیان کرتے ہیں، کبھی کوئی کچی بات نہیں کہتے، آپ کی تمام تقریریں آپ کو علمی مواد سے بھرپور

ملیں گی، اور ایسی دقیق باتیں آپ کو ان خطابات میں ملیں گی جو آپ نے بہت کم کتابوں میں پڑھی ہونگی، اس لئے ہم نے ان خطبات کا نام 'علمی خطبات' رکھا ہے، یعنی حکم وحکمت سے لبریز تقریریں، قارئین کرام کو بھی یہ تقریریں اسی نقطۂ نظر سے پڑھنی چاہئیں۔

اور تدریس اور علمی انداز خطاب اگرچہ خشک ہوتا ہے، مگر حضرت والا کے بیانات خشک نہیں، کیونکہ حضرت والا اپنے بیان میں دو باتوں کا خاص اہتمام فرماتے ہیں:

ایک: مشکل مضمون: آپ دو تین بار بیان کرتے ہیں، کبھی بلفظہ مکرر بیان کرتے ہیں اور کبھی بالفاظ دیگر مضمون دوہراتے ہیں، نبی ﷺ کا بھی یہی طریقہ تھا، بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ (کبھی) کلام کو تین مرتبہ دوہراتے تھے تاکہ آپ کی بات اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ حضرت والد صاحب بھی اس سنت پر عمل کرتے ہیں اس لئے دقیق علمی مضامین بھی قابل فہم بن جاتے ہیں۔

دوم: دورانِ تقریر آپ لطائف وحکایات بیان فرماتے ہیں، جب لوگوں کے ذہن بوجھل ہوجاتے ہیں تو آپ فوراً کوئی ایسا واقعہ سناتے ہیں کہ لوگ ہنس پڑیں اور ذہن اگلی بات سننے کے لئے تازہ ہوجائے، مگر واقعات برائے واقعات نہیں ہوتے، ان سے بھی استدلال فرماتے ہیں، اس لئے لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔

مگر جب ہم نے آپ کے خطابات کتابی شکل میں مرتب کئے تو تکرار حذف کردی ہے، کیونکہ گفتگو میں تو یہ بات لطف دیتی ہے مگر تحریر میں بدمزگی پیدا کرتی ہے، البتہ واقعات باقی رکھے ہیں، کیونکہ ان سے بیان میں استدلال کیا گیا ہے، اس طرح بیانات کتابی شکل میں بھی لطف سے خالی نہیں۔

* * *

کئی سال سے احباب حضرت والا مدظلہ کی تمام تقریریں ریکارڈ کرتے رہے ہیں، پہلے کیسیٹیں تیار کرتے تھے، اور والد صاحب کو اس درخواست کے ساتھ دیتے تھے کہ آپ ان کو مرتب کرا کر کتابی شکل دیں، والد صاحب وہ لا کر ہمیں دیدیتے تھے، اور ہم نے ان میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی، ساری چیزیں جمع کرتے رہے، اب ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ کونسی تقریر

کہاں کی ہے، اور کب کی ہے؟ اور یہ بات جاننی ضروری بھی نہیں، آم کھانے سے مطلب پیڑ گننے سے کیا فائدہ! چنانچہ اس پہلے حصہ میں مختلف زمانوں کی تقریریں ہیں، بعض بہت پرانی ہیں اور بعض گذشتہ رمضان کی تازہ تقریریں ہیں۔

* * *

رمضان المبارک میں حضرت والا کا معمول یہ رہتا ہے کہ تراویح کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر فرماتے ہیں، پھر ناشتہ ہوتا ہے، پھر مسائل کی مجلس ہوتی ہے، لوگ مختلف سوالات پوچھتے ہیں، اور والد صاحب شرح وبسط کے ساتھ جواب دیتے ہیں، یہ بھی احباب ٹیپ کرتے رہے ہیں، مگر وہ علاحدہ نہیں، تقریروں کے ساتھ ہی ہیں، اور عصر کی نماز کے بعد حدیث شریف کی کوئی کتاب پڑھنے کا معمول رہتا ہے، عام طور پر امام نووی رحمہ اللہ کی ریاض الصالحین سامنے رکھ کر مختلف حدیثیں پڑھتے ہیں اور ان کی تشریح کرتے ہیں، یہ حصہ بھی علاحدہ نہیں، کیسٹوں میں ایک ساتھ ہے، چنانچہ اس پہلے حصہ میں سولہ تقریریں ہیں، اور آخر میں مسائل کا تھوڑا سا حصہ ہے، آئندہ حصوں میں ہم کوشش کریں گے کہ مسائل کا حصہ زیادہ رکھیں تا کہ قارئین کو اس سے بھی فائدہ پہنچے۔

* * *

یورپ اور امریکہ میں بے شمار گمراہ فرقے پائے جاتے ہیں، والد صاحب کا مزاج کسی فرقہ کے خلاف تقریر کرنے کا نہیں ہے، لیکن جب سوال ہوتا ہے تو کھل کر بیان فرماتے ہیں، نہ لاگ لپیٹ سے کام لیتے ہیں، نہ سخت زبان استعمال کرتے ہیں اور نہ ان فرقوں کی رعایت کرتے ہیں، علمی انداز میں جو ان کی گمراہیاں ہیں ان کو سمجھاتے ہیں، چنانچہ وہ حضرات بھی بیانات میں شریک ہوتے ہیں اور بہت غور سے سنتے ہیں، پھر چاہے ان کی اصلاح نہ ہو، مگر جو لوگ ان کی باتوں سے متأثر ہوتے ہیں وہ سنبھل جاتے ہیں۔

ان فرقوں میں سے اکثر تو اپنے آپ کو 'اہل السنہ والجماعہ' سے الگ رکھتے ہیں، لیکن دو فرقے: غیر مقلدین اور مودودی: لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی اہل حق اور اہل السنہ والجماعہ میں شامل ہیں، جبکہ حقیقت ایسی نہیں۔ آپ کو ان تقریروں میں

اس کی پوری تفصیل ملے گی کہ غیر مقلدین کا اہل السنہ والجماعہ کے ساتھ اصولی اختلاف ہے، اور اصول میں اختلاف کے ساتھ دو جماعتیں ہم مسلک نہیں ہوسکتیں، اور مودودی جماعت کی جو فکری بے راہ روی ہے اور ان کے مزاج میں جو اعتزال ہے: حضرت والا نے اس کو بھی نیویارک کی ایک تقریر میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے، مگر وہ تقریر اس حصہ میں نہیں آسکی۔ ان شاء اللہ آئندہ کسی حصہ میں آئے گی۔

❀ ❀ ❀

مطالعہ کا طریقہ: جب کوئی نئی کتاب ہاتھ میں آئے اور جن کے پاس فرصت کم ہو، وہ پوری کتاب بالاستیعاب نہ پڑھ سکتے ہوں یا انہیں اس کی ضرورت نہ ہو تو پھر مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ فہرست مضامین دیکھ لی جائے جو عنوانات کام کے نظر آئیں وہ کھول کر پڑھ لئے جائیں، ساری کتاب پڑھنی ضروری نہیں، اس لئے تمام تقریروں میں عنوانات لگادیئے گئے ہیں، ان عنوانات سے پوری کتاب کے مضامین ایک نظر میں سامنے آجائیں گے۔

❀ ❀ ❀

عرصۂ دراز سے ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہوئے حضرت اقدس مدظلہ کے ہزاروں تلامذہ اور خدام کے دلوں میں یہ آرزو رہ رہ کر انگڑائی لے رہی تھی کہ حضرت کے مواعظ مرتب ہوکر شائع ہوں، تاکہ آنے والی نسلیں تا قیامت آپ کے فیوض سے مستفیض ہوتی رہیں، چنانچہ راقم الحروف نے ۹۷-۱۹۹۶ء میں جبکہ میں جامعہ اشرفیہ راندیر سورت (گجرات) میں مدرس تھا، حضرت والد ماجد مدظلہ کی چند تقاریر کیسٹوں کی مدد سے مرتب کی تھیں، مگر راقم الحروف کی شدید خواہش تھی کہ حضرت والا کی نظر ثانی کے بعد ہی وہ مواعظ شائع ہوں، مگر حضرت والا اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے نظر ثانی نہیں فرماسکے، اور بات آج کل پر ٹلتی رہی، اسی دوران میرے چھوٹے بھائی عزیزم مولانا مفتی محمد سعید صاحب زید مجدہ (استاذ جامعۃ الامام انور شاہ دیوبند) نے بھی والد صاحب کی بہت سی تقاریر مرتب کیں۔ آج احقر کے جسم کا رواں رواں منعم حقیقی، رب کریم کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے کہ اللہ نے حضرت والا کے ہزاروں محبین ومتوسلین کی اور راقم الحروف اور برادر عزیز

کی دیرینہ خواہش پوری فرمائی اور ہمیں حضرت اقدس مدظلہ کے مواعظ کی پہلی جلد حضرت کی نظر ثانی کے بعد ہدیۂ ناظرین کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس عظیم نعمت پر رب کریم کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اس مجموعہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ حضرت اقدس مدظلہ نے اس کا ایک ایک لفظ بامعان نظر پڑھا ہے، اور حک وفک کرکے اس کو قابل اشاعت بنایا ہے، ورنہ ہمیں اپنی کم علمی، بے مائیگی، بے بضاعتی اور ناتجربہ کاری کا پورا احساس ہے، یہ عظیم علمی کارنامہ ہماری بساط سے یقیناً بالاتر تھا، صرف حضرت والا کی عنایت نے اس کو قابل اشاعت بنایا ہے۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر کسی جگہ کوئی غلطی ہوگئی ہو تو درگذر فرمائیں اور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی اصلاح کردی جائے۔ **وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب، وصلى الله على النبي الكريم وعلى آله وصحبه أجمعين۔**

کتبہٗ
حسین احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
ابن
حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
۲۰/ ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ

مکتبہ حجاز دیوبند

۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ مسنونہ کے مضامین

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ: نَحْمَدُهٗ، وَنَسْتَعِيْنُهٗ، وَنَسْتَغْفِرُهٗ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا، وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحمداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.[أَرْسَلَهٗ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ، مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَاهْتَدٰى، وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَلَا يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهٗ، وَلَا يَضُرُّ اللّٰهَ شَيْئًا](۱)

مکتبہ حجاز دیوبند

خطبہ مسنونہ میں بہت قیمتی مضامین ہیں:

بزرگو اور بھائیو! یہ جو میں نے خطبہ پڑھا ہے، یہ نبی کریم ﷺ کا خطبہ ہے، اس خطبہ میں بہت قیمتی مضامین ہیں، جو مؤمن کی نگاہ کے سامنے رہنے چاہئیں، کبھی اوجھل نہیں ہونے چاہئیں، مگر ہم لوگ عربی نہیں جانتے، اس لئے سمجھتے ہیں کہ صرف برکت کے لئے کچھ پڑھا جا رہا ہے، بلکہ بعض تو ٹیپ ہی اس وقت کھولتے ہیں جب خطبہ ختم ہو جاتا ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آج آپ کو اس کے مضامین کے بارے میں کچھ بتاؤں اور یہ خطبہ آپ کو سمجھاؤں۔

قولہ: إنَّ الحمدَ لله: تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں:

بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اللہ کے سوا کسی کی کوئی تعریف نہیں، اگر ہے تو وہ

---

(۱) بین القوسین عبارت خطبہ مسنونہ سے زائد ہے ۱۲

بھی اللہ کی دَین ہے، کیونکہ کوئی چیز فی حد ذاتہ قابل تعریف نہیں، جو بھی چیز دنیا میں قابل تعریف ہے: وہ اللہ کے اُس کو قابل تعریف بنانے کی وجہ سے ہے، جیسے کوئی شخص خوبصورت ہے، اس کا ناک نقشہ ایسا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں، تو ایسا حسین ناک نقشہ اس نے خود تھوڑے بنایا ہے، یا اس کے ماں باپ نے تھوڑے بنایا ہے، بلکہ اللہ نے بنایا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ﴾: واقعہ یہ ہے کہ ہم نے تمھیں پیدا کیا، اور ہم نے تمہارا ناک نقشہ بنایا [الاعراف ۱۱]

پس ہم جو کہتے ہیں کہ فلاں بڑا خوبصورت ہے تو اس کو خوبصورت اللہ نے بنایا ہے، یا ہم جو کہتے ہیں کہ تاج محل بڑا شاندار ہے تو وہ اینٹ پتھر کی تعریف نہیں، کاریگر کی تعریف ہے، اور کاریگر کو ماہر اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، پس یہ تعریف بھی اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔

ان مثالوں سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ کائنات میں کوئی چیز فی حد ذاتہ قابل تعریف نہیں، جو بھی چیز قابل تعریف ہے وہ اللہ کے اُس کو ایسا بنانے کی وجہ سے ہے۔ اس لئے فرمایا: **إِنَّ الحمدَ للّٰهِ**: بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اللہ کے علاوہ تعریفوں کے لائق کوئی نہیں!

مکتبہ حجاز دیوبند

اللہ تعالیٰ کی تعریف:

جب سبھی تعریفیں اللہ کے لئے ہیں تو اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کی تعریف کریں، اس لئے اگلا جملہ ہے: نَحْمَدُهٗ: ہم اللہ کی تعریف کرتے ہیں۔ حمد کے معنی ہیں: خوبیوں کے ساتھ کسی کو متصف کرنا، ہم اللہ تعالیٰ کے لئے تمام خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں، خوبیاں ان کی خانہ زاد ہیں، کسی سے انھوں نے مستعار نہیں لیں، اور کوئی خوبی ایسی نہیں جو ان میں نہ ہو، اور دوسروں کی خوبیاں مستعار ہیں، اللہ نے دی ہیں۔ اس بات کا ہم اقرار کرتے ہیں۔

اللہ سے مدد طلبی:

قوله: ونستعينه : اور ہم اللہ تعالیٰ سے مدد کرتے ہیں امور غیر عادیہ (جن کے اسباب

مخفی ہیں) میں تو اللہ کے علاوہ سے مطلب کرنا جائز ہی نہیں، اور امور عادیہ (روزمرہ کے کاموں) میں اگرچہ جائز ہے، مگر حدیث میں ہے کہ تمہارے چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، پس بندے کو ہر حال میں اللہ ہی سے مدد طلب کرنی چاہئے۔ اور مقرر جو باتیں بیان کرے گا ان میں بھی اللہ ہی کی مدد درکار ہے، ان کی مدد کے بغیر ہم کچھ بیان نہیں کرسکتے، انہی کی توفیق سے جو کچھ بیان ہوگا: ہوگا، ورنہ کچھ نہیں!

کوتاہیوں کی معافی:

قولہ: وَنَسْتَغْفِرُهٗ: اور ہم اللہ سے معافی چاہتے ہیں۔ کس بات کی؟ کوتاہی کیا ہوئی ہے؟ کوتاہی اللہ کی تعریف کرنے میں ہوئی ہے، ہم جو اللہ کی تعریف کررہے ہیں تو ہم اللہ کی تعریف کما حقہ (جیسا تعریف کا حق ہے) نہیں کرسکتے، یہ ہماری کوتاہی ہے، اس کوتاہی پر ہم اللہ سے معافی مانگتے ہیں کہ خدایا! ہم تیری تعریف کا جو حق ادا نہیں کرپارہے ہیں یہ ہماری کوتاہی ہے، پس آپ ہماری اس کوتاہی کو معاف فرمادیں۔

سورۂ ذاریات میں اللہ کے اچھے بندوں کا تذکرہ آیا ہے اور ان کے کام بیان کئے گئے ہیں، فرمایا: بیشک متقی لوگ باغات میں اور چشموں میں ہونگے، اور ان کے رب نے ان کو جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کو لے رہے ہونگے، یعنی جنت میں پہنچنے کے بعد ان کو ان کے پروردگار جو نعمتیں دیں گے، ان نعمتوں کو وہ لینے والے ہوں گے، وہ لوگ اس سے پہلے نیکوکار تھے، یعنی وہ دنیا میں نیک کام کرکے آئے ہیں، اس کے صلہ میں یہ جنت اور اس کی نعمتیں ملی ہیں۔ وہ نیک کام کیا ہیں جو وہ دنیا میں کرکے آئے ہیں؟ وہ لوگ جب دنیا میں تھے تو رات کا بہت تھوڑا حصہ سوتے تھے، اور رات کا بڑا حصہ اللہ کی عبادت میں، تہجد میں، نمازوں میں اور ذکر وتلاوت میں گذارتے تھے ﴿وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ اور آخر شب میں وہ استغفار کرتے تھے [آیات ۱۵-۱۸]

مجھے ان آیات کا یہی مضمون سنانا ہے کہ اللہ کے اچھے بندے، پرہیزگار بندے، اللہ کی بندگی کرکے، اللہ کی تعریف کرکے غرور وتکبر میں مبتلا نہیں ہوتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ساری کائنات اللہ کی بندگی اور تعریف میں لگ جائے تو بھی اللہ کی مجد وثنا کا کروڑواں حصہ

بھی ادا نہیں کر سکتی۔ اس کوتاہی پر معافی مانگی جارہی ہے۔

علاوہ ازیں: ہر بندہ خطا کار، گنہ گار ہے، ہر وقت ہم سے خطائیں ہوتی رہتی ہیں، اس لئے بھی استغفار جاری رہنا چاہئے، کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے، چنانچہ خطبہ میں حمد کے بعد استغفار کا مضمون آیا ہے۔

آدمی کا نفس برا ہو جائے تو پھر خیر نہیں!

قولہ: ونعوذ باللہ من شرور أنفسنا: اور پناہ چاہتے ہیں ہم اپنے نفسوں کی برائیوں سے۔ جب نفس میں برائیاں پیدا ہو جائیں تو پھر خیر نہیں، اوپر اوپر کی برائیوں تک تو بات بن جاتی ہے، آدمی توبہ تلا کر کے زندگی سنوار لیتا ہے، لیکن جب نفس کھوٹا ہو جاتا ہے تو پھر انسان کی خیر نہیں، اس لئے فرمایا: ہم پناہ چاہتے ہیں اپنے نفسوں کی برائیوں سے یعنی ہمارے نفس برے نہ ہو جائیں، ہاتھ سے برائی ہو جائے تو آدمی کہتا ہے: ارے رے! یہ مجھ سے کیا ہو گیا! اس لئے اس گناہ کا دھلنا آسان ہے، لیکن اگر دل نے گناہ کا ارادہ کیا، اور دل کے کہنے سے ہاتھ نے گناہ کیا تو پھر اس گناہ کا دھلنا بہت مشکل ہے۔

یاد کرو موسیٰ علیہ السلام کا وہ قصہ جو قرآن کریم میں آیا ہے جب انھوں نے ایک قبطی کو مکّا مارا تھا تو وہ اللہ جانے کہاں لگ گیا کہ وہ تو پانی مانگنے بھی نہیں رہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو مکّا مارا تھا وہ ہاتھ کا عمل تھا، اس ہاتھ کے پیچھے دل کا ارادہ نہیں تھا۔ دل کا حال کیا تھا؟ ﴿قَالَ: هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَان﴾: آپؑ نے فوراً کہا: یہ حرکت شیطان نے مجھ سے کرادی! معلوم ہوا کہ دل کے تقاضہ سے اور مار ڈالنے کے ارادے سے مکّا نہیں مارا تھا، بلکہ وہ ایک اتفاقی امر تھا، تنبیہ مقصود تھی، مگر وہ مر گیا۔

ایک دوسری جگہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: ﴿رَبِّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ فَغَفَرَلَهٗ﴾: اے میرے پروردگار! میں نے اپنا نقصان کرلیا، میں نے گناہ کرلیا، آپ میرا گناہ معاف فرمائیں۔ پس اللہ نے ان کا گناہ معاف کردیا۔ دیکھو! گناہ فوراً دھل گیا اور کام بن گیا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ صرف ہاتھ کا عمل تھا، اِس کے پیچھے دل کا ارادہ نہیں تھا، اور اگر

کوئی دل کے کہنے پر یہ کام کرے مثلاً دل کے تقاضہ سے کسی کو گولی مارے، یا چاقو گھونپے تو پوری زندگی گذر جائے گی مگر توبہ کی توفیق نہیں ہوگی۔

بہرحال جب دل کھوٹا ہوجاتا ہے تو پھر معاملہ بڑا سنگین ہوجاتا ہے اور جب دل صحیح ہوتا ہے اور اعضاء سے گناہ ہوجاتا ہے تو معاملہ سنگین نہیں ہوتا، کیونکہ اس صورت میں انسان کو توبہ کی توفیق مل جاتی ہے، اور توبہ سے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔

بخیلی فطری امر ہے، مگر دل کا بخل بری چیز ہے:

اس کی نظیر: ہر آدمی بخیل ہوتا ہے، اللہ نے بخل (چیز کو روکنا) ہر انسان کی فطرت میں رکھا ہے، ایک چھ مہینے کے بچے کو آپ روپیہ دکھائیں وہ فوراً ہاتھ بڑھائے گا، اور لے لیگا، اس کے بعد آپ مانگیں تو نہیں دے گا، زبردستی کریں گے تو رونے لگے گا، یہی بخل ہے، حالانکہ وہ جانتا بھی نہیں کہ روپیہ کس کام کا ہے، مگر جو چیز فطرت میں ہوتی ہے وہ بچپن ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے، گھر میں سے حضرات حسنین میں سے ایک نکلا، وہ نانا ابا کی طرف بڑھا، لمبا کرتہ پہن رکھا تھا، اور چلنا ٹھیک سے سیکھا نہیں تھا، اس لئے وہ کبھی گرتا تھا، کبھی اٹھتا تھا، جب حضورؐ نے کئی مرتبہ اس کو گرتے اٹھتے دیکھا تو آپؐ منبر سے اترے، اور بچہ کو گود میں لے لیا، اور فرمایا: إنکم لَتُبَخِّلُوْنَ وتُجَبِّنُوْنَ وَتُجَهِّلُوْنَ وإنکم لَمِنْ رَيْحَانِ اللّٰهِ: بیشک تم بخیل بنادیتے ہو، اور بزدل بنادیتے ہو، اور جاہل رکھتے ہو، مگر تم ہو اللہ کا پھول! (ترمذی حدیث ۱۹۰۷)

بچوں کی وجہ سے آدمی پیسہ پیسہ جوڑ کر رکھتا ہے، لڑائی کا وقت آتا ہے تو چارپائی کے نیچے گھستا ہے اور علم حاصل کرنے کے لئے بھی نہیں نکل سکتا، کیونکہ بچوں کے لئے کمانا ہے، مگر اولاد سے محبت فطری امر ہے، وہ اللہ کا پھول ہیں، آدمی ان کو سونگھتا ہے!

بہرحال بخل انسان کی فطرت میں ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں، لیکن اگر دل بخیل ہوجائے تو معاملہ بہت خراب ہوجاتا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾: جو لوگ دل کی بخیلی سے بچائے گئے وہی کامیاب

ہونے والے ہیں۔ آدمی بخل سے بالکل پاک ہوجائے ناممکن ہے، کیونکہ بخیلی انسان کی فطرت میں ہے، اس کے اثرات کچھ نہ کچھ تو ظاہر ہونگے، اور اس میں کوئی خرابی بھی نہیں، خرابی اُس بخل میں ہے جس کا اثر دل تک پہنچ جائے اور دل بخیل ہوجائے۔

اسی طرح اگر انسان سے اوپر اوپر برائیاں صادر ہوں: تو کوئی بات نہیں! توبہ کی توفیق مل جاتی ہے، لیکن اگر نفس کھوٹا ہوجائے تو پھر انسان کی خیر نہیں، اس لئے خطبہ میں نفس کی برائیوں سے پناہ چاہی گئی ہے۔

برے اعمال سے پناہ طلبی:

قوله: ومن سيئات أعمالنا: اور پناہ چاہتے ہیں ہم اپنے کاموں کی برائیوں سے۔ یعنی برے کاموں سے ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ خدایا! برے کاموں سے ہمیں بچا اور اچھے کاموں کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ برے کام بہرحال برے ہیں، چاہے دل کے تقاضے سے نہ ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو مکا مارا تھا: وہ دل کے تقاضے سے نہیں تھا، پھر بھی آپ نے معافی طلب کی۔

جسے اللہ ہدایت دے: اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا

قوله: مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ: جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیں، راہِ راست پر لے آئیں اسے دنیا کی کوئی طاقت گمراہ نہیں کرسکتی، قرآنِ کریم میں جگہ جگہ ان جادوگروں کا قصہ ہے، جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کیا تھا، جب اللہ نے انھیں ہدایت بخشی، اور وہ مسلمان ہوگئے تو فرعون نے اگرچہ پہلے تو بڑے بڑے وعدے کئے تھے کہ اگر تم میدان جیت جاؤ گے تو یہ دونگا، وہ دونگا، اور دربارِ خاص کا منبر بنالوں گا، لیکن جب وہ مسلمان ہوگئے تو فرعون نے دھمکیاں دینی شروع کیں، اور صرف دی ہی نہیں ان پر عمل بھی کیا۔ اس نے کہا: ﴿لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ﴾: میں تمہارا ایک ہاتھ اور ایک پیر الٹی جانب سے کاٹوں گا ﴿وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ﴾: اور میں تمھیں درختوں کے تنوں میں سولی دوں گا۔ اور فرعون نے ایسا کیا بھی، مگر ایک بھی جادوگر ایمان

سے نہیں ہٹا، ایمان کی حالت میں انھوں نے جان دیدی اور انھوں نے فرعون سے صاف کہہ دیا: جو تیرا جی چاہے کر لے، ہم تو اپنے خدا کے ہو گئے! اور خدا سے دعا کی: اے اللہ! ہم پر صبر ریڑھ دے، اگر آپ ہم پر صبر نہیں ریڑھیں گے تو ہم ثابت قدم نہیں رہ سکیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان بندوں پر صبر کا دریا بہادیا، اور وہ خوش خوش سولی پر چڑھ گئے اور جان دیدی، مگر ایک بندہ بھی اپنے ایمان سے نہیں ڈگمگایا، کیونکہ اللہ نے انہیں ہدایت بخشی تھی اور جس کو اللہ ہدایت بخشیں اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔

اسی طرح کا ایک قصہ سورۂ بروج میں آیا ہے، قصہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ایمان لائے، اُس وقت کے بادشاہ نے ان کو ایمان سے پھیرنے کے لئے بڑی بڑی خندقیں کھدوائیں، اور ان میں لکڑیاں بھر کے آگ جلوائی اور اس آگ پر بڑے بڑے کڑھاؤ رکھ کر اس میں تیل گرم کیا، پھر ایک ایک مؤمن کو لایا جاتا اور اس سے کہا جاتا کہ ایمان چھوڑ دے ورنہ آگ میں ڈال دیا جائے گا، کسی نے ایمان نہیں چھوڑا، سب نے آگ میں ڈالا جانا منظور کر لیا۔

اس موقعہ پر ایک عورت لائی گئی، جس کی گود میں بچہ تھا، اس سے بھی یہی کہا گیا، اس نے ایمان چھوڑنے سے انکار کر دیا، پولیس نے اس کی گود سے بچہ لے کر کڑھاؤ میں ڈالدیا۔ ماں کے دل کی کیفیت اس وقت کیا ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بے صبری کا مظاہرہ نہ کر دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس بچے کو زبان دی، وہ تیل کے کڑھاؤ میں سے بولا: ماں! گھبرا مت، میں بہت مزے میں ہوں، تو بھی آ میرے ساتھ!

غور کرو اس عورت کا ایمان اس بچہ کے ذریعہ کس نے بچایا؟ اللہ نے بچایا، جب اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت دیتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت اس ایمان کو چھین نہیں سکتی۔

اور ایک ایمان ملتا ہے باپ دادا سے، نسلوں سے ایمان چلا آرہا ہے، یہ ایمان اتنا کمزور ہوتا ہے کہ ایک خوف کی آندھی آتی ہے تو کتنے ہی اس کی نذر ہو جاتے ہیں، مرتد ہو جاتے ہیں، دنیا کا کچھ نفع نظر آتا ہے تو ایمان چھوڑ دیتے ہیں، روز ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ یہ ایمان میراث میں ملا ہے، نسل در نسل

چلا آرہا ہے، وہ اللہ سے مانگا ہوا ایمان نہیں ہے، اس لئے اس کا حال ضعیف ہوتا ہے، وہ حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

نومسلموں کا حال مسلمانوں سے بہتر!

اس کے برخلاف بعض غیر مسلم وہ ہوتے ہیں جو سچے دل سے مسلمان ہوتے ہیں، مطالعہ کر کے مسلمان ہوتے ہیں، یہ پکے مسلمان ہوتے ہیں، ان کو کوئی آفت اور کوئی نقصان ایمان سے ڈگمگا نہیں سکتا۔

ایک غیر مسلم طالب علم کا واقعہ ہے: وہ مسلمانوں کی صحبت سے مسلمان ہوا، ایمان قبول کرنے سے پہلے وہ ڈاڑھی مونڈاتا تھا، لیکن ایمان لانے کے بعد اس نے ڈاڑھی چھوڑ دی، اس کے جو مسلمان ساتھی تھے وہ سب ڈاڑھی مونڈواتے تھے، انھوں نے اس نومسلم کو سمجھایا کہ اسلام میں ڈاڑھی رکھنا کچھ ایسا ضروری نہیں، بغیر ڈاڑھی کے بھی بہت مسلمان ہیں، ڈاڑھی سنت ہے، کوئی فرض یا واجب نہیں۔ اُس نومسلم نے جواب دیا: دیکھو بھائی! میں نہیں جانتا کہ ڈاڑھی اسلام میں سنت ہے، واجب ہے یا فرض ہے، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے آقا جو اللہ کے پاس سے دین لائے ہیں اور انھوں نے ہمیں دین پہنچایا ہے، ان کی ڈاڑھی تھی اور انھوں نے امت کو ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے، اور جو ماتحت فوجی ہوتا ہے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے کمانڈر کے احکام میں سے بعض کو ضروری اور بعض کو غیر ضروری قرار دے، کمانڈر جو بھی حکم دے، ماتحت کا کام ہے اس کو بجالانا، ہمارے کمانڈر آقائے دوجہاں ہیں، انھوں نے ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے، اس لئے ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس پر عمل کریں، اور اس چکر میں نہ پڑیں کہ یہ حکم کس درجہ کا ہے؟

یہ ہے ایمان کی مضبوطی، یہ اللہ کا بخشا ہوا ایمان ہے، اور دوسرے طالب عالم چونکہ ان کے ماں باپ مسلمان تھے اس لئے وہ بھی مسلمان تھے، اس لئے اُس کے اور ان کے ایمان میں فرق تھا اُس کے پاس اللہ کا بخشا ہوا ایمان تھا، اور اِن کے پاس موروثی ایمان تھا۔

بہر حال جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیتے ہیں اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ کتنے

ہی تھپیڑے آئیں، آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوں: وہ ایمان کو ہلا نہیں سکتیں، بلکہ جتنی مصیبتیں آتی ہیں اتنا ایمان پختہ ہوتا ہے، اس لئے فرمایا: **مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ** : جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیں اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔

جسے اللہ گمراہ کریں اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں!

اور جس کو اللہ تعالیٰ بچلا دیں، راستہ سے بھٹکا دیں، اس کو کوئی راستہ دکھلانے والا نہیں۔ اسی کو قرآنِ کریم میں جگہ جگہ کہا ہے: ﴿**خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ**﴾: اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی، مہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دل میں ہدایت داخل نہیں ہوسکتی، کہیں فرمایا ہے: ﴿**طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ**﴾: اللہ نے ان کے دلوں پر چھاپ ماردی! چھاپ مارنے کا بھی یہی مطلب ہے کہ اب اس دل کے اندر ہدایت داخل نہیں ہوسکتی، ان کے دل اُس صراحی کے مانند ہوجاتے ہیں جو اوندھی ہو، اس صراحی میں کوئی آدمی پانی نہیں بھر سکتا، جتنا پانی ڈالوگے باہر نکل آئے گا، گمراہ لوگوں کا دل بھی ایسا ہی ہوجاتا ہے، کوئی خیر کی بات قبول نہیں کرتا، کتنا بھی اسے سمجھایا جائے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اللہ نے اسے راستہ سے بھٹکا دیا، اب اس کو کوئی دوسرا ہدایت نہیں دے سکتا۔

ہدایت وضلالت میں بندے کی مشیت کا دخل ہوتا ہے:

اور اُس پہلے کو اللہ نے ہدایت کیوں دی؟ اس نے چاہی اس لئے اللہ نے ہدایت دی، اور اس دوسرے کو اللہ نے راستہ سے کیوں بھٹکایا؟ اس نے بھٹکنا چاہا اس لئے اللہ نے بھٹکا دیا اللہ زبردستی کسی کو راستہ سے نہیں بھٹکاتے اور زبردستی کسی کو راستہ پر بھی نہیں لاتے، بندہ ہدایت چاہے خواہ کسی درجے میں چاہے تو اللہ تعالیٰ راہ دکھاتے ہیں، اور اگر بندہ گمراہی چاہے تو اللہ تعالیٰ راستہ سے بھٹکا دیتے ہیں، لیکن جب کسی کو اللہ نے ہدایت دیدی تو اب دوسری کوئی طاقت اسے بھٹکا نہیں سکتی اور جس کے دل پر اللہ نے مہر کردی اب اس کے دل کو کوئی کھول نہیں سکتا۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿**فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ، وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ**﴾:

مکتبہ مجاہدیہ

جس کو اللہ تعالیٰ راہِ راست دکھلانا چاہتے ہیں: اس کے دل کو اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں، اب اس کو اسلام کی ہر بات اچھی لگنے لگتی ہے، اور جس کو اللہ گمراہ کرنا چاہتے ہیں: اس کے دل کو تنگ کر دیتے ہیں، اور بہت تنگ کر دیتے ہیں، اور دل کو ایسا بھینچ دیتے ہیں کہ گویا آسمان کی طرف اٹھا چلا جا رہا ہے۔ اب وہ ہدایت کی آوازیں نہیں سنتا۔

ایک موقعہ پر یہودیوں نے کہا تھا: ﴿قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾: ہمارے دل پیک ہیں یعنی ہم تورات پر عمل کرنے والے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان ہے اور اس ایمان کے ساتھ ہمارے دل پیک ہو گئے ہیں، اب باہر کے برے اثرات اندر داخل نہیں ہو سکتے، گویا اسلام کو انھوں نے برے اثرات سے تعبیر کیا، اللہ نے فرمایا: پیک تو ہو گئے ہیں مگر اندر گندگی بھری ہوئی ہے، وہ گندگی پر پیک ہو گئے ہیں، اب خیر کی کوئی بات اندر نہیں جا سکتی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿بَلْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ﴾: بلکہ تم پر اللہ نے لعنت کی ہے، لعنت کرنے کا مطلب یہی ہے کہ تمہارے دل شر کو لے کر پیک ہو گئے ہیں، اب کوئی خیر کی بات تمہارے دلوں میں نہیں پہنچ سکتی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ أَحْبَبْتَ، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ﴾: آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، جب اس کا دل پیک ہو گیا تو اب حضورؐ کے بس میں بھی اس کو ہدایت دینا نہیں۔ قرآنِ کریم میں جگہ جگہ ہے: ﴿أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ أَوْ تَهْدِىْ الْعُمْىَ﴾: کیا آپ بہرے کو سنا سکتے ہیں یا اندھے کو راہ دکھا سکتے ہیں؟ کتنا بھی چلاؤ بہرا سن نہیں سکتا اور اندھے کو راہ دکھانے کی لاکھ کوشش کرو وہ دیکھ نہیں سکتا۔

بات کا خلاصہ: یہ ہے کہ آدمی اگر کھلے دل سے ہدایت چاہے، راہِ راست پر آنا چاہے تو اللہ کی بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں، ان کی بارگاہ سے نعمتیں لٹائی جاتی ہیں، لیکن کوئی لینے کے لئے آئے بھی تو، زبردستی نعمتِ ہدایت نہیں دی جاتی، اس لئے میرے بھائیو! دلوں کو کھولو، اور اللہ کی طرف متوجہ ہوؤ، اللہ کے دین کی باتیں سنو، پڑھو اور مطالعہ کرو، اور یہ جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی سب کچھ نہیں ہے، آگے ایک دوسری زندگی بھی آرہی ہے، جو اصل زندگی ہے،

مکتبہ حجاز دیوبند

اس کی تیاری کے لئے یہ دنیا کی زندگی ہے اس لئے ہدایت چاہو، اگر اللہ نے ہدایت دیدی تو پھر ان شاء اللہ کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور اگر اللہ کی طرف سے ہدایت کے فیصلے نہ ہوئے تو پھر کوئی دوسرا ہدایت کی راہ پر نہیں ڈال سکتا۔

توحید ورسالت کی گواہی:

قوله: أشهد أن لا إلهَ إلا الله، وحده لاشريك له، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله: أشهد کہا نشهد نہیں کہا، اب تک جمع کے صیغے تھے، سب کی طرف سے کہا جارہا تھا، نحمدهُ، ونستغفره اور نعوذ بالله، مگر اب جو الفاظ آئیں گے وہ ایک آدمی کے لئے ہیں، حضورؐ نے واحد متکلم کے صیغے استعمال فرمائے ہیں، لہٰذا آپ کو بھی اس میں شریک ہونا ہے، اب سننے والوں کو چاہیئے کہ وہ بھی کہیں: میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلے ہی معبود ہیں، ان کا کوئی ساجھی نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی اپنی رسالت کی گواہی دینا ضروری تھا:

خود حضورؐ کہہ رہے ہیں: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، کیونکہ حضورؐ کی دو حیثیتیں ہیں: ایک حیثیت ہے: اللہ کا بندہ ہونے کی، اور دوسری حیثیت ہے: اللہ کا رسول ہونے کی۔ آپؐ نے اللہ کا جو پیغام اللہ سے حاصل کرکے انسانوں کو پہنچایا ہے وہ اپنے آپ کو بھی پہنچایا ہے، نمازیں اگر دوسروں پر فرض تھیں تو حضور پر بھی فرض تھیں، بلکہ کہتے ہیں: حضور پر تہجد کی نماز بھی فرض تھی، روزے دوسروں پر فرض تھے تو حضورؐ پر بھی فرض تھے، جتنی عبادتیں دوسروں پر فرض تھیں وہ سب حضورؐ پر بھی فرض تھیں، کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو دوسروں پر فرض ہو اور حضورؐ پر فرض نہ ہو۔

ایسا تو ہے کہ حضورؐ پر امت کے مقابلے میں کچھ زائد احکام ہیں، اور معاملات میں حضورؐ کی کچھ خصوصیات ہیں، جیسے امتی زیادہ سے زیادہ چار بیویاں ایک ساتھ رکھ سکتا ہے، مگر حضورؐ کے لئے ایسی کوئی پابندی نہیں تھی، اور معاملات میں ایسی خصوصیات کی کچھ وجہیں ہوتی ہیں،

لیکن جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو جتنی عبادتیں امت پر ہیں اتنی ہی انبیاء پر بھی ہیں۔

انبیاء پر زکوٰۃ فرض کیوں نہیں؟

اور اگر کوئی کہے کہ انبیاء پر زکوٰۃ فرض نہیں، پس یکسانیت کہاں رہی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ ان پر بھی فرض تھی، اگر ان کے پاس مال ہوتا تو وہ بھی اس فریضہ کو ادا کرتے۔ سورۂ مریم (آیت ۳۱) میں ہے: ﴿وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا﴾: عیسیٰؑ نے کہا: اللہ نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، جب تک میں (دنیا میں) زندہ رہوں۔ مگر کسی نبی کے پاس کبھی مال اکٹھا ہی نہیں ہوا، صبح آتا تو شام خرچ ہو جاتا پس زکوٰۃ کیسے فرض ہوتی؟

اور اگر کوئی کہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام تو بادشاہ تھے، پس ان پر تو زکوٰۃ فرض ہونی چاہئے تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام تک کیوں جاتے ہو، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو بادشاہ تھے، اسلامی حکومت کے سربراہ تھے اور آپؐ کے فاقوں کا حال معلوم ہے، پس جب اس بادشاہ کا یہ حال تھا تو ان بادشاہوں کا یہ حال کیوں نہیں ہو سکتا؟ وہ بھی انبیاء تھے اور یہ بھی نبی ہیں۔

مکتبہ حجاز دیوبند

اور انبیاء ہی نہیں امت میں بھی ایسے گذرے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایسے ہی تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے ہی تھے، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سو سال پورے ہونے پر خلیفہ ہوئے ہیں وہ بھی ایسے ہی تھے اور ماضی قریب میں مغل بادشاہ حضرت عالمگیر رحمہ اللہ گذرے ہیں جنھوں نے غیر منقسمہ ہندوستان پر چون سال حکومت کی ہے: ان کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا ہے تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، وہ قرآن لکھ کر فروخت کرتے تھے اور گھر کا خرچ چلاتے تھے، وہ حکومت کے خزانے کو پبلک کی پراپرٹی سمجھتے تھے۔

عبدیت اور رسالت کا اجتماع:

خیر حضورؐ خود فرما رہے ہیں: أشهد أن محمداً عبده ورسوله: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہی آپؐ کا مقام و مرتبہ ہے، اس مقام سے آپؐ

کو اوپر اٹھانا بھی جائز نہیں اور نیچے گرانا بھی جائز نہیں، حضورؐ نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا: جیسے عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں مبالغہ کیا اور ان کو اللہ کی حدود میں داخل کردیا: تم میری شان میں ایسا مبالغہ نہ کیجئو۔

حضورؐ کا مقام ہے: اللہ کا بندہ ہونا، اس سے اوپر اٹھانا اور خدائی صفات حضور میں ماننا کہ اللہ نے تمام علم غیب آپؐ کو دیدیا ہے، اور حضورؐ ہر جگہ اللہ کی طرح حاضر وناظر ہیں، اور حضورؐ کو کائنات میں ہر طرح تصرف کا اختیار ہے: اس میں اگرچہ حضورؐ کا اعزاز ہے، آپؐ کی قدر افزائی ہے، لیکن اللہ کی شان میں گستاخی ہے، ایک بندے کو جو اللہ کا بندہ ہے: اٹھا کر اللہ کے برابر کردینا اور خدائی صفات اس میں مان لینا اللہ کی شان میں بڑی گستاخی ہے، یہ اللہ کی توہین کرنا ہے۔ اس لئے حضورؐ ہی نہیں ہر نبی کا خواہ وہ عیسیٰ علیہ السلام ہوں، موسیٰ علیہ السلام ہوں یا عزیر علیہ السلام ہوں: سب کا مقام یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، مگر ماوشما جیسے بندے نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کے رسول بھی ہیں، نبی بھی ہیں، یہ دو چیزیں جمع ہوکر جو لیول بنتا ہے وہ آپؐ کا مقام ومرتبہ ہے۔

سابقہ ادیان اگرچہ برحق تھے مگر اب منسوخ ہیں:

قولہ: ﴿أَرْسَلَهُ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ﴾: اللہ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دین حق کے ساتھ بھیجا، درانحالیکہ آپؐ خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے ہیں، قیامت کے سامنے۔

اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، اب یہی دین دین حق ہے، اس کے علاوہ اب کوئی دوسرا دین برحق نہیں۔ حضورؐ کی تشریف آوری سے پہلے جو انبیاء تشریف لائے ہیں، اور اپنے ساتھ دین لائے ہیں: وہ دین اگرچہ برحق تھے، آدم علیہ السلام کے ذریعہ اللہ نے جو دین بھیجا تھا وہ اُس وقت برحق تھا، اسی دین کی اتباع میں نجات تھی، پھر جب نوح علیہ السلام تشریف لائے اور اللہ نے ان کے ذریعہ دین بھیجا تو اس وقت وہی دین برحق تھا۔ اور اسی کی اتباع میں نجات تھی، اور اس سے پہلے والا دین منسوخ ہوگیا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا، پھر عیسیٰ علیہ

السلام کا زمانہ آیا اور ہر پیغمبر کے ذریعہ اللہ نے دین بھیجا تو یہ سب ادیان اپنے اپنے وقت میں برحق تھے مگر سب ایک: دوسرے سے منسوخ ہوتے رہے۔

پس اگر کوئی کہے کہ کیا پہلے والے ادیان برحق نہیں تھے جو منسوخ کئے گئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ برحق دین تھے! مگر اپنے زمانہ میں برحق تھے جیسے ملک کا ایک قانون ہوتا ہے، وہ ایک زمانہ تک چلتا ہے، پھر ملک کے حالات بدلتے ہیں تو پارلیمنٹ دوسرا قانون بناتی ہے، اور پچھلا قانون منسوخ کر دیتی ہے۔ اب یہ جو نیا قانون بنا ہے یہی ملک کا دستور ہے، اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اب کوئی کہے کہ وہ پچھلا دستور بھی تو اس ملک کا دستور تھا اس کے مطابق فیصلہ کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب یہ ہے کہ بیشک وہ ملک کا دستور تھا، لیکن اب اس کے مطابق فیصلہ نہیں ہوگا، اب جو نیا قانون بنا ہے اس کے مطابق فیصلہ ہوگا، پھر جب حالات بدلیں گے تو دوسرا نیا قانون بنے گا اور یہ قانون بھی منسوخ ہو جائے گا۔

اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ جب حضور ﷺ کی تشریف آوری ہوئی، اور اللہ نے حضور کو نئے دین کے ساتھ بھیجا تو اب دین حق یہی ہے اور اس سے پہلے والے ادیان منسوخ ہوگئے، اب ان کی اتباع میں نجات نہیں۔ یہ مضمون قرآنِ کریم کے شروع میں آیا ہے:
﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾: اس آیت میں دو مضمون ہیں:

حضورؐ خاتم النّبیین ہیں:

اللہ کی جتنی کتابیں ہیں، اور جتنے انبیاء و رسول آئے ہیں سب پر ایمان لانا ضروری ہے، اگر کسی ایک نبی کا بھی یا کسی ایک کتاب کا بھی کوئی انکار کرے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا، چاہے وہ کتاب یا نبی ماضی کا ہو یا مستقبل کا، جیسے نوح علیہ السلام کی امت کے لئے گذرے ہوئے تمام نبیوں پر اور ان کی وحیوں پر بھی ایمان لانا ضروری تھا، اور آگے آنے والے نبیوں پر اور ان پر نازل ہونے والی وحیوں پر بھی ایمان لانا ضروری تھا، کیونکہ یہ سب انبیاء ایک سلسلہ کی کڑی ہیں، اور سب وحیاں ایک سرچشمہ سے نکلی ہیں۔ اُدھر کے نبی اور کتابیں بھی اللہ کی بھیجی ہوئی ہیں اور اِدھر کے نبی اور کتابیں بھی اللہ تعالیٰ بھیجیں گے، پس سب کو ماننا ضروری ہے۔

پہلا مضمون یہ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ﴾: اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس وحی پر جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے ﴿وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾: اور اس وحی پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئی ہے، اس آیت میں بعد کی وحی کا تذکرہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، اگر حضورؐ کے بعد بھی کوئی نبی آنے والا ہوتا تو ایمان کے لئے بعد میں آنے والے انبیاء کی وحی پر بھی ایمان لانا ضروری ہوتا، لیکن ایسا نہیں فرمایا۔ پس معلوم ہوا کہ حضورؐ خاتم النّبیین ہیں۔ حضورؐ نبوت کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نیا نبی اور نئی کتاب آنے والی نہیں۔

نجات کے لئے گذشتہ نبیوں کے ساتھ حضورؐ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے:

دوسرا مضمون: اس آیت میں یہ ہے کہ حضورؐ کی تشریف آوری کے بعد جب تک آدمی گذشتہ نبیوں اور وحیوں کے ساتھ حضورؐ پر اور حضورؐ پر اتری ہوئی وحی کو نہیں مانے گا: مؤمن نہیں ہوسکتا، پس حضور سے پہلے کی جو امتیں ہیں، جیسے یہود ونصاری، اب ان کی نجات پچھلے دینوں کے ماننے میں نہیں وہ تمام ادیان اپنے اپنے زمانہ میں صحیح تھے، مگر اب ان کے ماننے میں نجات نہیں، نجات صرف اس دین کے ماننے میں ہے جس کو لے کر حضورؐ بھیجے گئے ہیں، کیونکہ اب دین حق یہی ہے۔

کیا نجات کے لئے صرف عقیدۂ توحید کافی ہے؟ (ایک اہم آیت کی تفسیر)

اور یہ مضمون میں نے خاص طور پر اس لئے عرض کیا ہے کہ ان ملکوں میں بعض لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ قرآنِ کریم (سورۃ البقرۃ آیت ۶۲) میں ہے: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارىٰ وَالصَّابِئِيْنَ: مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾: بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور یہودی اور عیسائی اور فرقہ صابئین (ان سب میں سے) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ پر، اور روز قیامت پر، اور اس نے نیک عمل کیا ہو، تو ان کے لئے ان کا حق الخدمت ہے ان کے پروردگار کے پاس، اور (وہاں) ان کے لئے کسی طرح کا اندیشہ نہیں، اور نہ وہ مغموم ہونگے۔

اور اسی مضمون کی آیت سورۃ المائدہ (آیت ۶۹) میں بھی آئی ہے: ان آیتوں سے وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت میں نجات کے لئے حضورؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں، اگر کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے، توحید کا قائل ہے اور اپنے نبی کو مانتا ہے، اور اُس نبی کے ذریعہ جو شریعت آئی ہے اس پر عمل کرتا ہے تو وہ آخرت میں نجات پائے گا، نجات کے لئے حضورؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ یہ آیت کا غلط مطلب ہے، صحیح مطلب سمجھنے کے لئے پہلے مسلمانوں کے حالات پر نظر ڈالیں:

جنت کسی کے باپ کی جاگیر نہیں!

آج ہمارے حالات یہ ہیں کہ جس کا بھی نام مسلمانوں کے رجسٹر میں لکھا گیا ہے: وہ سمجھتا ہے کہ جنت میرے باپ کی جاگیر ہے۔ اور یہ غلط فہمی صرف اس امت میں نہیں ہے، پچھلی امتوں میں بھی تھی، قرآن کریم نے جگہ جگہ اس غلط فہمی کو دور کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: نام سے کچھ نہیں ہوتا، کام سے سب کچھ ہوتا ہے، سورۂ جمعہ میں ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوْا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَاراً﴾: ان لوگوں کی حالت جن پر تورات لادی گئی، یعنی یہود و نصاریٰ جن کو زبردستی تورات دی گئی، نہ چاہنے کے باوجود ان کو تورات پر عمل کا مکلّف کیا گیا پھر انھوں نے اس کو نہیں اٹھایا یعنی اس پر عمل نہیں کیا، کہلاتے تو وہ یہودی اور نصرانی تھے مگر تورات پر عمل نہیں کرتے تھے، جیسے آج کل بہت سے مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مگر قرآن و حدیث پر عمل نہیں کرتے، ان کی مثال اس گدھے جیسی ہے جس پر دینی کتابیں لاد دی گئی ہوں، ﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾: بہت بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ اللہ کی آیتوں کو جھٹلانے کی دو شکلیں ہیں، ایک کافر جیسا جھٹلانا، یعنی آیتوں کو سرے سے ماننا ہی نہیں، اور ایک جھٹلانا یہ ہے کہ کہلاتا ہے یہودی مگر تورات پر عمل نہیں کرتا، کہلاتا ہے عیسائی مگر تورات و انجیل پر عمل نہیں کرتا، کہلاتا ہے صابی، مگر اپنی کتاب پر عمل نہیں کرتا، کہلاتا ہے مسلمان مگر قرآن و حدیث پر عمل نہیں کرتا، یہ بھی اللہ کی آیتوں کو عملاً جھٹلانا ہے، ان لوگوں کی یہ مثال ہے۔

یہ مثال کسے سنائی گئی ہے؟ مسلمانوں کو سنائی گئی ہے، اس امت کو سنائی گئی ہے، مگر چونکہ جس وقت قرآنِ کریم نازل ہو رہا تھا: اس وقت امت میں اس کا مصداق نہیں پایا گیا تھا، ایسے نا ہنجار مسلمان اس وقت موجود نہیں تھے، بعد میں ان کا وجود ہونے والا تھا، اور ایسی صورت میں قرآن کریم کا طریقہ یہ ہے کہ وہ یہود و نصاری کی مثال بیان کرتا ہے، گفتہ آید در حدیثِ دیگراں کے طور پر اس امت کو آگے آنے والا بگاڑ سمجھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہود کی یہ مثال بھی اس امت کو سنائی گئی ہے۔

آیت سے مجھے بتانا یہ ہے کہ پچھلی امتوں کے جو احوال ہوئے تھے اسی طرح کے احوال اس امت کے آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس صورت حال کو اس طرح کی آیتوں سے بار بار سمجھایا گیا ہے کہ دیکھو اللہ کے یہاں جو جنت ہے وہ کسی نام کے ساتھ وابستہ نہیں، بلکہ صحیح ایمان اور نیک اعمال کے ساتھ وابستہ ہے، جب دور تھا یہودیوں کا تو جو شخص موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا، ان کی کتاب تورات کے مطابق زندگی گذارتا تھا، اس کے لئے کوئی خطرہ کی بات نہیں تھی، اور اگر وہ نام کا یہودی تھا، تورات پر اس کا عمل نہیں تھا تو اس کے لئے ضروری نہیں کہ چونکہ وہ یہودی ہے اس لئے ضرور جنت میں جائے۔

اسی طرح جب دور تھا عیسائیوں کا تو ان کے لئے بھی یہی ضابطہ تھا کہ صرف عیسائی کہلانے پر نجات نہیں تھی، مؤمن ہو، عیسیٰؑ پر ایمان رکھتا ہو، ان کی کتاب پر عمل کرتا ہو تو اس کے لئے آخرت میں کوئی خطرہ نہیں۔

اسی طرح صابئین کا دور آیا تو اس میں بھی یہی بات تھی، پھر جب اس امت کا دور آیا تو اس کے لئے بھی یہی بات ہے۔ یہی مضمون اس آیت میں ہے کہ خواہ مسلمان ہوں، یہودی ہوں، صابئین ہوں یا عیسائی ہوں سب کے لئے اپنے اپنے زمانہ میں ایک ہی ضابطہ رہا ہے۔

وہ ضابطہ کیا ہے؟ جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، اور اس نے اعمالِ صالحہ کیئے: وہ ناجی ہوگا، محض نام کی وجہ سے نجات نہیں ہوگی۔

رسول پر ایمان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ نجات کے لئے جس طرح خدا کو ماننا ضروری ہے، رسولوں کو ماننا بھی ضروری ہے، پھر آیت میں صرف ﴿مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ﴾ کیوں کہا ﴿وَرَسُوْلِهٖ﴾ کیوں نہیں بڑھایا؟

جواب: اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: آیت میں مذکورہ امتیں الگ الگ زمانوں کی ہیں، پس جب یہ امتیں الگ الگ زمانوں کی ہیں تو کونسے رسول کا تذکرہ کریں گے؟ ایک زمانہ کے لوگ ہوتے تو کہا جاتا: فلاں رسول پر ایمان لائے، یہ تو الگ الگ زمانوں کی امتیں ہیں، ان کے نبی بھی الگ الگ ہیں، اس لئے نبی کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ فرمایا: ﴿مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ﴾: جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر ﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾: اور اس نے نیک کام کئے، نیک کام وہی ہیں جو اللہ نے نبیوں کے ذریعہ انسانوں کو بتائے ہیں، لہٰذا تمام امتوں کے پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانوں میں جو اپنی امتوں کو نیک کام بتائے ہیں ان پر عمل کرے تو اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ یہودی اللہ پر ایمان لائے، اپنے نبی پر ایمان لائے، اپنے نبی کی کتاب پر عمل کر کے نیک کام کرے تو ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں، صابئین کے لئے بھی یہی ضابطہ ہے، عیسائیوں کے لئے بھی یہی ضابطہ ہے اور اس امت کے لئے بھی یہی ضابطہ ہے۔

دوسری وجہ: عمل صالح پر ابھارنی والی چیزیں: اللہ پر ایمان لانا اور آخرت کا ڈر ہیں۔ رسول پر ایمان لانا اس کا خاص محرک نہیں، بلکہ جب اس محبت میں غلو ہوتا ہے تو بدعقیدگی اور بے عملی پیدا ہوتی ہے۔ بریلویوں میں جو بدعقیدگی اور بے عملی پائی جاتی ہے اس کا سبب حب نبوی میں افراط اور غلو ہی تو ہے۔ ان کا ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ہم محبوب کی امت ہیں، اس لئے ہم تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔

پس جو لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ مسلمان خواہ نام کے مسلمان ہوں، مرتے ہی جنت میں جائیں گے، وہ یہ غلط فہمی دور کرلیں۔ آیتِ کریمہ کا صحیح مطلب یہی ہے، نجات کے لئے صرف توحید کافی ہے: یہ آیت کا مطلب ہرگز نہیں۔

حضورؐ کی دو ذمہ داریاں:

حضورؐ کی ڈیوٹی اور فریضہ کیا ہے؟ فرمایا: ﴿بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾: جو لوگ بات قبول کرلیں، آپؐ ان کو خوشخبری سنانے والے ہیں اور جو بات قبول نہ کریں ان کو نتائج اعمال سے ڈرانے والے ہیں کہ جس راستہ پر تم جارہے ہو اس کے ختم پر جہنم کا گڑھا ہے، پھر ان کی مرضی ہے وہ بات سمجھیں یا نہ سمجھیں، چلتے رہیں یا راستہ بدلیں۔ نبی کا کام صرف ڈرانا ہے، لوگوں کو زبردستی دین حق پر لے آنا نبی کا کام نہیں، یہ تو اللہ کے اختیار کی بات ہے، اور جنھوں نے بات سمجھ لی اور راستہ بدل دیا ان کو خوش خبری سنائیں کہ تمہارے ایمان اور عمل صالح کا بدلہ آخرت میں جنت کی شکل میں ملے گا اور جنت میں یہ یہ نعمتیں ملیں گی۔

ایمان اور اعمال صالحہ کا بدلہ اس دنیا میں نہیں:

بعض لوگ دنیا ہی میں ایمان اور عمل صالح کے بدلہ کے امیدوار رہتے ہیں، اس سلسلے میں جاننا چاہئے کہ اس کا بدلہ اس دنیا میں نہیں، حدیث میں ہے کہ ایک صاحب حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں اگر میں ایمان لے آؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: جنت ملے گی! انھوں نے کہا: یارسول اللہ! ہاتھ بڑھائیے! حضورؐ نے ہاتھ لمبا کیا، انھوں نے بیعت اسلام کی۔

اس حدیث میں حضورؐ نے دنیا کی کوئی خوش خبری نہیں سنائی کہ تم ایمان لے آؤ گے تو ہم رہنے کے لئے تمہیں گھر دیں گے، پہننے کے لئے کپڑے دیں گے، لاکھ دو لاکھ روپے دیں گے، تم کو بڑا بنادیں گے، نہیں! کچھ بھی نہیں، جو کچھ دنیا میں مل جائے وہ اللہ کا کرم ہے، جس کی قسمت میں اللہ نے جو لکھا ہے وہ ملے گا اور جو تم ایمان لارہے ہو اس کے بدلے میں جنت ملے گی۔ بشیرا کا یہی مطلب ہے۔

اور اگر کوئی نبی کی بات نہیں مانتا، من مانی زندگی گذارتا ہے تو انبیاء اس کو سزا سے ڈرانے والے ہیں اور وہ سزا کسی کو نظر نہیں آتی، کیونکہ وہ آگے آرہی ہے، انبیاء اس کی خبر دے رہے ہیں، اسی کا نام انذار ہے، جو چیزیں سامنے ہوں ان سے کیا ڈارنا؟ سامنے شیر

کھڑا ہے اس سے ڈرانے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک چیز ہے جو آگے آرہی ہے، وہ دکھتی نہیں مگر یقیناً آنے والی ہے اس کی پہلے سے خبر دینے کا نام إنذار (ڈرانا) ہے۔

تو انبیاء یہ بتاتے ہیں کہ دیکھو اگر میری بات نہیں مانو گے تو دنیا تو کسی طرح گذر جائے گی لیکن مرتے ہی یہ ہوگا وہ ہوگا، یہ جو قرآن وحدیث نے خبریں دی ہیں یہ سب انذار ہے اور انبیاء کا کام انذار تک محدود ہے، کسی کو زبردستی ایمان کے دائرہ میں لے آنا ان کے اختیار میں نہیں، اسی لئے فرمایا: ﴿أَرْسَلَهُ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَنَذِيْرًا﴾: اللہ نے حضورؐ کو دین حق کے ساتھ بھیجا، درانحالیکہ آپؐ خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے ہیں۔

قیامت کے سامنے حضورؐ کو بھیجنے کا مطلب:

قوله: بين يَدَيِ الساعة: اللہ نے حضورؐ کو قیامت کے سامنے بھیجا ہے۔ **بين يدى** کے معنی ہیں: سامنے، جمعہ کے دن جب امام منبر پر بیٹھتا ہے تو دوسری اذان **بين يدى الإمام** ہوتی ہے، یعنی امام کے سامنے ہوتی ہے، اس کا مطلب بعض اذان دینے والے یہ سمجھتے ہیں کہ امام منبر پر بیٹھا ہو تو اس کے منہ کے قریب جا کر اذان دی جائے تا کہ منہ سے تھوک نکلے تو امام پر گرے۔ امام کے سامنے کا یہ مطلب نہیں ہے، امام کے سامنے کا مطلب یہ ہے کہ مؤذن دائیں بائیں نہ ہو، بالکل سامنے ہو اور مسجد سے باہر بھی نہ ہو، کیونکہ پھر امام کو مؤذن نظر نہیں آئے گا جبکہ یہ اذان امام کے سامنے ہے۔ تو یہاں بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اور قیامت کے سامنے حضور کو بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ اور قیامت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں، اس درمیان کوئی اور نبی تشریف لانے والے نہیں، اب حضورؐ ہی کا لایا ہوا دین قیامت تک چلے گا۔

قرآن ہی کی حفاظت کی ذمہ داری کیوں لی؟

اور اسی لئے پچھلی کسی کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے نہیں لی اور حضورؐ پر جو کتاب اتاری اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی، کیونکہ اگر قرآن محفوظ نہیں رہے گا تو حضورؐ کا لایا ہوا دین باقی نہیں رہے گا۔ اور جب حضور کا لایا ہوا دین باقی نہ رہا تو ہدایت کا چراغ گل

ہوگیا، لوگ اندھیرے میں رہ جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کی دارو گیر کیسے کریں گے؟ قیامت تک روشنی پھیلی رہنی چاہئے، پھر لوگ آنکھیں موندلیں، اور روشنی نہ دیکھیں تو یہ ان کا قصور ہے، لیکن روشنی چہار سو پھیلی رہنی چاہئے، اور وہ روشنی قرآن اور حدیثیں ہیں، ان کا وجود قیامت تک بعینہٖ باقی رہنا چاہئے، صحابہ کے سامنے بھی یہی قرآن اور یہی حدیثیں تھیں، کوئی نئی چیز نہیں تھی، آج بھی ہمارے سامنے یہی قرآن اور یہی حدیثیں ہیں، اور قیامت تک تمام مسلمانوں کے سامنے یہی دو چیزیں رہیں گی۔

میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے: کا مطلب

بہر حال حضورؐ اور قیامت کے درمیان کسی نبی کا فاصلہ نہیں، حضور ﷺ خاتم النّبیین ہیں، یہ مضمون حضورؐ نے ایک دوسری حدیث میں مثال دے کر سمجھایا ہے، فرمایا: بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ: میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں، اور آپؐ نے دو انگلیوں (سبابہ اور وسطی) کو ملایا۔ ان دو انگلیوں کو ملانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جیسے یہ انگلی اِس انگلی کے ساتھ ملی ہوئی ہے اسی طرح میں اور قیامت ملے ہوئے ہیں، میرے اور قیامت کے درمیان کسی اور نبی، کسی اور کتاب، کسی اور دین کا فصل نہیں، جیسے ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی فصل نہیں۔

دوسرا مطلب: علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ بیچ کی انگلی بڑی ہے، اور تھوڑی آگے ہے، اور دوسری انگلی تھوڑی چھوٹی ہے اور پیچھے ہے، پس حضورؐ قیامت سے اتنا پہلے بھیجے گئے ہیں۔ جب چھوٹی انگلی بڑی انگلی کے برابر ہو جائے گی تو قیامت آجائے گی۔

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام سے اعتراض کا جواب:

یہاں کوئی سوال کرسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو دجال کے زمانہ میں اتریں گے، پھر آپؐ خاتم النّبیین کہاں رہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے تشریف لانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ نئے نبی نہیں ہیں، وہ تو پچھلے دور کے نبی ہیں، جب آپؐ کے دور میں تشریف لائیں گے تو انجیل وتورات

پر عمل نہیں کریں گے، لوگوں کی تورات وانجیل کے مطابق راہ نمائی نہیں کریں گے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو قرآن وحدیث سکھلائیں گے، قرآنِ کریم میں دو جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے کہ ہم ان کو چار چیزیں سکھلائیں گے: قرآن، حدیث، تورات اور انجیل ﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالإِنْجِيلَ﴾: پس تورات وانجیل تو ان کے زمانہ میں تھیں لیکن قرآن وحدیث تو اس زمانہ میں نہیں تھیں، پھر اللہ کب سکھلائیں گے؟ جب قیامت کے قریب آپؑ اتریں گے اس وقت یہ دونوں چیزیں سکھلائیں گے، پھر حضرت عیسیٰؑ ان دونوں کے مطابق خود بھی عمل کریں گے اور امت محمدیہ کی بھی راہ نمائی کریں گے، لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کے تشریف لانے سے حضورؐ کے خاتم النّبیین ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں اگر کوئی نیا نبی آتا، خواہ کسی نوعیت کا آتا اور کامل نیا دین لے کر آتا یا جزوی طور پر نیا دین لے کر آتا تو خلل پڑتا، لیکن ایسا نہیں ہوگا۔

حضرت عیسیٰؑ ہی کو کیوں اٹھایا گیا اور انہی کو کیوں اتارا جائے گا؟

یہاں بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر عیسیٰؑ ہی کو قیامت سے پہلے کیوں اتارا جائے گا؟ پھر دوسرا سوال یہ بھی کرتے ہیں کہ حضورؐ سے پہلے تو کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء گذرے ہیں، ان میں سے صرف عیسیٰؑ ہی کو کیوں اٹھایا گیا؟ اور انہی کو کیوں اتارا جائے گا؟ ان سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کو یہودیوں نے آرے سے چیر کر شہید کیا، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے انبیاء کو یہودیوں نے قتل کیا، پس اللہ نے کسی اور نبی کو کیوں نہیں اٹھایا، عیسیٰؑ ہی کو کیوں اٹھایا؟

ختم نبوت کی تین صورتیں:

اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ حضورؐ تین طرح سے خاتم النّبیین ہیں:

ایک: اس طرح کہ تمام نبیوں کے دنیا میں آجانے کے بعد آخر میں نبی ﷺ تشریف لائے ہیں، اس کا نام: ختم نبوت زمانی ہے، یعنی زمانہ کے اعتبار سے آپؐ سب سے آخر میں آئے ہیں۔ اور اس کو سب مسلمان جانتے ہیں، اس لئے اس کی زیادہ وضاحت

کی ضرورت نہیں۔

دوسری: اس طرح کہ آپؐ وصفِ نبوت کے ساتھ بالذات متصف ہیں، اور دوسرے تمام انبیاء آپؐ کے فیض سے انبیاء بنے ہیں، یعنی سلسلۂ نبوت آپؐ پر منتہی ہوتا ہے، جیسے سورج کی روشنی ذاتی ہے، کسی اور جگہ سے مستفاد نہیں، اور زمین اور چاند کی روشنی عرضی ہے، سورج سے مستفاد ہے۔ اسی طرح آپ آفتابِ نبوت ہیں، اور دوسرے انبیاء چاند تارے ہیں، ان کو نبوت آپؐ کے فیض سے ملی ہے، اس کا نام 'ختم نبوت رتبی' ہے۔

اس کی دلیل کیا ہے؟ دلیل یہ ہے کہ پچھلے نبیوں میں سے کسی ایک نبی کو حضورؐ کے زمانہ میں اتارا جائے جو خود نبی ہوتے ہوئے بھی حضورؐ کے دین پر عمل کریں۔ اور دوسروں کی اس کے مطابق راہ نمائی کریں، اس سے ان کا حضورؐ کے ماتحت ہونا معلوم ہوگا، اگر پچھلا کوئی نبی نہ آئے تو یہ صرف کہنے کی بات ہوگی کہ حضورؐ پہلے والے سب نبیوں کے لئے بھی خاتم ہیں، اور اب جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اتار کر عملی طور پر یہ دکھایا جائے گا تو ثابت ہوجائے گا کہ حضورؐ مستقبل کی طرح ماضی کے بھی خاتم النّبیین ہیں۔

چنانچہ ایک سلسلۂ بیان میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا: **لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِيْ**: اگر موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے تو ان کے لئے میری اتباع کے بغیر چارہ نہیں تھا، یعنی پچھلا کوئی بھی نبی ہو: موسیٰؑ ہوں، عیسیٰؑ ہوں، نوحؑ ہوں، ابراہیمؑ ہوں اگر وہ حضورؐ کے زمانہ میں آئیں تو حضور ہی کی اتباع کریں گے، کیونکہ حضورؐ خاتم النّبیین ہیں، یہی بات ظاہر کرنے کے لئے اور ساری دنیا کو دکھانے کے لئے ایک نبی کو قیامت کے قریب اتارا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ دیکھو یہ اپنی نبوت موقوف کرکے حضور کی اتباع کررہے ہیں۔ اور سورۂ آل عمران (آیت ۸۱) میں جو میثاق مذکور ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

اس پر سوال ہوگا کہ یہ کام تو کسی بھی نبی کو اتار کرلیا جاسکتا ہے، جتنے انبیاء قتل کئے گئے ہیں ان میں سے کسی کو بھی دشمن سے بچا کر اٹھالیا جاتا اور قیامت کے قریب اتارا جاتا تو مقصد حاصل ہوجاتا، خاص طور پر عیسیٰؑ ہی کو کیوں اٹھایا گیا اور انہی کو کیوں اتارا جائے گا؟

مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت:

اس کو سمجھنے کے لئے ایک دوسرا مضمون سمجھنا ضروری ہے: وہ یہ ہے کہ مسیح دو ہیں: ایک: مسیح ہدایت ہیں، اور ایک: مسیح ضلالت، مسیح ہدایت: حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور مسیح ضلالت: کانا دجال ہے، مَسِیْحٌ: فعیلٌ کا وزن ہے جو اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسم مفعول کے معنی میں بھی، مسیح بمعنی ماسح کے معنی ہیں: ہاتھ پھیرنے والا۔ حضرت عیسیٰؑ مسیح اس لئے ہیں کہ وہ ہر طرح کے بیماروں پر ہاتھ پھیرتے تھے اور ان کے ہاتھ پھیرنے سے اللہ تعالیٰ شفا بخشتے تھے۔ اور مسیح بمعنی ممسوح کی معنی ہیں: ہاتھ پھیرا ہوا۔ کانا دجال مسیح اس لئے ہے کہ اس کی ایک آنکھ چوپٹ ہوگی، گویا وہاں کسی نے ہاتھ پھیر دیا ہے، اور وہ جگہ مٹ گئی ہے اور آنکھ نہیں رہی!

اور ہر نبی نے اپنی امت کو بتایا ہے کہ شیطان انسانوں کا کھلا دشمن ہے، وہ یہ مشن لے کر چل رہا ہے کہ انسانوں کو صحیح راستہ پر نہ چلنے دے۔ اور شیطان چھوٹے بڑے بہت ہیں، ایک بڑا شیطان بالکل شروع میں ہے اور ایک بڑا شیطان بالکل آخر میں ہے، اگلے بڑے شیطان کا نام: عَزَازِیْل ہے، اور اس کا لقب: ابلیس ہے، یعنی اللہ کی رحمت سے قطعی مایوس۔ اور آخری شیطان کا نام مسیح دجال ہے، یعنی کانا چار سو بیس۔ یہ کب آئے گا؟ اس کا ٹائم اور زمانہ نہیں بتایا گیا، پچھلے تمام نبیوں نے بھی اپنی امت کو اس کے فتنہ سے خبر دار کیا ہے اور حضورؐ نے بھی خبر دار کیا ہے اور اب تو اس کا حضورؐ کی امت میں آنا طے ہے کیونکہ اب قیامت تک دوسری کوئی امت نہیں۔

بہر حال جہاں انبیائے نبی اسرائیل نے مسیح ضلالت کے فتنہ سے آگاہ کیا ہے، وہیں مسیح ہدایت کی خوش خبری بھی دی ہے، پس گویا پچھلی کتابوں میں مسیح ہدایت کا بھی تذکرہ تھا اور مسیح ضلالت کا بھی، اس لئے جب عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور انھوں نے کہا کہ میں وہ مسیح ہدایت ہوں جس کی خبر فلاں پیغمبر نے دی ہے، فلاں نے دی ہے، فلاں نے دی ہے، تو یہودیوں نے نہیں مانا اور کہا کہ تم مسیح ہدایت نہیں بلکہ مسیح ضلالت ہو، اور اسی بناء پر تمام یہودیوں نے ان کی مخالفت کی، علاوہ بارہ حواریوں کے، اور مسیح ضلالت سمجھنے کی وجہ سے

انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کا پلان بنایا، اور اپنے گمان میں مار بھی ڈالا۔ اب وہ مسیح ہدایت کا انتظار کررہے ہیں، آج بھی یہودیوں میں جو پڑھے لکھے ہیں ان سے قریب ہوکر معلوم کریں تو وہ بتائیں گے کہ مسیح ہدایت آنے والے ہیں اور جن کو ہم نے قتل کیا ہے: وہ مسیح ضلالت تھا۔ چنانچہ جب کانا دجال ظاہر ہوگا تو حدیثوں میں ہے کہ سب سے پہلے یہودی اس کا اتباع کریں گے، کیونکہ وہ مسیح ہدایت کے انتظار میں ہیں اور جس کو انھوں نے قتل کیا تھا وہ تو ان کے خیال میں کانا دجال تھا، پس اب جو مسیح آئے گا وہ مسیح ہدایت ہوگا، اس لئے وہ دوڑ کر کانے دجال کی پیروی کریں گے اور سب سے زیادہ متابعت کرنے والے یہودی ہوں گے اور وہ ساری دنیا کو یہ یقین دلانا چاہیں گے کہ یہ مسیح ہدایت ہیں، اور جو پہلے مسیح آیا تھا وہ مسیح ضلالت تھا۔

بتاؤ اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا کہ یہ کانا دجال مسیح ہدایت نہیں ہے، بلکہ مسیح ضلالت ہے؟ اس کی صورت بس یہی ہے کہ جو مسیح ہدایت ہیں وہ بھی اسی زمانہ میں اتریں اور دونوں مسیح ایک ساتھ اکٹھا ہوں اور جو جس کو ختم کرے وہ مسیح ہدایت ہے اور جو مر جائے وہ مسیح ضلالت ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لاکر علی الاعلان کانے دجال کو قتل کریں گے اور معاملہ دو اور دو چار کی طرح واضح ہوجائے گا کہ مسیح ہدایت یہ ہیں، اور یہ جو کمبخت مارا گیا یہ مسیح ضلالت کانا دجال تھا۔ یہ ہے وہ مقصد جو حضرت عیسیٰؑ ہی کو اتارنے سے پورا ہوسکتا ہے، کسی اور نبی کے اتارنے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔

اصل مضمون تو میں یہ بیان کررہا تھا کہ **بین یدی الساعۃ** میں اعلان ہے کہ حضورؐ قیامت سے پہلے آئے ہیں اور حضور اور قیامت کے بیچ میں کوئی نبی نہیں، اور حضور خاتم النّبیین ہیں تین طرح سے: ایک خاتم النّبیین زمانی ہیں یعنی حضور سب نبیوں کے آخر میں آئے ہیں۔ دوم: خاتم النّبیین رُتَبِی ہیں یعنی سب انبیاء آپؐ کے فیض سے نبی بنے ہیں، پس مرتبہ آپؐ کا سب سے بڑا ہے۔

سوم: خاتم النّبیین مکانی ہیں یعنی اللہ کی کائنات میں جو بے شمار مخلوقات ہیں، ان میں سے جو بھی مکلّف مخلوق ہے وہاں نبوت کا سلسلہ جاری ہے، اور اللہ کی کتابیں وہاں ضرور

نازل ہوتی ہیں، اور وہاں بھی انبیاء اور ان کے خاتم ہیں، مگر وہ بھی سب آپؐ کے فیض سے انبیاء اور خاتم انبیاء ہیں، اصل وصفِ نبوت کے ساتھ آپؐ متصف ہیں، اور آپؐ کی بعثت ہماری اس زمین میں ہوئی ہے، اور یہ زمین تمام زمینوں سے اشرف و افضل ہے۔ اس لئے اس زمین کا خاتم ہی اصل خاتم ہے، اور دوسری زمینوں کے خاتم اس زمین کے خاتم کے فیض سے خاتم ہیں یہی ختم نبوت مکانی ہے۔

قادیانی دھوکہ:

آپ کے ان ملکوں میں قادیانی ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ وہ کسی کو گمراہ کریں، اس لئے قادیانی جو کہتے ہیں وہ بھی سنتے چلو، وہ کہتے ہیں: حضورؐ سے پہلے نبوت دو طرح کی تھی، تشریعی اور غیر تشریعی۔ تشریعی یعنی نیا قانون لانے والا نبی، جیسے موسیٰ علیہ السلام تشریعی نبی ہیں، پھر آگے جتنے انبیاء بنی اسرائیل ہوئے ہیں وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے، بلکہ موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت کی خدمت کرتے ہیں، پس وہ غیر تشریعی انبیاء ہیں۔ قادیانی کہتے ہیں کہ حضورؐ ان دونوں قسموں کے لئے خاتم ہیں یعنی اب حضورؐ کے بعد نہ کوئی تشریعی نبی آسکتا ہے نہ غیر تشریعی، البتہ حضورؐ کے بعد نبوت کی ایک تیسری قسم شروع ہوئی ہے اور وہ ہے: امتی نبی، یعنی حضور کی امت کا ایک فرد حضور کی اتباع میں اتنا کمال پیدا کرلے کہ اللہ اسے نبوت سے سرفراز کردیں، اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارا مرزا ایسا ہی نبی تھا۔ اب آپ ختم نبوت سے متعلق قرآن کی جو بھی آیت پیش کریں گے یا جو بھی حدیث پیش کریں گے: وہ فوراً کہہ دیں گے کہ جو نبوت کی دو قسمیں ختم ہوگئیں ہیں، ان کے بارے میں یہ آیتیں اور یہ حدیثیں ہیں، امتی نبی کے بارے میں یہ نہیں ہیں، لہٰذا ان کو کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان سے تین باتیں پوچھو:

پہلی بات: ان سے یہ پوچھو کہ یہ جو تیسری قسم حضورؐ کے بعد شروع ہوئی ہے وہ کونسی آیت یا حدیث سے ثابت ہے؟ وہ بغلیں جھانکیں گے۔ وہ قیامت کی صبح تک کوئی آیت یا حدیث پیش نہیں کرسکتے۔ لہٰذا ان کو ختم نبوت کی دلیل مت دو، وہ تو ماننے والے نہیں، انہی سے دلیل کا مطالبہ کرو۔

دوسری بات: ان سے یہ پوچھو کہ تیرا مرزا کب پیدا ہوا؟ وہ بتائے گا: فلاں سن میں! وہ کب نبی بنا؟ وہ بتائے گا: فلاں سن میں، ان سے پوچھو: اس کے زمانے تک حضورؐ سے کتنا فاصلہ ہوگیا؟ وہ بتائے گا: تیرہ سو سال کا! اب پوچھو تیرہ سو سال میں کوئی اور امتی نبی بنا؟ وہ کہے گا: نہیں! پہلا امتی نبی میرا مرزا ہے، تو آپ اس سے کہیں کہ ان تیرہ سو سال میں کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو حضور کی پیروی میں کمال پیدا کرتی، ابوبکرؓ نے کمال پیدا نہیں کیا، عمرؓ نے نہیں کیا، عثمانؓ نے نہیں کیا، علیؓ نے نہیں کیا، صرف تیرے مرزا ہی نے کمال پیدا کیا؟

تیسری بات: اس سے یہ پوچھو کہ تیرے مرزا کے بعد قیامت کتنی دور ہے؟ وہ کہے گا: معلوم نہیں، مگر بہت دور ہے! اب پوچھو: قیامت تک امتی نبی کتنے آئیں گے؟ وہ کہے گا: اب کوئی نہیں پیدا ہوگا، میرا مرزا ہی آخری امتی نبی ہے۔

پس میرے بھائیو! جھگڑا یہ ہوا کہ خاتم النّبیین سرکار مدینہ ہیں یا یہ مرزا غلام احمد قادیانی؟ ساری امت کہتی ہے: خاتم النّبیین سرکارِ مدینہ ہیں، اور یہ قادیانی کہتا ہے: نہیں وہ خاتم النّبیین نہیں ہیں، خاتم النّبیین مرزا ہے، کیونکہ اس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔

ایک اور دھوکہ: کہ نبوت رحمت ہے: اس کو جاری رہنا چاہئے

قادیانی نادان مسلمانوں سے پوچھتے ہیں: نبوت رحمت ہے یا زحمت؟ کون کہے گا کہ زحمت ہے؟ سب جواب دیں گے: رحمت ہے؟ اب قادیانی کہے گا: رحمت پر بین (پابندی) لگنی چاہئے یا وہ جاری رہنی چاہئے؟ ہر شخص اس کا جواب یہی دے گا کہ رحمت جاری رہنی چاہئے، اب وہ کہے گا کہ آپ ﷺ کے بعد بھی نبوت جاری ہے، کیونکہ وہ رحمت ہے، اور مرزا قادیانی نبی ہے، پس اس کو مانو۔

اس کا جواب: یہ ہے کہ بارش بھی رحمت ہے، پس اگر وہ ہر وقت برستی رہے تو رحمت ہوگی یا عذاب؟ اصل بات یہ ہے کہ رحمت: اس وقت تک رحمت ہے: جب بوقت حاجت ہو اور بقدر حاجت ہو، ورنہ وہ عذاب ہے۔ بارش موقعہ پر برسے اور بقدر ضرورت برسے تو رحمت ہے، ناوقت برسے یا برستی ہی رہے تو وہ طوفانِ نوح بن جائے گی، اور رحمت نہیں رہے گی۔

اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ جب گذشتہ نبی کا دین باقی نہ رہے، اور دنیا میں اندھیرا اچھا

جائے، اور دوسرا نبی آئے اور وہ ہدایت کی روشنی دکھائے تو یہ نبوت رحمت ہے۔ مگر نبی ﷺ کے بعد تو یہ صورت نہیں، قرآن وسنت بحالہ باقی ہیں، ان میں زبر زیر کا فرق نہیں آیا۔ ان کے سوتے خشک نہیں ہوئے، اب نیا نبی خواہ وہ کیسا ہی ہو، آ کر کیا کرے گا؟ سوائے اس کے کہ آپؐ کے دین کو بگاڑے، اور جہاد کو منسوخ کر کے اپنے آقا برطانیہ کو خوش کرے: اور کیا کرے گا؟ ایسی جھوٹی نبوت رحمت نہیں بلکہ زحمت ہے، بلکہ بہت بڑا فتنہ ہے۔

قادیانیوں کے تذکرے کی ضرورت:

اس طرح وہ دھوکہ دے کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور ہمیں ان کا تذکرہ کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وہ ہم میں گھستے ہیں۔

دیکھو ہمارا یہ محلّہ ہے اس میں شیعہ بھی ہیں ہمیں ان کا تذکرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ہمیں ان سے کوئی پریشانی نہیں، وہ الگ ہیں ہم الگ ہیں، وہ جو کرتے ہیں کرتے ہیں، ہمیں ان سے نہ کچھ لینا ہے نہ دینا، لیکن قادیانیوں کا تذکرہ ہمیں اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں گھستے ہیں اور کہتے ہیں کہ جیسے حنبلی، شافعی، مالکی اور حنفی ایسے ہی ہم احمدی، پس جب تم حنفی سے شافعی ہو جاؤ تو کوئی حرج نہیں۔ شافعی سے حنبلی ہو جاؤ تو کوئی حرج نہیں، اسی طرح اگر تم احمدی ہو جاؤ تو کیا حرج ہے؟ اور لو ایک لاکھ ڈالر، اور جو حسین خوبصورت لڑکی چاہو اس سے تمہارا نکاح کئے دیتے ہیں۔

اس طرح زر اور زن کا لالچ دیتے ہیں اور مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

بہر حال بین یدی الساعة کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضور کو دین حق کے ساتھ قیامت سے پہلے بھیجا ہے اور حضور اور قیامت کے درمیان کسی طرح کا کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، نہ تشریعی، نہ غیر تشریعی، نہ امتی!

اطاعت کامیابی کی کنجی ہے:

قولہ: ومن يطع الله ورسوله فقد رَشَد واهْتَدى: اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، ان کے احکام کو مانتا ہے، وہ یقیناً راہ راست پر آ گیا اور اس نے

ہدایت پالی، صرف مسلمان نام ہونے سے یا اپنے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہنے سے کہ میں مسلمان ہوں: ہدایت اور کامیابی نہیں مل سکتی، اللہ اور اس کے رسول نے جو احکام دیئے ہیں ان کی اطاعت کرو تو ہی ہدایت اور کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہو، یہی کامیابی کی کنجی ہے۔

اللہ و رسول کی نافرمانی اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہے:

قولہ: وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَلَا يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهُ: اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ ضرر نہیں پہنچاتا مگر اپنے آپ کو، اللہ کی نافرمانی رسول کی نافرمانی ہے اور رسول کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے، رسول نے کوئی حکم اپنی طرف سے نہیں دیا، رسول کے دیئے ہوئے احکام اللہ کے احکام ہیں، لہٰذا ایک کی نافرمانی نہیں ہو سکتی، جہاں بھی نافرمانی ہوگی دونوں کی ہوگی، اور جو شخص دونوں کی نافرمانی کرتا ہے وہ جان لے کہ اس سے اللہ کی شان میں کچھ کمی نہیں آئے گی۔ اس سے رسول کی عزت میں کیا کمی آئے گی؟ تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ ایک حدیث قدسی میں ہے: اگر تمام آسمانوں کی مخلوقات، تمام زمینوں کی مخلوقات، تمام جنات اور تمام انسان مجتمع ہو جائیں بدبخت سے بدبخت انسان کے دل پر تو اللہ کی شان میں ذرہ بھر کمی نہیں آسکتی، اور اگر سب مجتمع ہو جائیں بڑے سے بڑے پرہیزگار کے دل پر تو اللہ کی شان میں ذرہ بھر زیادتی نہیں ہو سکتی، لہٰذا جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتا، وہ اپنا ہی بگاڑتا ہے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مارتا ہے، وہ یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لے۔ **وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔**

۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنِ کریم متقیوں کے لئے راہ نما کتاب ہے

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿الٓمٓ، ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ، هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ﴾

بزرگانِ محترم! برادرانِ اسلام! اور معزز بھائیو! اللہ جل شانہ کا شکر ہے: اس نے ہمیں ایک مرتبہ اور جمع کیا۔ اب ہم مہینہ بھر ایک ساتھ رہیں گے، اور اللہ جو کچھ کہنے کی توفیق عطا فرمائے گا: کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہماری زندگی کے سانس بڑھائے اور یہ مبارک موقعہ عنایت فرمایا کہ ہم مل بیٹھیں، دین کے تعلق سے کچھ باتیں کریں، مؤمن کی زندگی بڑی قیمتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے: بہترین شخص وہ ہے جس کی زندگی لمبی ہو اور نیک کاموں کی توفیق ملے، یہ خوش نصیبی ہے انسان کی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان سے ہمکنار فرمایا ہے، دعا کریں: وہ ہمیں ماہِ مبارک میں نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائیں۔

سورۂ فاتحہ کسی پارے کا جزء نہیں

میں نے جو آیتِ کریمہ پڑھی ہے، یہ پہلے پارے کی پہلی آیت ہے، اور الحمد شریف کسی پارے کا جزء نہیں، تمام پاروں سے الگ ہے، پارے ﴿الٓمٓ، ذٰلِكَ الْكِتَابُ﴾ سے شروع ہوتے ہیں، اور یہ پارے اللہ کے یہاں سے نازل نہیں ہوئے، لوگوں نے بنائے ہیں، جیسے لوگوں کی سہولت کے لئے قرآن میں رکوع لگائے گئے ہیں، اور لوگوں کی سہولت ہی کے لئے ہر پارہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح لوگوں کی سہولت کے لئے

قرآنِ کریم کو تیس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

لفظ پارہ فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں: ٹکڑا۔ ایک چیز کے چند ٹکڑے کئے جائیں تو وہ پارے کہلاتے ہیں۔ اور الحمد شریف پورے قرآنِ کریم کا تعارف ہے، اس لئے اگر اس کو کسی پارے میں شامل کریں گے تو وہ اس پارے کا تعارف ہو جائے گا، باقی انتیس پاروں سے اس کا تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے الحمد شریف کو الگ رکھا گیا ہے اور باقی قرآن کے تیس پارے کئے گئے ہیں۔

قرآن میں کہیں انگلی رکھنے کی جگہ نہیں

غرض پہلا پارہ یہاں سے شروع ہو رہا ہے یہ اس کی پہلی آیت ہے، اس میں قرآنِ کریم کا تعارف ہے، فرمایا: ﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ﴾ اس کتاب میں کوئی شک کی بات نہیں، کسی کو کوئی شک ہو تو پیش کرے، کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بھینگے کو ایک چیز دو نظر آتی ہیں۔ بھینگے کی آنکھ میں قصور ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کو ایک چیز دو نظر آتی ہیں۔ اسی طرح کبھی ذائقہ خراب ہو جاتا ہے تو میٹھی چیز کڑوی معلوم ہوتی ہے، اور کڑوی میٹھی، یہ حقیقت میں ذائقہ کا فساد ہے، اسی طرح کبھی عقل میں فتور آ جاتا ہے، عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں، اگر آنکھوں پر لال چشمہ پہن لیا جائے تو ہر چیز لال نظر آئے گی۔ ایسے ہی دماغ پر چھلکے چڑھ جاتے ہیں اور عقل خالص باقی نہیں رہتی تو بعض لوگوں کو قرآن کی کسی بات پر اعتراض ہوتا ہے کہ یہ اللہ نے کیا فرما دیا؟ پس اگر کسی کو ایسا اشکال پیش آئے تو حضور کے زمانے میں، حضور ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ اس کو سمجھائیں، اور اس کا اشکال دور کریں۔ اور اب یہ ذمہ داری حضور کے وارثین کی ہے، کسی کو ایسا اشکال پیش آئے تو علماء کے سامنے لائے، وہ صحیح بات سمجھائیں گے۔

ایک صحابی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ ہیں، وہ مشہور سخی حاتم طائی کے لڑکے ہیں، حاتم کا تو اسلام سے پہلے انتقال ہو گیا تھا، مگر اس کے یہ لڑکے مسلمان ہوئے ہیں، وہ پہلے عیسائی تھے۔ وہ فرماتے ہیں: جب میں مسلمان ہوا، اور میں نے قرآنِ کریم پڑھا

تو مجھے سورۂ توبہ کی ایک آیت میں اشکال پیش آیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہود ونصاری نے اپنے علماء کو اور اپنے بزرگوں کو رب بنالیا ہے: ﴿اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ جب میں نے یہ آیت پڑھی تو مجھے اشکال ہوا کہ یہود ونصاری اپنے بزرگوں کو اور علماء کو خدا نہیں مانتے۔ چنانچہ میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں قرآن میں یہ آیت پڑھتا ہوں جب کہ صورتِ حال یہ ہے کہ عیسائی اور یہودی اپنے علماء کو اور اپنے بزرگوں کو خدا اور رب نہیں مانتے۔ پھر اس آیتِ کریمہ کا کیا مطلب ہے؟ حضور نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ جب وہ کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا اعلان کرتے ہیں لوگ وہ اس کو مان لیتے ہیں؟ حضرت عدی نے کہا: یارسول اللہ! ایسا تو ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہی ان کو رب بنانا ہے، کیونکہ کسی چیز کو حلال کرنا: یہ اللہ کا اختیار ہے، نبیوں کو بھی یہ اختیار نہیں دیا گیا۔ پھر بزرگوں کے پاس اور علماء کے پاس یہ اختیار کہاں سے آگیا! ان کو یہ اختیار دینا اور ان کی بات مان لینا یہی ان کو خدا بنانا ہے

غرض صحابہ کرام کو اگر قرآنِ کریم کی کسی آیت میں اشکال پیش آتا تھا تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اپنا اشکال پیش کرتے تھے، حضور ان کو سمجھاتے تھے اور ان کا اشکال دور کرتے تھے، کیونکہ قرآن کی شان: ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ہے، قرآن میں شک کی کوئی بات نہیں، قرآن میں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں کوئی انگلی رکھ سکے اور کہہ سکے کہ یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

اور اب جبکہ حضور اکرم ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے، اور قیامت تک لمبا زمانہ ہے، اور زمانہ الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ حالات میں تبدیلی آتی ہے، ان بدلے ہوئے حالات میں اگر کسی مسلمان کے ذہن میں کوئی بات آئے تو آسکتی ہے، جب صحابہ کے ذہن میں ایسی باتیں آتی تھیں تو آج مسلمانوں کے ذہن میں بھی آسکتی ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ اپنا اشکال علماء کے سامنے لائیں، وہ انبیاء کے وارث ہیں۔ حضور اپنے زمانے میں ایسی باتیں حل کرتے تھے، آج ان کو حل کرنے کی ذمہ داری علماء کی ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

قرآنِ کریم پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے

قرآنِ کریم اس لئے آیا ہے کہ سب انسانوں کی اور خاص طور پر ان انسانوں کی جو متقی ہیں راہ نمائی کرے۔ متقی کسے کہتے ہیں: آگے کی دو آیتوں میں اس کا بیان ہے۔ ہمارے ذہنوں میں متقی کا ایک خاص مفہوم بیٹھ گیا ہے، جب ہم لفظ متقی سنتے ہیں تو وہی مفہوم ذہن میں آتا ہے یعنی دودھ کا دُھلا ہوا، اعلیٰ درجہ کا پرہیزگار! مگر یہاں کیا مراد ہے؟ اس کو قرآن خود بیان کرتا ہے: ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾: یہاں تک متقی کا بیان ہے۔ میں اس آیت کے سب اجزاء کو سمجھاؤں گا تو بات لمبی ہو جائے گی، اور آج بات لمبی کرنے کا ارادہ نہیں۔ آپ حضرات تھکے ہوئے ہیں، پہلی تراویح میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ تھک جاتے ہیں۔

مکتبہ حجاز دیوبند

متقی کون ہے؟

ہر سچا پکا مسلمان متقی ہے یعنی جو منافق نہیں وہ متقی ہے۔ وہ متقی کیسے ہو گیا؟ ہو سکتا ہے وہ برائیاں کرتا ہو، اور کچھ ضروری اعمال نہ کرتا ہو۔ جواب یہ ہے کہ وہ مایؤُل (آئندہ کے حالات) کے اعتبار سے متقی ہے۔ اگر آج برا ہے مگر ایمان میں کھرا ہے، اور لائن پر لگا ہوا ہے تو ایک نہ ایک دن وہ متقی ہو جائے گا، مگر وہ متقی کب ہوگا؟ جب قرآن سے راہ نمائی حاصل کرے، قرآن کو سامنے رکھ کر اس کے احکام پر چلے تو وہ ایک نہ ایک دن متقی ہو جائے گا، اور اگر قرآن سے اس نے روشنی حاصل نہیں کی تو پھر وہ اندھیریوں میں بھٹکتا پھرے گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم طالب علم کو ''مولوی'' کہتے ہیں، کیونکہ وہ آگے چل کر مولوی بننے والا ہے، مگر مولوی کب بنے گا؟ جب وہ محنت سے پڑھے گا، ورنہ موالی (یار دوست) بنے گا۔ غرض آیت میں متقی سے فی الحال متقی مراد نہیں، آگے چل کر جو متقی بنے گا وہ بھی مراد ہے، پس یہ آیت ہمارے لئے بھی ہے، ہم بھی اگر متقی بننا چاہتے ہیں تو قرآن کو سامنے رکھ کر متقی بن سکتے ہیں۔

ماہِ رمضان کے روزے کیوں فرض ہیں؟

سورۂ بقرہ کی آیت (۱۸۳) میں روزوں کا مقصد تقوی بیان کیا گیا ہے، ارشادِ پاک ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾: اے ایمان والو! تم پر (بھی) روزے فرض کئے گئے، جس طرح تم سے پہلے والی امتوں پر روزے فرض کئے گئے تھے تاکہ تم (روزوں کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ، تقوی مؤمن کی آخری آرزو ہے، اور روزوں سے نفس کا گھوڑا قابو میں آتا ہے، پھر وہ گھوڑا قرآن کی ہدایت پر چلے گا تو ضرور منزل مقصود تک پہنچے گا۔

یہ تو متقی کے وہ معنی ہیں جس میں کوئی اشکال نہیں۔ اس کو بالقوہ متقی کہتے ہیں، یعنی جس میں پرہیز گاری کی صلاحیت ہے، اور یہ صلاحیت ہر سچے پکے مسلمان میں ہے، اور ایسا ہی شخص قرآن سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس لئے اس کی تخصیص کر کے فرمایا: ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ﴾: یہ قرآن متقیوں کے لئے راہ نما ہے۔ ورنہ قرآن تو سبھی انسانوں کے لئے راہ نما ہے، سورۃ البقرۃ (آیت ۱۸۵) میں صراحت ہے: ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾ قرآن سب انسانوں کے لئے راہ نما کتاب ہے۔ البتہ اس صورت میں ذرا سا سوال باقی رہے گا کہ جب قرآن سب لوگوں کے لئے راہ نما ہے تو اس آیت میں متقیوں کی تخصیص کیوں کی؟ یعنی جن میں پرہیزگار بننے کی صلاحیت ہے انہیں کو خاص کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہی لوگ حقیقت میں قرآن کی راہنمائی سے فائدہ اٹھائیں گے، اس لئے ان کو خاص کیا۔

لیکن اگر متقی سے باکمال لوگ مراد لئے جائیں یعنی بالفعل متقی مراد لئے جائیں تو پھر تخصیص کی وجہ یہ ہوگی کہ یہ مقام تعریف ہے اور ایسے موقع پر اہم چیز بیان کی جاتی ہے۔ جیسے ملک کے صدر کو سپاس نامہ دیا جائے تو ملک کی اہم چیزیں سپاس نامے میں لکھی جاتی ہیں۔ اور جب ملک کی تاریخ لکھیں گے تو سبھی چیزیں بیان کریں گے، اسی طرح قرآن کے شروع میں چونکہ قرآن کی تعریف کی جارہی ہے اس لئے متقیوں کی تخصیص کی کہ بڑے لوگ بھی قرآن کی ہدایت کے محتاج ہیں، انبیاء اور اولیاء بھی اس کی راہ نمائی کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتے، پس بہ دیگراں چہ رسد! اور آگے چونکہ اظہار حقیقت کا موقع تھا اس لئے

وہاں فرمایا کہ قرآن سب لوگوں کے لئے راہ نما کتاب ہے۔

رمضان میں قرآنِ کریم سے تعلق بڑھاؤ

آج ہی امام صاحب نے فرضوں میں یہ آیتِ کریمہ پڑھی ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ﴾ رمضان کے روزے اللہ نے کیوں لازم کئے ہیں؟ رمضان کے روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ اس ماہ میں قرآنِ کریم اتارا گیا ہے۔ کسی خاص دن میں کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے تو اس دن کو یادگار بنایا جاتا ہے۔ اس مبارک مہینے میں بھی نزولِ قرآن کا واقعہ پیش آیا ہے، اس لئے نزولِ قرآن کی وجہ سے اس ماہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی ہے، اور رمضان کے روزے اور رات میں نوافل رکھے گئے ہیں تا کہ قرآن کا حق ادا ہو، اس لئے اس مبارک مہینے میں مؤمن کا قرآنِ کریم سے تعلق بے حد بڑھ جانا چاہئے۔

عربوں اور عجمیوں میں فرق

عربوں میں اور ہم عجمیوں میں کئی فرق ہیں: وہ نفلیں کم پڑھتے ہیں، مگر فرض سولی پر بھی پڑھتے ہیں۔ یہ ان کی خوبی ہے، اور ہم نفلیں خوب پڑھتے ہیں مگر فرض جانے دیتے ہیں، وہ فرض کبھی نہیں جانے دیتے، جب فرض کا وقت آتا ہے تو فوراً مصلیٰ بچھاتے ہیں اور فرض ادا کرتے ہیں، یہ ان کی خوبی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اگر پانچ منٹ بھی نماز میں دیر ہوتی ہے تو وہ فوراً قرآن اٹھاتے ہیں اور تلاوت شروع کر دیتے ہیں۔ آپ حرم شریف میں جا کر دیکھیں: جو عرب ہوگا وہ اگر نماز شروع ہونے میں پانچ منٹ بھی باقی ہونگے تو فوراً قرآن اٹھائے گا اور تلاوت شروع کر دے گا۔ ہمارے اندر بڑی کمی ہے، پندرہ منٹ نماز میں باقی ہوتے ہیں تو ہم یا تو اونگھتے رہتے ہیں یا باتیں کرتے ہیں، قرآن کوئی نہیں پڑھتا۔ یہ ہمارے اندر کمی ہے، کیا قرآن صرف عربوں کے لئے آیا ہے؟ نہیں، ہمارے لئے بھی آیا ہے، کیا وہی صرف مسلمان ہیں؟ نہیں ہم بھی مسلمان ہیں، پھر ہمارا قرآنِ کریم سے تعلق کمزور کیوں ہے؟ ہم

مکتبہ حجاز دیوبند

بھی مسلمان ہیں، قرآنِ کریم ہماری ہدایت کے لئے بھی آیا ہے، بلکہ عرب کم محتاج ہیں، ہم زیادہ محتاج ہیں، ہم عربی نہیں جانتے، ہمیں ڈبل محنت کرنی پڑے گی، تب ہم قرآنِ کریم سمجھیں گے۔

میرے بھائیو! کہنا یہ ہے کہ اس مبارک مہینے میں ہر شخص زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھے، جس کو پانچ منٹ کا وقت بھی مل جائے فوراً قرآن اٹھائے اور پڑھنا شروع کردے، سمجھنے کی بھی کوشش کرے، لیکن اگر صرف الفاظ پڑھے تب بھی اس کا ثواب ملے گا۔

قرآن کا ایک ادب:

قرآن کی طرف پیٹھ نہیں کرنی چاہئے، جو پیچھے (دوسری صف میں) بیٹھا ہے وہ اگلے کی پشت کی طرف قرآن نہ رکھے بلکہ اس طرح بیٹھے کہ آگے جو دو بیٹھے ہیں ان کے بیچ کے مقابل قرآن رکھ کر پڑھے تو قرآن کی بے ادبی نہیں ہوگی۔

﴿وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمين﴾

۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث اور سنت میں فرق

مسائل میں ہر حدیث حجت نہیں

وہ حدیث حجت ہے جو سنت (معمول بہا) ہے

[یہ دو تقریریں ایک ساتھ مرتب کی گئی ہیں، پہلی تقریر ٹورنٹو (کناڈا) کی 'مدینہ مسجد' میں کی گئی ہے اور دوسری مسجد دار السلام میں]

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ أَدْعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ﴾ وقال النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ، لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ.

بزرگو اور بھائیو! آج آپ کو ایک مسئلہ سمجھانا ہے، تقریریں تو آپ رمضان بھر سنتے رہے ہیں! مسئلہ یہ ہے کہ حدیث اور سنت میں کیا فرق ہے؟ ایک فرقہ خود کو اہلِ قرآن کہتا ہے، دوسرا خود کو اہل حدیث کہتا ہے، اور ہم خود کو اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں۔ پس قرآن اور حدیث میں کیا فرق ہے؟ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے، لیکن حدیث اور سنت میں کیا فرق ہے؟ یہ فرق لوگ نہیں جانتے، بلکہ لوگوں میں غلط فہمی ہے یا غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ حدیث اور سنت ایک ہیں، حالانکہ ایسا نہیں، اس لئے یہ اہم مضمون آج سمجھانا ہے۔

حدیث اور سنت میں فرق:

حدیث اور سنت دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا تو نہیں ہیں، یعنی دونوں میں تباین کی نسبت نہیں ہے، مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ دونوں میں تساوی کی نسبت ہو، بلکہ حدیث اور سنت میں عموم وخصوص من وجہٍ کی نسبت ہے، اور جہاں یہ نسبت ہوتی ہے وہاں دو چیزیں کبھی

الگ الگ ہوجاتی ہیں، اور کبھی اکٹھا ہوجاتی ہیں، جیسے سفید اور جانور میں یہی نسبت ہے، اس لئے کبھی دونوں اکٹھا ہونگے، اور کبھی الگ، سفید کپڑا: سفید ہے، مگر جانور نہیں، کالی بھینس: جانور ہے، مگر سفید نہیں، اور سفید بیل: سفید بھی ہے اور جانور بھی، حدیث اور سنت کے درمیان بھی یہی نسبت ہے، اس لئے کبھی حدیث الگ ہوجاتی ہے، وہ سنت نہیں ہوتی، اور کبھی سنت الگ ہوجاتی ہے، وہ حدیث نہیں ہوتی، اور کبھی دونوں جمع ہوجاتے ہیں، وہ حدیث بھی ہوتی ہے اور سنت بھی۔

حدیث کی تعریف:

حدیث: چار چیزوں کا نام ہے:

۱- نبی پاک ﷺ نے زندگی میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے: وہ سب حدیث ہے۔

۲- آپؐ نے زندگی میں جو بھی کام کیا ہے: وہ حدیث ہے۔

۳- آپ ﷺ نے جن باتوں کو برقرار رکھا ہے: وہ بھی حدیث ہے۔ یعنی کسی مسلمان نے کوئی کام کیا، نبی پاک ﷺ نے اس کو دیکھا، یا وہ آپؐ کے علم میں آیا اور آپؐ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی بلکہ اس کو برقرار رکھا، اس کی تائید فرمائی تو یہ بھی حدیث ہے۔

۴- نبی پاک ﷺ کی صفات یعنی ذاتی حالات بھی حدیث ہیں۔

ان چار چیزوں کا نام حدیث ہے۔ اب ہر ایک کی مثال لیں:

قولی حدیث کی مثال:

بخاری کی پہلی حدیث ہے: **إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ**: عمل کا نیت سے موازنہ کیا ہوا ہے، عمل نیت کے موافق ہوتا ہے، عبادت کی نیت ہے تو ثواب ملے گا، اور عبادت کی نیت نہیں ہے تو وہ محض عمل ہے، اس پر ثواب کچھ نہیں ملے گا۔

حدیث کا تعلق عبادات سے ہے:

یہاں کچھ لوگ پوچھتے ہیں: ایک شخص اس لئے چوری کرتا ہے کہ وہ غریبوں کی مدد کرے، یا لوگ پوچھتے ہیں کہ پیسہ گھر میں تو رکھا نہیں جاسکتا، بینک میں رکھنا ضروری ہے،

پس اگر کوئی بینک میں کھاتہ کھلواتا ہے اور کرنٹ اکاونٹ کے بجائے سیونگ اکاونٹ کھلواتا ہے تاکہ جو بینک سے انٹرسٹ ملے اس کو ثواب کی نیت کے بغیر غریبوں کو دیدے تو یہ اچھی نیتیں ہیں۔ اور حدیث میں ہے: **إنما الأعمال بالنية**: اعمال نیت کے موافق ہوتے ہیں، پس یہ جو بینک سے سود لے کر غریبوں کو دے رہا ہے یا غریبوں کی مدد کی نیت سے چوری کر رہا ہے: اس کو ثواب ملنا چاہئے، اور یہ کام جائز ہونے چاہئیں؟

میں اُسے جواب دیتا ہوں کہ غریبوں کے لئے آپ کو دبلا ہونے کی ضرورت نہیں، غریبوں کے خدا آپ نہیں، غریبوں کا خدا کوئی اور ہے، اور وہی ان کا رازق ہے۔

اور مذکورہ حدیث کا دائرہ عبادات تک ہے، معاصی اس کے دائرہ میں نہیں۔ عبادات میں اگر عبادت کی نیت ہے تو ثواب ملے گا اور اگر عبادت کی نیت نہیں ہے تو ثواب نہیں ملے گا۔

اور حدیث کا دائرہ عبادات تک ہے: اس کی دلیل اگلا جملہ ہے: وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِأٍ مَّا نَوىٰ: ہر انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے، مگر ابھی بات کلیر (واضح) نہیں ہوئی، اس لئے نبی ﷺ نے ہجرت کی مثال دے کر مضمون واضح فرمایا:

ہجرت دور اول میں فرض تھی، اور بہت بڑی عبادت تھی، قرآن وحدیث میں اس کے بے شمار فضائل آئے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: تین بندے ہجرت کرتے ہیں، وطن چھوڑ کر مدینہ آتے ہیں:

ایک کیوں آیا ہے؟ اس لئے کہ وہ سچے دل سے مسلمان ہوا ہے، اور اسلام کا درخت ابھی نونہال ہے، اس کی آبیاری کی ضرورت ہے، اس لئے وہ مدینہ آیا ہے تاکہ دعوت وجہاد میں شریک ہو، دین سیکھے، اور ہر طرح دین کی خدمت کرے۔

دوسرا کیوں آیا ہے؟ وہ اس لئے آیا ہے کہ اس کی گاؤں میں پرچون کی دوکان تھی، اب گاؤں کے لوگ مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مدینہ جا رہے ہیں، اور گاؤں کی آبادی گھٹ رہی ہے، اس لئے دوکان پھیکی پڑ رہی ہے، اس لئے اس نے سوچا کہ مدینہ منورہ کی آبادی بڑھ رہی ہے، پس میں مدینہ چلا جاؤں اور وہاں دوکان کھولوں تو دوکان خوب چلے گی۔ چنانچہ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلا آیا۔

اور تیسرا کیوں آیا ہے؟ وہ ایک خاص عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے، مگر وہ عورت ہجرت کر کے مدینہ جا چکی ہے، اب وہ سوچتا ہے کہ اگر میں وطن میں رہا تو نکاح نہیں ہوسکتا، چلو میں بھی مدینہ پہنچ جاؤں، اور اس عورت سے راہ و رسم پیدا کروں اور نکاح کرلوں، چنانچہ وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گیا۔

نبی ﷺ نے فرمایا: پہلا شخص جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہجرت کی ہے اس کی ہجرت مقبول ہے اور دینی عمل ہے، قرآن وحدیث میں اسی کے فضائل آئے ہیں، اور دوسرے اور تیسرے بندوں کو ہجرت کا کوئی ثواب نہیں ملے گا، ان کی ہجرت دینی عمل نہیں ہے۔

پس اگر حدیث کا سیاق پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حدیث کا دائرہ عبادات تک ہے، معاصی اس کے دائرے میں نہیں۔

فعلی حدیث کی مثال:

جب مسجدِ نبوی میں منبر رکھا گیا تو نبی ﷺ نے منبر پر چڑھ کر نماز پڑھائی، سجدہ نیچے کر کے اگلی رکعت میں منبر پر چڑھ جاتے تھے، پھر سلام پھیرنے کے بعد ارشاد فرمایا: صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ أُصَلِّیْ: آپ لوگوں نے جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، اسی طرح نماز پڑھو۔ یہ جو آپؐ نے نماز پڑھ کر دکھائی ہے، یہ فعلی حدیث ہے۔

تقریرِ نبوی کی مثال:

مکہ میں تو پتھروں کے علاوہ کچھ نہیں، البتہ اسّی کلو میٹر پر طائف ہے، وہاں کھیت ہیں، باغات ہیں، اور ساڑھے چار سو کلو میٹر پر مدینہ منورہ ہے، وہاں بھی باغات اور کھیت ہیں۔ جب نبی ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو مدینہ میں بیع سلم (بدھنی بیع) کا رواج تھا۔ ابھی کھجور پر پھول بھی نہیں آئے ہوتے تھے کہ کھجوریں بیچ دیتے تھے، بھاؤ طے ہوجاتا تھا، مدت طے ہوجاتی تھی، قیمت تاجر اسی وقت دیدیتا تھا، اور باغ والا وقتِ مقررہ پر کھجوریں دیتا تھا، اس کو بیع سلم کہتے ہیں۔ شریعت کے اصول سے یہ بیع صحیح نہیں، کیونکہ مبیع کا وجود نہیں، جبکہ صحتِ بیع کے لئے مبیع کا وجود ضروری ہے، اور مبیع: بائع کی ملکیت میں اور بائع

کے قبضہ میں ہونا بھی ضروری ہے، نیز اس کا مقدور التسلیم ہونا بھی ضروری ہے، جبھی بیع درست ہوگی، ورنہ نہیں۔ اور کھجوروں کی بیع سلم میں ابھی درختوں پر پھول بھی نہیں آئے، جب کھجوروں کا وجود ہی نہیں تو ملکیت کا کیا سوال؟ اور جب ملکیت نہیں تو قبضہ کا کیا سوال؟ اس لئے شریعت کی اصول سے یہ بیع باطل ہے۔

جب نبی ﷺ کے علم میں یہ بیع آئی تو آپؐ نے صحابہ کو اس بیع سے منع نہیں کیا، بلکہ فرمایا: مَنْ أَسْلَمَ مِنكُمْ فَلْيُسْلِمْ فِیْ كَيْلٍ مَّعْلُوْمٍ أَوْ وَزْنٍ مَّعْلُوْمٍ إِلٰی أَجَلٍ مَّعْلُوْمٍ: جب تم سلم کرو تو تمام تفصیلات طے کرلو، پیمانہ یا وزن طے کرلو اور مدت بھی طے کرلو تاکہ آئندہ کوئی نزاع نہ ہو، غرض: حضورؐ نے شرائط تو بڑھائیں، مگر سلم سے منع نہیں کیا۔ پس یہ حدیث بن گئی، اور اس کا نام تقریری حدیث ہے۔

بیع سلم کے جواز کی حکمت:

جب اسلام کے اصول سے بیع سلم صحیح نہیں: تو پھر حضورؐ نے اس کو کیوں برقرار رکھا اس کا جواب یہ ہے کہ بیع سلم میں اگرچہ بائع کے پاس مبیع نہیں ہوتی، مگر مارکیٹ میں ہوتی ہے، پس جب مارکیٹ میں مبیع موجود ہے تو اگر اس کے باغ میں مبیع (کھجوریں) نہ بھی پیدا ہوگی تو وہ مقررہ وقت پر مارکیٹ سے خرید کر دیدے گا۔ چنانچہ خاص جگہ کی پیداوار کی سلم میں شرط لگانا درست نہیں، غرض مارکیٹ میں مبیع کے وجود کو بائع کی ملکیت میں موجود مان لیا گیا ہے، اور یہ ایک طرح کا حیلہ ہے۔

اور یہ حیلہ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ اس میں عظیم فائدہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی سرمایے کے بغیر بڑے سے بڑا کاروبار کھڑا کرسکتا ہے۔

مثال کے طور پر: ایک شخص کو بنیان بنانے کا کارخانہ قائم کرنا ہے، اس کے لئے لاکھوں روپیوں کی مشینوں کی ضرورت ہوگی، مگر سرمایہ اس کے پاس نہیں ہے، البتہ لوگوں میں اس کا اعتبار ہے، اس نے دوکانداروں سے معاملہ کیا، اس نمبر کا سوت، یہ سائز وغیرہ تمام تفصیلات طے کیں اور قیمت بھی طے کی اور کہا: چھ مہینے کے بعد سپلائی کروں گا اور ہر مہینہ ایک ہزار پیس دوں گا۔ چنانچہ کسی نے دس ہزار پیس خریدے، کسی نے پچاس ہزار، اور اس نے سب سے

پیسے اسی وقت لے لئے، سلم میں ثمن مجلس عقد ہی میں دینا ہوتا ہے۔ پندرہ لاکھ جمع ہو گئے۔ وہ مشینیں لایا، کارخانہ کھڑا کیا اور پروڈکشن شروع ہو گیا، اور مقررہ وقت پر سپلائی شروع کر دی۔ سال دو سال میں سب کے پاس مال پہنچ گیا اور اس کا کارخانہ فری ہو گیا۔ یہ بیع سلم کا فائدہ ہے۔ اس لئے شریعت نے اس کو برقرار رکھا ہے، اور آج مشینی دور میں بے شمار چیزوں کا سلم ہوسکتا ہے، ہر وہ چیز جس کی جملہ تفصیلات طے ہوسکتی ہوں، اور اس کا مارکیٹ میں وجود ہو: اس کی بیع سلم درست ہے۔

اوصاف نبوی کی مثال:

نبی پاک ﷺ کے ذاتی حالات اوصاف کہلاتے ہیں، مثلاً: آپؐ کے بال ایسے تھے: نہ بالکل سیدھے تھے، نہ بالکل گھونگھریالے، درمیانی کیفیت لئے ہوئے تھے، سیدھے تھے، مگر کچھ گھونگھریالا پن تھا، دندانِ مبارک ایسے تھے: سامنے کے اوپر کے دانتوں میں ذرا کشادگی تھی، جب آپؐ گفتگو فرماتے تو ان کے درمیان سے ایک نور سا نکلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ سب حدیثیں ہیں۔

سنت کے معنی:

سُنَّة: کے لغوی معنی ہیں: راستہ (الطریق) اور یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے، احادیث میں بھی آیا ہے اور فقہ میں بھی، اور تینوں جگہ معنی الگ الگ ہیں، قرآن میں ہے: ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً﴾: تم اللہ کی سنت کو بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے۔ اور حدیث میں ہے: تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ: میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں: لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: جب تک تم ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو گے: ہرگز گمراہ نہیں ہوؤ گے، وہ دو چیزیں کیا ہیں: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ: اللہ کی کتاب اور میرا طریقہ۔ اور فقہ میں: سنت مؤکدہ اور سنتِ غیر مؤکدہ کی اصطلاحیں ہیں۔ غرض تینوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اور تینوں جگہ معنی الگ الگ ہیں۔

فقہ میں سنت: احکام کا ایک درجہ ہے، واجب سے نیچے اور مندوب سے اوپر: ماکان

مکتبہ حجاز دیوبند

فی مشروعیته دون الواجب وفوق المندوب پھر فقہاء نے اس کی دو قسمیں کی ہیں: سنت مؤکدہ اور غیر مؤکدہ۔

قرآنِ کریم میں سنت کے معنی ہیں: اشیائے عالم میں رکھی ہوئی صلاحیتوں پر مسببات کا متفرع ہونا۔ اس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ ایک پورا باب اسی کے لئے قائم کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب میں صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، چنانچہ اسباب سے مسببات پیدا ہوتے ہیں، یہی اللہ کی سنت ہے، جیسے کھجور کی گٹھلی بوئیں گے تو خاص قسم کے پتے نکلیں گے خاص طرح کے پھول آئیں گے، خاص طرح کے پھل آئیں گے، یہی سنت الٰہی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کھجور کی گٹھلی بوئیں اور گیہوں کا پودا نکلے، اللہ سب کچھ کر سکتے ہیں، مگر اللہ نے صلاحیت ایسی ہی ودیعت فرمائی ہے۔ آپ املی کی گٹھلی بوئیں: املی ہی کا درخت اُگے گا یہ اللہ کی سنت ہے اور اللہ کی یہ سنت بدلتی نہیں ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾: اللہ نے جس چیز میں جو صلاحیت رکھی ہے وہی صلاحیت بروئے کار آتی ہے۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ اللہ نے آگ میں جلانے کی صلاحیت رکھی ہے، مگر آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہیں جلایا!

جواب: یہ ہے کہ یہ خرقِ عادت ہے، اللہ تعالیٰ اسباب کی صلاحیت کے خلاف بھی کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسباب: اسباب ہیں، خدا نہیں، خدا ان کے اوپر ہے، اور اسباب کی لگام خدا کے ہاتھ میں ہے، جب تک وہ چاہیں گے اسباب کام کریں گے اور جب وہ نہیں چاہیں گے آگ نہیں جلائے گی۔

غرض: اللہ نے کائنات کی چیزوں میں جو صلاحیتیں امانت رکھی ہیں، اور ان صلاحیتوں سے جو مسببات وجود میں آتے ہیں: اس کا نام قرآن میں سنت اللہ ہے۔

اور حدیث میں سنت: کے معنی ہیں: الطریقة المسلوکة فی الدین: یعنی دینی راہ، وہ راستہ جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾: کہئے: یہ میرا راستہ ہے، میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میرا راستہ: یعنی حضور

ﷺ کا راستہ۔ اسی کے لئے حدیثوں میں لفظ سنت آیا ہے، یہ حدیثیں آگے آرہی ہیں۔

نسخ شریعتوں میں ہوتا ہے، دین میں نہیں ہوتا

اور نسخ شریعتوں میں ہوتا ہے، بعد کی شریعت سابقہ شریعت کو منسوخ کرتی ہے، البتہ دین تمام نبیوں کا ایک ہے، کیونکہ دین عقائد کا نام ہے اور عقائد بدلتے نہیں، اللہ ایک ہیں: ہیں، اللہ صفاتِ کمالیہ کے ساتھ متصف ہیں: ہیں، اللہ نقائص سے پاک ہیں: ہیں۔ ان میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ ملائکہ واقعی مخلوق ہیں، قیامت آنی ہے، مر کر دوبارہ زندہ ہونا ہے: یہ سب عقائد ہیں، جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، اس لئے قرآن میں ہے: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾: آدم علیہ السلام سے خاتم النّبیین ﷺ تک دین ایک ہے، یہی دین ہمیشہ نازل ہوا ہے، اسی پر جینا ہے اور اسی کو لے کر آخرت میں جانا ہے۔

لیکن شریعتیں مختلف رہی ہیں، کیونکہ ان میں قوموں کے حالات کا لحاظ کیا گیا ہے، جیسے آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا، کیونکہ اس وقت بہن کے علاوہ اور کوئی عورت نہیں تھی، پس اگر بہن سے نکاح جائز نہیں ہوگا تو نسلِ انسانی کیسے چلے گی؟ پھر جب عورتیں بہت ہوگئیں تو نوح علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح حرام کردیا گیا۔

بہرحال شریعتوں میں چونکہ زمانے اور لوگوں کے احوال کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے شریعتوں میں نسخ ہوا ہے، آدم علیہ السلام کی شریعت نوح علیہ السلام کی شریعت سے منسوخ ہوئی، پھر نوح علیہ السلام کی شریعت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت سے منسوخ ہوئی، پھر اُن کی شریعت موسیٰؑ کی شریعت سے منسوخ ہوئی، پھر ان کی شریعت عیسیٰؑ کی شریعت سے منسوخ ہوئی، آخر میں ہمارے نبی ﷺ کی شریعت سے باقی تمام شریعتیں منسوخ ہوئیں۔

شریعت کے اندر بھی نسخ ہوتا ہے:

اور شریعت کے اندر بھی نسخ ہوتا ہے، یعنی پہلے ایک حکم آتا ہے پھر وہ حکم بدل جاتا ہے، اور دوسرا حکم آتا ہے۔ ایسا نسخ ہماری شریعت میں بھی ہوا ہے، اور اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی آیت ہے: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا﴾: ہم ایک حکم ہٹا کر دوسرا حکم جو بھیجتے ہیں تو وہ دوسرا حکم پہلے حکم کے مانند ہوتا ہے یا اس سے بہتر ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآنِ کریم میں بھی نسخ ہوا ہے اور حدیثوں میں بھی نسخ ہوا ہے۔

سوال: شریعت میں نسخ کیوں ہوتا ہے؟

جواب: ایک مریض حکیم کے پاس جاتا ہے، اور کہتا ہے: مجھے یہ ہو رہا ہے۔ حکیم نسخہ لکھتا ہے اور کہتا ہے: پندرہ دن یہ نسخہ پی کر آؤ۔ دوبارہ آیا، نبض دیکھی، احوال پوچھے، نسخہ نے ٹھیک کام کیا ہے، مگر حکیم نسخہ بدل دیتا ہے، دوسرا نسخہ لکھتا ہے اور کہتا ہے: جاؤ یہ پندرہ دن پی کر آؤ، اس نے پیا اور تیسری مرتبہ آیا، احوال بتائے، نبض دکھائی، اِس نسخہ نے بھی ٹھیک کام کیا ہے، مگر حکیم وہ نسخہ چھوڑ کر تیسرا نسخہ لکھتا ہے، اور کہتا ہے: اب یہ نسخہ شفا ہونے تک پیتے رہو۔

اب کوئی کہے کہ حکیم پاگل ہے! پہلے ہی سے یہ آخری نسخہ کیوں نہیں لکھا! حکیم پاگل نہیں، جنابِ عالی پاگل ہیں، حکیم نے پہلا نسخہ مُنْضِج لکھا تھا یعنی جسم کے اندر جو فاسد مواد تھا اس کو پکایا، پھر دوسرا نسخہ مسہل لکھا، اب دست آئے اور فاسد مادہ نکل گیا، پھر تیسرا نسخہ بیماری کا علاج لکھا، اب اس کو پینے سے شفا ہوگی، جب تک فاسد مادے کو نکالیں گے نہیں یہ تیسرا نسخہ کام نہیں کرے گا۔

مکتبہ حجازیہ دیوبند

دوسری مثال: آپ تانبے کا برتن لے کر قلعی گر کے پاس جاتے ہیں، وہ پہلے برتن کو بھٹی پر رکھتا ہے، اس میں پانی ڈالتا ہے، پانی میں تیزاب ڈالتا ہے، اور چمٹے سے روئی پکڑ کر برتن کو صاف کرتا ہے، پھر اس کو سکھاتا ہے، پھر دوسرے وقت برتن کو آگ پر رکھتا ہے، جب وہ گرم ہو جاتا ہے تو دو چار جگہ قلعی لگا کر، نوشادر بسی ہوئی روئی پھیرتا ہے تو برتن چمک جاتا ہے۔ اگر قلعی گر برتن کے میل کو چھڑائے بغیر قلعی کرے تو قلعی نہیں کھلے گی۔

یہ مثالیں ہیں، اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح احکام بھیجتے ہیں، جیسے شراب چار مرحلوں میں حرام کی ہے۔

شراب چار مرحلوں میں حرام ہوئی ہے:

پہلے مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی آیت اتاری کہ اس نے لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا۔ سورۂ نحل میں آیت ہے: ﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالأَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا﴾: انگوروں اور کھجوروں کے پھلوں سے تم سَکر بناتے ہو، سَکر: کھجور کی شراب کو کہتے

ہیں، اور رزق حسن بناتے ہو، اور انگور سے جو شراب بنتی ہے، جس کو عربی میں خمر کہتے ہیں، اس کا تذکرہ چھوڑ دیا، خمر کا تذکرہ کیوں چھوڑ دیا؟ اس نے صحابہ کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا کیا، اور انھوں نے اس سلسلہ میں سوال کیا تو ایک عرصہ کے بعد دوسری آیت نازل ہوئی: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، قُلْ فِيْهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾: لوگ آپؐ سے خمر اور سٹے کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ آپؐ ان سے کہیں: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کئی فائدے ہیں، اگر ان میں کوئی فائدہ نہ ہوتا تو لوگ سٹّہ کیوں کھیلتے اور شراب کیوں پیتے! لیکن دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے: ﴿وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾: اور دونوں میں جو خرابی ہے وہ ان کے فائدوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس سے ذہن بنا کہ خرابی اگرچہ ایک ہے، لیکن وہ سو فائدوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ سنار کی سو اور لوہار کی ایک والی بات ہے۔

یہ ذہن بنانے کے بعد تیسری آیت نازل کی کہ نماز کے اوقات میں شراب نہ پیئو، دوسرے اوقات میں پی سکتے ہو: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَقْرَبُوْا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ﴾: نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ، جب نشہ اتر جائے اور تم جو کچھ منہ سے بول رہے ہو اس کو سمجھنے لگو تب نماز پڑھو۔

اب ظہر سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے شراب بند کرنی پڑے گی، ظہر کے بعد بھی نہیں پی سکتے، کیونکہ آگے عصر آ رہی ہے، عصر کے بعد بھی نہیں پی سکتے، اس لئے کہ آگے مغرب آ رہی ہے، مغرب کے بعد بھی نہیں پی سکتے، اس لئے کہ آگے عشاء آ رہی ہے۔ اب پینے کے دو ہی وقت بچے، ایک: عشاء کے بعد فجر سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تک۔ مگر رات میں کون پیتا ہے؟ اور رات میں اٹھ کر بھی کون پیتا ہے؟ دوسرا وقت ہے: فجر کی نماز کے بعد سے ظہر سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تک۔ لیکن اس وقت اگر کوئی پیئے گا تو جوب (کام) اور شوپ (دوکان) پر کون جائے گا؟ یہ تو کمائی کا وقت ہے، اس وقت میں اگر پی کر پڑ جائے گا تو کام کیسے چلے گا؟ لیکن پھر بھی ان دو وقتوں میں پینے کی گنجائش رہی، گویا چوبیس گھنٹوں میں سے آدھا وقت کاٹ دیا۔

ایک عرصے تک اسی طرح چلتا رہا پھر آخری حکم آیا: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! خمر اور

سٹہ دونوں گندگیاں ہیں، اور شیطانی چرخہ ہیں، شیطان ان کے ذریعہ تمہیں اپنے چکر میں پھنساتا ہے، پس تم ان دونوں سے بچو تاکہ تم کامیاب ہوو: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾: چار چیزیں شیطانی چرخہ ہیں: خمر (انگوری شراب) جوا، بت اور فال کے تیر، ان سے بچو، اگر کامیابی چاہتے ہو۔ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضور ﷺ نے صحابہ کو سنائی تو لوگوں نے شراب نالیوں میں بہادی، گھروں میں شراب کا ایک قطرہ بھی نہ رہا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر اللہ تعالیٰ پہلے ہی مرحلہ میں یہ آخری آیت نازل فرماتے تو لوگ کہتے: ہم اس پر عمل نہیں کرسکتے! اس لئے ذہن سازی کر کے حرمت کا حکم نازل کیا، چنانچہ لوگوں کے لئے عمل کرنا آسان ہوگیا، اور انھوں نے مٹکے اٹھا کر پھینک دیئے۔ مجھے بتلانا یہ ہے کہ ایک شریعت کے اندر بھی نسخ ہوتا ہے، بعض احکام بالکل اٹھا دیئے جاتے ہیں، اور بعض احکام میں تبدیلی کردی جاتی ہے۔

قرآنِ کریم میں کوئی ایسی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو:

قرآنِ کریم میں سے جو آیتیں مکمل طور پر منسوخ کردی گئی ہیں: وہ اللہ نے اٹھالی ہیں، یا بھلادی ہیں۔ نسخ کی دو شکلیں ہوتی تھیں: ایک: اللہ تعالیٰ منسوخ آیت اٹھالیتے تھے، دوسری: منسوخ آیت بھلادیتے تھے، حضور اور صحابہ سب اس کو بھول جاتے تھے ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾: ہم آپؐ کو قرآن پڑھائیں گے، آپؐ اس کا کوئی حرف بھولیں گے نہیں، مگر جس کو منسوخ کرنا ہوتا ہے اس کو اللہ بھلادیتے ہیں۔

آج جو قرآن موجود ہے اس میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو، ہاں ایسی آیات ہیں جو بعض احوال میں معمول بہا ہیں، اور بعض احوال میں منسوخ۔ جیسے مؤلفۃ القلوب کے حصے والی آیت موجود ہے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو موقوف کردیا ہے، منسوخ نہیں کیا، چنانچہ اگر کبھی حالات خراب ہوجائیں، اور دورِ اول جیسے حالات پیدا ہوجائیں تو زمانے کا امیر المؤمنین اس کو پھر جاری کرسکتا ہے، البتہ مفتی صاحب جاری نہیں کرسکتے، مجتہد نہیں کرسکتا، زمانے کے امیر المؤمنین نے موقوف کیا ہے تو زمانے کا

امیر المؤمنین ہی اس کو جاری کر سکتا ہے۔

ایسی اور بھی آیتیں ہیں، جیسے قرآن میں ہے کہ جب موت کا وقت قریب آئے تو والدین کے لئے اور رشتہ داروں کے لئے وصیت کرو۔ اب یہ حکم نہیں ہے، کیونکہ میراث کے احکام اللہ نے نازل کر دیئے ہیں، مگر اب بھی ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ وصیت ضروری ہو جائے، جیسے کسی کو ڈر ہو کہ اس کے بعد بعض ورثاء سب ترکے پر قبضہ کر لیں گے، ماں باپ کو کچھ نہیں دیں گے، یا بعض بیٹے قبضہ کر لیں گے اور بعض کو کچھ نہیں دیں گے تو ایسی صورت میں شریعت کے احکام کے مطابق وصیت نامہ لکھ کر کورٹ میں رجسٹر کرانا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں اس آیت پر عمل ہوگا۔

بہر حال قرآنِ کریم میں تو ایسی کوئی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو، ایسی آیتیں یا تو اللہ نے اٹھا لی ہیں یا بھلا دی ہیں۔

حدیث کی کتابوں میں منسوخ حدیثیں بھی ہیں:

لیکن حدیثوں کی ایسی صورت نہیں ہے، پہلے دور کے جو احکام تھے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، اور بعد میں جو احکام آئے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں ہیں۔ پس پہلی قسم کی روایتیں صرف حدیث ہیں، سنت نہیں، اور دوسری قسم کی روایتیں حدیث بھی ہیں اور سنت بھی۔

وہ روایتیں جو صرف حدیث ہیں، سنت نہیں

پہلا مادۂ افتراقی: تین قسم کی روایتیں صرف حدیث ہیں، سنت نہیں:

ایک: وہ حدیثیں جو منسوخ ہیں، وہ سنت نہیں ہیں، مسلمانوں کو ان پر نہیں چلنا، بعد میں جو ناسخ احادیث آئی ہیں مسلمانوں کو ان پر چلنا ہے، جیسے حدیث ہے: تَوَضَّئُوْا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ: آگ پر پکی ہوئی چیز کھائی تو وضو ٹوٹ گئی، یہ اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیث ہے، مگر بعد میں یہ حکم نہیں رہا، بعد میں نبی ﷺ، خلفائے راشدین اور سب صحابہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھاتے تھے، اور وضو کئے بغیر نماز پڑھتے تھے، اس لئے حدیث. توضؤا ممامست النار سنت نہیں۔

دوسری مثال: پہلے نماز میں آپس میں باتیں کرتے تھے۔ پہلے طریقہ یہ تھا کہ مسبوق

اپنی چھوٹی ہوئی نماز پہلے پڑھتا تھا، پھر جماعت میں شامل ہوتا تھا۔ وہ آکر نمازی سے پوچھتا کہ کتنی رکعتیں ہوگئیں؟ وہ بتاتا کہ دو ہوگئیں، وہ تکبیر تحریمہ کہہ کر چھوٹی ہوئی رکعتیں پڑھ کر جماعت میں شامل ہوتا۔ ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ دیر سے آئے، ان کو یہ بات اچھی نہیں لگی کہ نبی ﷺ الگ نماز پڑھ رہے ہوں اور وہ اپنی چھوٹی ہوئی نماز پڑھیں۔ چنانچہ وہ نیت باندھ کر نماز میں شامل ہوگئے، جب حضور ﷺ نے سلام پھیرا تو وہ اپنی باقی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے، حضورؐ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور آپؐ نے حضرت معاذ کو نماز پڑھتے دیکھا، نماز کے بعد ان سے پوچھا، انھوں نے جواب دیا: یارسول اللہ! مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں آپؐ سے الگ نماز پڑھوں، اس لئے میں آپؐ کی نماز میں شامل ہوگیا، اور اب میں نے باقی نماز پوری کی، آپؐ نے فرمایا: إِنَّ مُعَاذًا سَنَّ لَكُمْ سُنَّةً فَاتَّبِعُوْهَا: معاذ نے تمہارے لئے ایک طریقہ رائج کیا ہے، پس تم اس طریقہ کی پیروی کرو، چنانچہ اس دن سے مسبوق کی نماز کا طریقہ بدل گیا۔

غرض: اسلام کے دورِ اول میں نماز میں اس قسم کی ضروری باتیں جائز تھیں، پھر بعد میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ﴾: کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب یہ آیت اتری تو: نُهِيْنَا عَنِ الْكَلَامِ، وَأُمِرْنَا بِالسُّكُوْتِ: ہمیں نماز میں کلام کرنے سے روک دیا گیا اور چپ رہنے کا حکم دیا گیا۔

غرض: اس دور کی یہ حدیثیں کہ نمازی نماز میں باتیں کرتے تھے: حدیثیں ہیں، اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، مگر وہ سنت نہیں ہیں، مگر اہل حدیث ان پر عمل کرتے ہیں حرم شریف میں آپ کو یہ منظر دیکھنے کو ملے گا کہ ایک عرب شیخ نماز پڑھ رہا ہوگا، موبائل کی گھنٹی بجے گی، وہ جیب سے موبائل نکالے گا، بٹن دبا کر نمبر دیکھے گا، پھر کہے گا: أنا فی الصلوة: میں نماز پڑھ رہا ہوں، پھر موبائل جیب میں رکھ لے گا اور نماز پڑھتا رہے گا اور اگر اس سے کچھ کہا جائے تو وہ یہ حدیث پیش کرے گا کہ صحابہ بھی نماز میں باتیں کرتے تھے: میں کیوں نہیں کرسکتا؟

بہرحال اس طرح کی حدیثیں منسوخ ہوگئی ہیں، مگر وہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، پس وہ سنت نہیں ہیں، سنت وہ حکم ہے جو بعد میں آیا ہے، اسی پر مسلمانوں کو چلنا ہے۔

بعد کا حکم کیا ہے؟ حضرت معاویہ بن حکم سُلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ نئے مسلمان ہوئے تھے اور آپؐ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، نماز میں کوئی چھینکا، اس نے اگرچہ الحمدللہ نہیں کہا تھا مگر حضرت معاویہؓ نے کہا: یرحمك الله! اللہ تجھ پر رحم کرے! ساتھ والے نے ران پر ہاتھ مارا، اُن کو غصہ آیا، اور کہا: میں اُس کو دعا دے رہا ہوں اور تو مجھے منع کررہا ہے! خیر نماز پوری ہوئی، نبی ﷺ نے ان کو بلا کر فرمایا: إِنَّ هٰذِهِ الصَّلٰوةَ لَايَصْلُحُ فِيهَا شَيْئٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ، إِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيْحُ وَالتَّكْبِيْرُ وَالتَّحْمِيْدُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآن: نماز میں لوگوں کی باتوں کی قطعاً گنجائش نہیں، نماز: قراءتِ قرآن، تسبیح، تکبیر اور تحمید کا نام ہے، پس یہی سنت ہے، کلام والی حدیثیں سنت نہیں، کیونکہ وہ منسوخ ہیں۔

وہ حدیثیں جو نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہیں:

دوسری قسم: وہ حدیثیں ہیں جو نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہیں، وہ اگرچہ حدیثیں ہیں، مگر سنت نہیں، جیسے نبی ﷺ کے لئے نکاح کے باب میں چار کی قید نہیں تھی، چنانچہ نبی ﷺ کے نکاح میں نو بیویاں جمع ہوئی ہیں، جب حضور کا یہ فعل ہے تو حدیث ہوئی، مگر سنت نہیں، امت کو جس راستہ پر چلنا ہے وہ یہ ہے کہ چار ہی بیویاں ایک ساتھ جمع ہوسکتی ہیں۔ اور حضور کا فعل حضور کے ساتھ خاص ہے۔ سورۂ احزاب میں ایک لمبی آیت ہے: ﴿يٰأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ﴾: اس میں آگے ہے: ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾: یہ حکم خاص آپؐ کے لئے ہے، مؤمنین کے لئے نہیں ہے: ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَافَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ﴾: امت کے لئے ان کی بیویوں اور باندیوں کے سلسلے میں جو احکام ہیں وہ ہمیں معلوم ہیں، وہ ہم نے مقرر کئے ہیں، چنانچہ سورۂ نساء کے شروع میں ہے: ﴿فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾: پس نکاح کرو تم ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، دو دو سے، تین تین سے اور چار چار سے، امت کے لئے یہی حکم ہے۔

نکاح میں حضورؐ کے لئے غیر محدود اور امت کے لئے محدود تعداد کیوں؟

اور نبی ﷺ کے لئے غیر محدود نکاح کی اجازت کیوں تھی؟ اور امت کے لئے چار کی

تعداد کیوں مقرر کی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ امت جو ایک سے زیادہ نکاح کرے گی وہ اپنی ضرورت سے کرے گی، یا عورت کی ضرورت سے۔ عورت کی ضرورت سے: یعنی اس کی کفالت کے لئے، جنگیں ہوتی ہیں، حادثات پیش آتے ہیں، اور حادثات زیادہ تر مردوں کو پیش آتے ہیں، اور جب مسلسل جنگیں ہوتی ہیں تو بہت سی عورتیں بے سہارا رہ جاتی ہیں، اور بے شمار عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ہوگی تو مفاسد کا دروازہ کھل جائے گا، اور عورتیں بھوک مری کا شکار ہونگی، یا حکومت کو ان کی کفالت کرنی پڑے گی، کیونکہ عورتوں کے ذمے شریعت نے کمانا نہیں رکھا۔

اللہ نے عورتوں پر بھاری ذمہ داری نہیں رکھی!

کیونکہ عورتیں صنف نازک ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر کوئی بھاری ذمہ داری نہیں رکھی، جیسے کما کر کھانا: بھاری ذمہ داری ہے، چنانچہ جب تک عورت کی شادی نہیں ہوتی: باپ کے ذمہ اس کا خرچہ ہے، شادی کے بعد شوہر کے ذمہ ہے، بیوہ ہوگئی تو دوسرا نکاح کرلے، اور اگر بوڑھی ہوگئی کہ دوسرے شوہر کے قابل نہیں رہی تو اولاد کے ذمہ اس کا خرچہ ہے، اور اولاد نہیں ہے تو ذی رحم محرم کے ذمہ اس کا خرچہ ہے اور اگر وہ بھی نہیں ہے تو اسٹیٹ (حکومت) کے ذمہ اس کا خرچہ ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے زندگی کے آخر میں فرمایا تھا: اگر میں ایک سال زندہ رہا: تو عراق کی بیوہ عورتیں عمر کے علاوہ کسی کی محتاج نہیں رہیں گی، معلوم نہیں آپؓ کے ذہن میں کیا پلان تھا! اس فرمانے کے تین دن بعد آپؓ شہید کردیئے گئے۔ اور آج تک وہ نظام نہیں بن سکا۔

اس سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کے ذمہ عورتوں کا خرچہ ہے، عورتوں کے ذمہ کمانا نہیں ہے، کیونکہ کما کر کھانا ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ ایسے اور بھی مسئلے ہیں، مثلاً: عورتوں کو نبوت کی ذمہ داری نہیں سونپی گئی، کبھی کوئی عورت نبی یا رسول نہیں بنائی گئی، کیونکہ نبوت کا کام بھاری ذمہ داری ہے۔

اسی طرح جہاد عورتوں کے ذمہ نہیں رکھا، کیونکہ میدانِ جنگ میں پتے پانی ہوتے ہیں،

حتی کہ نفیر عام ہو جائے، اور ہر شخص پر جہاد فرض ہو جائے تب بھی عورتوں پر جہاد فرض نہیں۔

اسی طرح حکومت چلانا بھی بھاری ذمہ داری ہے، عورت اپنی وضع (نسوانی حالت) باقی رکھتے ہوئے حکومت نہیں چلا سکتی، قتل کے مقدمہ میں عورت کی گواہی معتبر نہیں، کیونکہ گواہی اس وقت دی جا سکتی ہے جب قتل کو گواہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور عورت قتل کے موقعہ پر باہوش نہیں رہ سکتی، اور قتل کا مشاہدہ نہیں کر سکتی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوگا کہ کوئی بھی بھاری ذمہ داری عورتوں پر نہیں رکھی گئی، انہی بھاری ذمہ داریوں میں سے کما کر کھانا بھی ہے۔ پس اگر کسی جنگ کے نتیجہ میں عورتیں بہت ہوگئیں اور مرد کم رہ گئے تو بیواؤں کا کیا ہوگا؟ ان کی کفالت کا مسئلہ پیدا ہوگا، اور حکومت ان کا بوجھ اٹھائے اس سے بہتر یہ ہے کہ مردان سے شادی کرلیں، کیونکہ عورت کو صرف روزی روٹی کی ضرورت نہیں ہوتی، عورت کی ایک نفسانی ضرورت بھی ہے جو نکاح ہی سے پوری ہو سکتی ہے۔

اسی لئے مرد اتنی ہی عورتیں کر سکتا ہے جن کی نفسانی ضرورت پوری کر سکے، اور یہ بات اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ ایک مرد کتنی عورتوں کی ضرورت پوری کر سکتا ہے؟ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جمہور کا خیال کر کے چار کی تعداد مقرر کردی۔

تعدد ازدواج مرد کی بھی ضرورت ہے:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیوی کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوتی ہے کہ شوہر کا اس سے ملنا شوہر کے لئے یا بیوی کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے، اور ہر مہینے عورت کو حیض آتا ہے، اور ممکن ہے شوہر قوی الشہوت ہو، اور وہ اتنے دنوں صبر نہ کر سکے، اور حمل کے زمانے میں دو تین مہینے ایسے گذرتے ہیں کہ بیوی کا شوہر کی طرف میلان نہیں رہتا، ایسی حالت میں بیوی سے ملنے میں کیا مزہ! پھر بعض مرد نارمل خواہش والے ہوتے ہیں، اور بعض قوی الشہوت، ان کا ایک بیوی سے کام نہیں چلتا، پس ایسی صورت میں مرد کیا کرے گا؟ اگر ایک ہی بیوی ہوگی تو مرد ناجائز تعلقات قائم کرے گا۔ اور جن اقوام کے نزدیک تعدد ازدواج جائز نہیں، وہ لوگ معذور بیوی سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس کو قتل کر دیتے ہیں، اسلام نے بیوی کو قتل سے بچانے کے لئے نکاح ثانی کی اجازت دی، اور زنا اسلام میں سخت ترین تعزیری جرم ہے، شادی شدہ زنا کرتا ہے

تو سنگسار کیا جاتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے جائز موقع فراہم کیا جائے۔

غرض: مرد کو اجازت دی ہے، مگر اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ سب بیویوں کے ساتھ انصاف کر سکے، اگر کوئی انصاف نہ کر سکے تو دوسری تیسری بیوی کرنا جائز نہیں، سورۂ نساء میں ہے: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً أَوْ مَامَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾: اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم چند بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک بیوی رکھو، اور اگر ایک کے بھی حقوق ادا نہ کر سکو تو باندیوں سے کام چلاؤ، ایک آزاد عورت سے بھی نکاح مت کرو، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت انصاف کی شرط کے ساتھ ہے۔

بہر حال امت جو نکاح کرے گی وہ اپنی ضرورت سے کرے گی، اور ایک آدمی کتنی بیویوں کے حقوق ادا کر سکتا ہے: یہ بات اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے: اس لئے ان کے لئے چار کی تعداد مقرر کر دی۔

اور حضور ﷺ نے جتنے نکاح کئے ہیں ان میں سے دو کے علاوہ کوئی نکاح اپنی ضرورت سے نہیں کیا۔ جب آپؐ کی عمر مبارک پچیس سال کی تھی تب آپؐ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ یہ نکاح آپؐ نے اپنی ضرورت سے کیا تھا، پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو گھریلو ضرورت سے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ اس کے بعد ایک نکاح (حضرت عائشہؓ سے) اللہ نے اور کرایا، مگر وہ بیوی صاحبہ گھر میں نہیں آئیں، یہ نکاح ایک خواب کی بنا پر ہوا تھا، بخاری میں روایت ہے کہ آپؐ نے خواب دیکھا، فرشتہ ایک ریشمی کپڑا لایا، اور آپؐ سے کہا: یا رسول اللہ! اس کو کھولیے، آپؐ نے کھولا تو اس میں حضرت عائشہؓ نظر آئیں۔ یہ خواب آپؐ نے دو تین مرتبہ دیکھا۔

نبی کا خواب وحی ہوتا ہے اور اس کی بھی تعبیر ہوتی ہے:

نبی کا خواب وحی ہوتا ہے، اور جیسے ہمارے خوابوں کی تعبیر ہوتی ہے نبی کے خواب کی بھی تعبیر ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو حکم ملا تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کریں: وہ حکم خواب کے ذریعہ ملا تھا، انھوں نے خواب دیکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کی قربانی کر رہے ہیں۔ خواب حضرت ابراہیمؑ کی سمجھ میں نہیں آیا، کیونکہ بیٹے کی قربانی کرنے کا

رواج نہیں تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے سو اونٹوں کی قربانی کر کے غریبوں میں ان کا گوشت بانٹا، کیونکہ ایک جان کی دیت سو اونٹ ہوتی ہے، چند دن بعد پھر وہی خواب دیکھا، اب بھی سمجھ میں نہیں آیا، پھر سو اونٹ کی قربانی کر کے غریبوں میں ان کا گوشت بانٹا، چند دن کے بعد پھر وہی خواب دیکھا، اب حضرت سمجھے کہ اس خواب کی تعبیر نہیں ہے، بیٹے ہی کی قربانی مقصود ہے، چنانچہ آپؑ بیت المقدس سے سفر کر کے مکہ مکرمہ پہنچے، اور بیٹے سے کہا: ﴿إِنِّیْ أَرٰی فِیْ الْمَنَامِ: أَنِّیْ أَذْبَحُكَ﴾ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں: ﴿فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی﴾: پس بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے کہا: ﴿یا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ، سَتَجِدُنِیْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ﴾: ابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کیجئے، میں ذبح ہونے کے لئے تیار ہوں، آپ مجھے اگر اللہ نے چاہا تو برداشت کرنے والوں میں سے پائیں گے یعنی میں ہمت کر کے ذبح ہونے کی تکلیف برداشت کر لونگا۔ غور کریں: اسماعیل علیہ السلام نے کہا ہے: ﴿اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ اس سے معلوم ہوا کہ خواب بھی امر ہے۔

ایسے ہی حضور ﷺ کو جو خواب دکھایا گیا تھا اس میں فرشتہ نے اگرچہ صرف اتنا کہا تھا کہ هذه زوجتك: یہ آپؐ کی اہلیہ ہیں، مگر وہ امر (حکم) تھا، چنانچہ حضورؐ نے فرمایا: إن كان من الله يُمْضِهِ: اگر یہ بات اللہ کی طرف سے طے ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی کوئی شکل کریں گے۔

اُدھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے طور پر سوچ رہے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کا نکاح حضور ﷺ سے کر دیں، کیونکہ حضرت سودہؓ زیادہ دنوں کی مہمان نہیں تھیں، اس لئے چند سالوں کے بعد جب وہ نہیں رہیں گی یا بوڑھی ہو کر شوہر کے کام کی نہیں رہیں گی تو عائشہ بالغ ہو کر حضور کا گھر سنبھال لیں گی۔

چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے پیش کش کی، اور آپؐ چونکہ کئی مرتبہ خواب دیکھ چکے تھے، اس لئے ان کی پیش کش منظور کر لی، یوں آپؐ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہو گیا۔ حضورؐ نے یہ نکاح اپنی ضرورت سے نہیں کیا تھا۔

اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کنواریوں میں سے صرف حضرت عائشہؓ سے حضورؐ نے

نکاح فرمایا ہے، اِن کے علاوہ کسی کنواری لڑکی سے حضور نے نکاح نہیں کیا، اور اس نکاح کے فوائد بعد میں ظاہر ہوئے، انھوں نے آدھا دین حضور سے اخذ کیا۔

پھر ہجرت کا زمانہ آ گیا، ہجرت کے دو سال بعد تک حضرت سودہؓ ہی آپؐ کے گھر کو سنبھالے رہیں، پھر جب حضرت عائشہؓ بالغ ہو گئیں تو وہ رخصت ہو کر آپؐ کے گھر میں آ گئیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کی عمر پچپن سال کی ہو چکی تھی، اور زندگی کے صرف آٹھ سال باقی رہ گئے تھے، انہی آخری آٹھ سالوں میں آپؐ نے باقی نکاح کئے ہیں، پس اگر کسی کے پاس معمولی عقل بھی ہے تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ شوق کا زمانہ نہیں، بلکہ کسی مصلحت سے آپؐ نے یہ نکاح کئے ہیں۔

وہ مصلحت کیا تھی؟ تین مصلحتوں سے آپؐ نے یہ نکاح کئے ہیں: سیاسی، ملّی اور شخصی (۱)

غرض: جب مذکورہ مصلحتیں تھیں تو حد کیسے مقرر کی جاتی؟ اور نبی معصوم ہوتا ہے، اس لئے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ آپؐ کسی بیوی صاحبہ کی حق تلفی کریں گے، اس لئے نکاح کے باب میں آپؐ کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔

غیر مقلدوں کے نزدیک نکاح میں کوئی تحدید نہیں!

یہ مثال میں نے اس لئے دی ہے کہ جب آپ ﷺ کا یہ عمل ہے اور آپؐ کے نکاح میں چار سے زیادہ ازواج جمع ہوئی ہیں تو یہ حدیث ہوئی، چنانچہ اہل حدیث اس حدیث پر عمل کرتے ہیں، ان کے نزدیک امت کے لئے بھی نکاح کے باب میں کوئی تحدید نہیں، نواب صدیق حسن خان صاحب بھوپالی کے لڑکے نواب نور الحسن خان صاحب نے عَرْف الجادی میں یہ مسئلہ صراحۃً لکھا ہے، حالانکہ یہ حدیث سنت نہیں ہے، امت کا اجماع ہے کہ امت کے لئے چار سے زیادہ بیویاں جمع کرنا جائز نہیں۔

اصل مضمون یہ چل رہا تھا کہ تین قسم کی حدیثیں ہیں، جو سنت نہیں ہیں، ان میں سے دو کا بیان ہو چکا: وہ حدیثیں جو منسوخ ہیں، اور وہ حدیثیں جو نبی پاک ﷺ کے ساتھ خاص ہیں: حدیثیں ہیں، مگر سنت نہیں۔ اب تیسری قسم بیان کرتا ہوں۔

---

(۱) تینوں مصلحتوں کی تفصیل اسی حصہ میں کسی اور تقریر میں آ چکی ہے اس لئے یہاں سے حذف کی ہے۔

تیسری قسم: نبی ﷺ نے کسی مصلحت سے کوئی بات فرمائی یا کوئی عمل کیا تو وہ حدیث ہے مگر سنت نہیں، اس کی پانچ مثالیں سنیں، اور اتنی مثالیں اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ یہ مسائل سمجھنے ضروری ہیں۔

مغرب سے پہلے نفلیں پڑھنا سنت نہیں

پہلی مثال: بخاری شریف میں ایک باب ہے: **باب الصلاة قبل المغرب** (کتاب التہجد باب ۳۵ حدیث ۱۱۸۳): نبیؐ نے فرمایا مغرب سے پہلے نفلیں پڑھو، یہ بات دو مرتبہ فرمائی، پھر تیسری مرتبہ: **لِمَنْ شاء** بڑھایا یعنی مغرب سے پہلے کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، راوی کہتے ہیں: آپؐ نے **لمن شاء** اس لئے بڑھایا کہ لوگ اس کو سنت نہ بنالیں: **كراهيةَ أَنْ يَّتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً**: اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ لوگ اس نماز کو سنت بنالیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث اور سنت الگ الگ چیزیں ہیں، اور ارشاد پاک: **صَلُّوا قبلَ صلاةِ المغرب** مسئلہ سمجھانے کے لئے ہے۔ عصر کے فرض پڑھنے کے بعد جو نفلوں کی ممانعت ہے وہ غروبِ شمس تک ہے، سورج چھپتے ہی کراہیت ختم ہوجاتی ہے، اب کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، مگر اس وقت میں نفلیں پڑھنا سنت نہیں، نبی ﷺ نے مغرب سے پہلے کبھی نفلیں نہیں پڑھیں، چاروں خلفاء نے بھی نہیں پڑھیں۔

اور اگر کوئی کہے کہ جب مغرب کی اذان ہوتی تھی تو صحابہ ستونوں کی آڑ لے کر نفل پڑھتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دور مابعد کا واقعہ ہے، اور صحابہ کے عمل سے جواز ثابت ہوتا ہے، اور یہ جواز تو خود حضورؐ کے ارشاد سے بھی ثابت ہوتا ہے، اور جواز میں کوئی کلام نہیں، اگر مغرب کے فرضوں میں تاخیر نہ ہو، اور کوئی نفلیں پڑھے تو بلاشبہ جائز ہے مثلاً: رمضان میں اذان کے دس منٹ کے بعد نماز کھڑی ہوتی ہے، پس کوئی کھجور سے افطار کر کے نفلیں پڑھے: تو پڑھے، لیکن اگر اس کو سنت بنالیا جائے تو پھر پورے سال پندرہ منٹ کے بعد مغرب کی نماز کھڑی ہوگی، جو سنت کے خلاف ہے، مغرب کی نماز میں جلدی کرنا مطلوب ہے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا سنت نہیں:

دوسری مثال: نبی ﷺ نے زندگی میں ایک مرتبہ ایک قوم کی کوڑی پر کھڑے ہو کر

پیشاب فرمایا: یہ حدیث ہے، مگر سنت نہیں، یہ دینی طریقہ نہیں، آپؐ ہمیشہ بیٹھ کر پیشاب فرماتے تھے، اور وہی سنت ہے۔

پھر حضورؐ نے کھڑے ہوکر پیشاب کیوں فرمایا؟ مسئلہ کی وضاحت کے لئے۔ کبھی انسان کو ایسی مجبوری پیش آتی ہیں کہ بیٹھ نہیں سکتا، مثلاً کوڑی ہے، گندگی کی جگہ ہے، ایسی مجبوری میں کھڑے ہوکر پیشاب کرنا جائز ہے، یا کسی بیماری کی وجہ سے بیٹھ نہیں سکتا: تب بھی یہی حکم ہے۔ بیل کی طرح کھڑے کھڑے موتنا سنت کے خلاف ہے، یہ غیروں کا طریقہ ہے۔

پھر سنت کیا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: **مَنْ حَدَّثَكُمْ أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كَانَ يَبُوْلُ قَائِمًا فَلَا تُصَدِّقُوْهُ، مَا كَانَ يَبُوْلُ إِلَّا قَاعِدًا**: اگر تم سے کوئی بیان کرے کہ آپؐ کی عادت شریفہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی تھی تو ہرگز اس کی بات نہ ماننا، آپؐ ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیشاب فرمایا کرتے تھے۔

ایک لطیفہ:

نیویارک کی ایک مسجد میں ایک غیر مقلد حدیث کی تعلیم کر رہا تھا، اس نے یہی کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی روایت بیان کی، اور کہا: کھڑے ہوکر پیشاب کرنا سنت ہے، اس حدیث سے یہ بات صراحۃً ثابت ہوتی ہے۔ مجمع میں سے ایک شخص نے سوال کیا: یہ سنت صرف مردوں کے لئے ہے یا عورتوں کے لئے بھی ہے؟ بس اس کی سٹّی گم ہوگئی!

حیض کے زمانے میں بیوی کو ساتھ لٹانا سنت نہیں:

تیسری مثال: ایک مرتبہ نبی ﷺ نے حیض کے زمانہ میں حضرت عائشہؓ سے فرمایا: لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔ یہ مسئلہ کا بیان تھا، سنت نہیں ہے۔ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ آپؐ اور حضرت عائشہؓ ساتھ لیٹے ہوئے تھے، رات میں حضرت عائشہؓ کا حیض شروع ہوا، وہ چپکے سے کھڑی ہوگئیں، ایسے موقعہ پر عورتیں روئی لنگوٹ وغیرہ باندھتی ہیں، آپؐ کی آنکھ کھل گئی، آپؐ نے پوچھا: کیا ماہواری شروع ہوگئی؟ انھوں نے کہا: ہاں یارسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: جو کپڑے باندھنے ہیں وہ باندھ لو، پھر لنگی پہن کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ، کیونکہ

مکتبہ حجاز دیوبند

رات آدھی ہوگئی ہے، گھر میں کوئی چراغ نہیں ہے، مسجد نبوی میں چراغ نہیں جلتا تھا: گھر میں چراغ کہاں سے آتا! اس لئے آپؐ نے فرمایا: لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔

یہ زندگی میں ایک مرتبہ کا واقعہ ہے اور مسئلہ کا بیان ہے، سنت نہیں ہے۔ جب حضرت عائشہؓ یہ واقعہ بیان کرتیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہتیں: وَأَيُّكُمْ يَمْلِكُ أَرَبَه: تم میں سے کون اپنی خواہش پر کنٹرول کرسکتا ہے؟ یعنی اس کو سنت سمجھ کر حالتِ حیض میں بیوی کو ساتھ نہ لٹاؤ، ورنہ گناہ میں مبتلا ہوجاؤ گے۔

حالتِ حیض میں بیوی سے کتنا قریب ہوسکتے ہیں؟

اور وہ مسئلہ کیا ہے جس کی آپؐ نے اپنے عمل سے وضاحت فرمائی ہے؟ جواب: حیض کے بارے میں قرآنِ کریم میں آیت ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوْا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾: لوگ آپؐ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ بتلائیں کہ حیض کی حالت تکلیف دہ حالت ہے، اس گندگی کی حالت میں صحبت کرنا سوزاک کی بیماری پیدا کرتا ہے، اور اس زمانے میں صحبت کرنے سے بیوی کو بھی تکلیف ہوتی ہے، اس لئے حیض کی حالت میں عورتوں سے علاحدہ رہو، اور ان کے نزدیک مت جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائیں۔

اب اس کی وضاحت ضروری ہے کہ کتنا علاحدہ رہنا ضروری ہے، اور کتنا نزدیک جانا جائز ہے، اور کہاں تک جانے پر پابندی ہے؟ جب یہ آیت نازل ہوئی تو یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حیض کے زمانہ میں عورت کو علاحدہ کمرہ دیتے تھے، اس کے کمرے میں شوہر نہیں جاتا تھا، حائضہ کے ہاتھ کا پکا ہوا بھی کوئی نہیں کھاتا تھا، آج بھی یہود کا یہی طریقہ ہے، چنانچہ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! آپؐ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ یہود کی مخالفت کرو، پس کیا ہم حالتِ حیض میں بیوی سے صحبت نہ کریں؟ تاکہ ان کی پوری مخالفت ہوجائے، اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، اور اس میں حکم دیا کہ حیض کے زمانے میں عورتوں سے علاحدہ رہو، اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں: ان کے نزدیک مت جاؤ۔ اب اس اجمال کی وضاحت ضروری تھی، چنانچہ نبی ﷺ نے مختلف طرح سے اس آیت کی تفسیر بیان کی:

۱- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالتِ حیض میں ہوتی تھیں اور آپؐ اور حضرت عائشہؓ ایک ہی پلیٹ میں کھاتے تھے، معلوم ہوا کہ اتنا قریب جاسکتے ہیں۔

۲- حضرت عائشہؓ نے گوشت کی بوٹی آدھی کھائی ہوتی تھی: باقی ان کے ہاتھ سے لے کر آپؐ نوش فرماتے تھے، معلوم ہوا کہ اتنا نزدیک جانا بھی جائز ہے، اُس بوٹی پر حضرت عائشہ کا لعاب لگا ہوا ہوتا تھا اور اس بوٹی کو آپؐ نوش فرماتے تھے، معلوم ہوا کہ حائضہ کا تھوک پاک ہے، اور جب تھوک پاک ہے تو پسینہ بھی پاک ہے۔

۳- آپؐ اعتکاف میں ہوتے تھے، مسجد میں بیٹھے ہوئے سر حجرے میں نکال دیتے تھے، حضرت عائشہؓ نیچے برتن رکھ کر سر مبارک دھوڈالتی تھیں، پھر بال خشک کر کے تیل ڈال کر کنگھا کر دیتی تھیں اور وہ حالت حیض میں ہوتی تھیں، معلوم ہوا کہ بیوی حالتِ حیض میں شوہر کی یہ خدمت بھی کرسکتی ہے۔

۴- اور مذکورہ واقعہ میں حضور نے فرمایا: لنگی باندھ کر میرے ساتھ آ کر لیٹ جاؤ، چنانچہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ حیض کے زمانہ میں ناف سے گھٹنے تک بدن کو کپڑے کی آڑ کے بغیر ہاتھ لگانا جائز نہیں، کیونکہ اس سے زیادہ نبی ﷺ نزدیک نہیں ہوئے۔

بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھنا سنت نہیں!

چوتھی مثال: ایک مرتبہ جب تکبیر ہوئی تو نبی ﷺ اپنی نواسی کو گود میں لئے ہوئے گھر سے تشریف لائے، اور اس بچی کو گود میں اٹھائے ہوئے پوری نماز پڑھائی: جب سجدہ کرتے تھے تو بچی کو نیچے بٹھا دیتے تھے، اگلی رکعت میں پھر اس کو گود میں لے لیتے تھے، آپؐ نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ یہ عمل کیا ہے، اور یہ بھی مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا۔ کیا آپؐ کے گھروں میں اس بچی کو دس منٹ کے لئے کوئی رکھنے والا نہیں تھا؟ ضرور تھا، مگر آپؐ بالقصد بچی کو لے کر آئے تھے اور اس کے ساتھ نماز پڑھا کر دکھائی تھی، کیونکہ بعض دفعہ ایسے حالات پیش آتے ہیں: آدمی کبھی ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں بچہ کو بٹھا کر نماز پڑھے گا تو درندہ اس کو پھاڑ کھائے گا، یا اغوا کرنے والے اچک لے جائیں گے، ایسی صورت میں آدمی کیا کرے؟ بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھے! نماز قضاء نہ کرے، اور کبھی گھر میں ایسا ہوتا ہے کہ بچہ کسی وجہ

سے ڈر جاتا ہے، ماں سے جدا نہیں ہوتا، جدا کرتی ہے تو روتا ہے، اور گھر میں کوئی دوسرا رکھنے والا نہیں: ایسی صورت میں کیا ماں نماز قضا کرے گی؟ نہیں! بچے کو گود میں اٹھا کر نماز پڑھے گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ بچے کا بدن اور کپڑے پاک ہوں۔

غور کرو! حضور ﷺ نے ایک عمل کر کے ماؤں کے لئے کتنا بڑا راستہ کشادہ کر دیا! اب اگر کوئی کہے کہ یہ سنت ہے اور وہ چھوٹے بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھے تو اس سے کہا جائے گا کہ یہ سنت نہیں ہے، یہ عمل تو مسئلہ کی وضاحت کیلئے کیا تھا، پس یہ حدیث ہے، سنت نہیں۔

ناسمجھ بچوں کو مسجد میں لانا ممنوع ہے:

یہاں (کناڈا، یوروپ اور امریکہ میں) لوگ چھوٹے بچوں کو مسجد میں لے کر آجاتے ہیں، اور چھوڑ دیتے ہیں، وہ صفوں میں دوڑتے پھرتے ہیں، اور لوگوں کی نماز خراب کرتے ہیں، حالانکہ ابن ماجہ وغیرہ میں حدیث ہے: جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ: اپنی مسجدوں کو اپنے (ناسمجھ) بچوں سے بچاؤ، جب تک بچے پاکی ناپاکی کو نہ سمجھیں اور مسجد کا احترام نہ جانیں: بچوں کو مسجد میں لانا منع ہے، لوگ یہ حدیث پیش کرتے ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ عمل مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا، سنت نہیں تھا۔

سنت کی کسوٹی صحابہ کا عمل ہے:

سوال: ہم کیسے جانیں کہ حضورؐ نے یہ جو عمل کیا ہے، وہ مسئلہ نہیں ہے، مصلحت ہے، اس کے پہچاننے کے لئے کسوٹی کیا ہے؟ جواب: کسوٹی صحابہ کا عمل ہے، صحابہ نے اس پر عمل کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو وہ سنت ہے، ورنہ وہ عمل کسی مصلحت سے ہے، آپ صحابہؓ کا پورا دور دیکھیں، کسی صحابی نے کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا اور ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ کسی صحابی نے حالتِ حیض میں بیوی کو ساتھ لٹایا ہو، اور کبھی بھی کسی صحابی نے بچے کو گود میں لے کر مسجد میں آکر نماز نہیں پڑھی ہو۔ صحابہ سے زیادہ سنتوں کا عاشق کون تھا؟ اگر یہ اعمال سنت ہوتے تو صحابہ ضرور ان پر عمل کرتے۔ پس یہ اس بات کی کسوٹی ہے کہ یہ حدیثیں: محض حدیثیں ہیں،

سنت نہیں ہیں۔ اور آپؐ کے یہ سب اعمال کسی مصلحت سے ہیں۔

زور سے آمین کہنا حنفیہ کے نزدیک سنت نہیں:

پانچویں مثال: اُنہی مصلحتوں میں سے ایک مصلحت: تعلیم امت بھی ہے، جب حضرت وائل بن حُجر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیس دن ٹھہرے ہیں، اور ساٹھ جہری نمازیں آپؐ کے پیچھے پڑھی ہیں، ان میں سے تین نمازوں میں آپؐ نے زور سے آمین کہی ہے، یہ جہر حضرت وائل کی تعلیم کے لئے تھا، پس یہ بھی حدیث ہے، سنت نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت وائلؓ یمن کے نواب زادے تھے، جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ وہاں گورنر بنا کر بھیجے گئے، اور انھوں نے دعوت کا کام شروع کیا تو حضرت وائلؓ مسلمان ہوگئے، ایک تو وہ بڑے آدمی تھے، دوسرے وہ خود سمجھ دار تھے، حضرت معاذؓ نے ان کو مشورہ دیا کہ مدینہ جاؤ، اور حضور ﷺ سے ملو، حضورؐ تمہیں دیکھ کر خوش ہونگے، چنانچہ وہ یمن سے مدینہ آئے، جب تین دن کی مسافت پر رہ گئے تو وحی سے آپؐ کو اطلاع ملی، آپؐ نے صحابہ کو خوش خبری سنائی، چنانچہ سارا مدینہ منتظر تھا کہ کوئی نواب زادہ مسلمان ہوکر آرہا ہے، پھر جب وہ مدینہ پہنچے تو نبی ﷺ نے مسجد سے نکل کر ان کا استقبال کیا، اور ان کو خوش آمدید کہا، پھر ان کو اپنے ساتھ لائے، اور اپنی چادر بچھا کر اس پر بٹھایا۔

حضرت وائلؓ بیس دن حضورؐ کے پاس رہے ہیں، ان بیس دنوں میں آپؐ نے ان کے نماز پڑھنے کے لئے اپنے پیچھے پہلی صف میں جگہ متعین کردی تھی، وہ کہتے ہیں: جب نبی ﷺ نے پڑھا: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ تو آمین کہی، اور آمین کے ساتھ اپنی آواز کھینچی، یعنی زور سے آمین کہی، آگے روایت میں ہے: سَمِعْتُهُ وَأَنَا خَلْفَهُ: میں نے آپؐ کی آمین سنی، درانحالیکہ میں آپؐ کے پیچھے تھا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتنی زور سے آمین کہی ہوگی، آج کل زور سے آمین کہنے والے دو غلطیاں کرتے ہیں: ایک: چلا کر آمین کہتے ہیں، حالانکہ حضورؐ نے اتنی زور سے آمین کہی تھی کہ پہلی صف میں حضرت وائلؓ نے سن لی تھی، لوگ اسی حدیث کی بناء پر زور سے آمین کہتے ہیں، پس اتنی ہی آواز سے آمین کہیں۔ دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ آمین کے الف کو کھینچتے ہیں، اللہ جانے وہ کونسا مد کرتے

ہیں، اس کو صرف ایک الف کے بقدر کھینچنا چاہئے۔

بہر حال میں یہ بتا رہا تھا کہ حضرت وائلؓ کہتے ہیں: حضور ﷺ نے آمین کہی اور میں نے پہلی صف میں سنی، اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ثلاثاً آمین کہی، ثلاثاً کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے تین دفعہ آمین کہی، مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ثلاثاً کا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ تین نمازوں میں جہراً آمین کہی، بیس دن کی جہری نمازیں ساٹھ ہوتی ہیں، ان میں سے صرف تین نمازوں میں جہراً آمین کہی ہے، اور دُولابی کی کتاب الاسماء والکُنیٰ میں روایت ہے: حضرت وائلؓ کہتے ہیں: مَاأُرَاهُ إِلَّا لِيُعَلِّمَنَا: جہاں تک میرا خیال ہے آپؐ نے زور سے آمین مجھے سکھلانے کے لئے کہی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کا جہراً آمین کہنا ایک خاص مصلحت سے تھا، پس اس سے بھی صرف جواز ثابت ہوتا ہے، سنت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

بہر حال مضمون یہ چل رہا تھا کہ حدیث اور سنت میں عام خاص من وجہ کی نسبت ہے، اور جہاں یہ نسبت ہوتی ہے وہاں تین مادے ہوتے ہیں، ایک مادۂ افتراقی کا بیان ہو چکا کہ تین قسم کی روایتیں حدیثیں ہیں، سنت نہیں ہیں: ایک: وہ حدیثیں جو منسوخ ہیں، دوسری: وہ حدیثیں جو نبی پاک ﷺ کے ساتھ خاص ہیں، تیسری: وہ حدیثیں جن میں حضورؐ نے کوئی ارشاد فرمایا ہے یا کوئی عمل کیا ہے، کسی مصلحت سے یا کوئی مسئلہ سمجھانے کے لئے۔

خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کا حکم

دوسرا مادۂ افتراقی: اور کچھ چیزیں سنت ہیں، مگر حدیث نہیں، وہ خلفائے راشدین کی سنتیں ہیں، نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا، وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ: میری سنت مضبوط پکڑو، اور میرے بعد میرے جو جانشیں آئیں گے ان کی سنت مضبوط پکڑو۔

یہاں کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے نبی تو اللہ کے نبی ہیں، گفتۂ او گفتۂ اللہ بود، آپؐ کا فرمایا ہوا تو اللہ کا فرمایا ہوا ہے، مگر یہ خلفائے راشدین کون نبی ہیں کہ ان کی سنت کی پیروی کی جائے؟

اس لئے آگے فرمایا کہ ان کی سنت کی پیروی اس لئے ضروری ہے کہ وہ راشد ہوں گے، راشد کے معنی ہیں: راہ یاب، اور فرمایا: وہ مہدی ہونگے، مہدی کے معنی ہیں: ہدایت مآب، یعنی ہدایت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوگی۔

یہ بنیاد ہے ان کی سنت کی پیروی کرنے کی، اور ہم جو ائمہ کی تقلید (پیروی) کرتے ہیں اس کی بھی یہی بنیاد ہے، اور غلطی کا احتمال اگر ابوحنیفہ وشافعی میں ہے تو ابوبکر وعمر وعثمان وعلی میں بھی ہے، لیکن غلطی کے احتمال کے باوجود خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی ضروری ہے پس اسی بنیاد پر مجتہدین کی پیروی بھی ضروری ہے، ابوحنیفہؒ کی پیروی عالم دین ہونے کی وجہ سے ہے، قرآن وحدیث کا کامل علم رکھنے کی وجہ سے ہے، چنانچہ امام اعظم کا قول مذہب میں موجود ہوتا ہے، مگر دلائل سے وہ قوی نہیں ہوتا تو امام صاحب کا قول چھوڑ دیا جاتا ہے، اور صاحبین کے قول پر فتوی دیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ پیروی دلائل کی کی جاتی ہے، محض قول کی پیروی نہیں کی جاتی۔

پھر مذہبِ حنفی کیوں کہتے ہیں؟ جواب: یہ ایک رمزی نام ہے، ایک مکتب فکر کا نام ہے، معین شخص مراد نہیں، چنانچہ آج نئے مسائل میں مفتی صاحبان جو فتوے دیتے ہیں وہ بھی مذہبِ حنفی میں شامل ہوتے ہیں۔

مکتبہ حجاز دیوبند

بہر حال مجتہدین کی پیروی بھی اسی بنیاد پر ہے جس بنیاد پر خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کا حکم ہے۔

پھر فرمایا: تَمَسَّكُوْا بِهَا: بهما نہیں فرمایا، یعنی میرے خلفاء کی سنت کو مضبوط پکڑو، مفرد کی ضمیر ہے، اور ضمیر قریب مرجع کی طرف لوٹتی ہے، پس هَا کا مرجع سنة الخلفاء ہے، کیونکہ حضور ﷺ کی سنت کو تو ہر مسلمان قبول کرے گا، وہ تو اللہ کے نبی ہیں، اور اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں۔ لیکن خلفائے راشدین کی سنتوں کو غیر مقلد نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں: خلفائے راشدین کونسے انبیاء ہیں؟ اس لئے حضورؐ نے تاکید فرمائی کہ خلفائے راشدین کی سنتوں کو بھی مضبوط پکڑو، پھر مزید تاکید فرمائی: عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ: ان کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑو۔ خلفائے راشدین کی یہی سنتیں سنت ہیں، مگر حدیث نہیں ہیں۔

خلفائے راشدین کی سنتوں کو مضبوط پکڑنے کا حکم کیوں ہے؟

نبی پاک ﷺ کے زمانہ تک قومی حکومت (نیشنل گورنمنٹ) قائم ہوئی تھی، بین الاقوامی حکومت (انٹر نیشنل گورنمنٹ) قائم نہیں ہوئی تھی، چنانچہ نیشنل حکومت کے احکام حضور ﷺ نے بیان فرمائے، مگر انٹر نیشنل حکومت کے احکام بیان نہیں فرمائے۔ اگر ابھی وہ احکام بیان کئے جاتے تو وہ قبل از وقت ہوتے اور قبل از وقت بیان کئے ہوئے احکام سمجھ میں نہیں آتے، اور سمجھے بغیر یاد بھی نہیں رکھے جاسکتے۔

جیسے آج کل کلوننگ (قلم لگانے) کا مسئلہ چل رہا ہے، اگر حضورؐ اس کے احکام بیان کرتے تو صحابہ کیسے سمجھتے؟ آج مولوی بھی نہیں سمجھتے کہ کلوننگ کیا چیز ہے؟ اسی طرح اگر حضورؐ انٹر نیشنل حکومت کے احکام بیان فرماتے تو صحابہ کیسے سمجھتے؟ اور نہ سمجھتے تو یاد کیسے کرتے؟ اور امت تک کیسے پہنچاتے؟ کیونکہ مسئلہ وقت پر ہی سمجھ میں آتا ہے، اور وقت پر ہی بیان کیا جاتا ہے۔

انٹر نیشنل حکومت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قائم ہوئی، اور جب بین الاقوامی حکومت قائم ہوتی ہے تو ملک میں مختلف مذاہب اور مختلف قومیں آباد ہوجاتی ہیں، اور ملت بھی بہت وسیع ہوجاتی ہے، اس لئے ملک وملت کو منظّم کرنے کے لئے جو احکام خلفائے راشدین نے جاری کئے ہیں ان کو مضبوط پکڑنا ضروری ہے، اور ان دو معاملوں کے علاوہ وضو، نماز اور روزے وغیرہ کے مسائل میں خلفائے راشدین کی رائیں امت کے دیگر مجتہدین کی رایوں کی طرح ہیں، ان میں ضروری نہیں کہ خلفائے راشدین کی جو رائیں ہیں: وہ سب لی جائیں، یہ بات بعد کے مجتہدین کے اختیار پر موقوف ہے۔

وہ روایتیں جو حدیثیں بھی ہیں اور سنت بھی:

اور مادۂ اجتماع: وہ سب روایتیں ہیں جو معمول بہا ہیں، وہ حدیث بھی ہیں اور سنت بھی، اور ایسی روایتیں بے شمار ہیں، پس ثابت ہوا کہ حدیث اور سنت ایک نہیں، دونوں میں فرق ہے۔ مگر ایک فرقہ جو خود کو اہل حدیث کہتا ہے، وہ کوئی بھی حدیث مل جائے: اس پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، چنانچہ ان کے یہاں نکاح چار میں منحصر نہیں، آدمی

جتنے چاہے نکاح کرسکتا ہے، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ حضورؐ کے نکاح میں نو بیویاں تھیں۔ اور نبی ﷺ نے حضرت غیلان ثقفی کو جو حکم دیا تھا کہ چار سے زائد بیویوں کو الگ کرو: اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ضعیف روایت ہے، اور غیر مقلدین کے نزدیک ضعیف روایت: موضوع روایت کے ہم پلّہ ہوتی ہے۔

ضعیف روایات موضوعات کے ہم پلہ نہیں:

حالانکہ ضعیف حدیث ہے اور موضوع تو حدیث ہی نہیں۔ موضوع: وہ بات ہے جو لوگوں نے گڑھ کر حضور کے نام لگائی ہے، جیسے: أَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ: سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا۔ یہ حدیث قطعاً باطل ہے۔ یہ حدیث زرقانی کی مواہب لدنیہ میں ہے، اور زرقانی نے مصنف عبد الرزاق کا حوالہ دیا ہے، یہ کتاب گیارہ جلدوں میں چھپ چکی ہے، میں نے گیارہ طلباء کو ایک ایک جلد دے کر بٹھایا کہ اس کا ایک ایک حرف پڑھو، اور تلاش کرو یہ حدیث کہاں ہے؟ مصنف عبد الرزاق میں طلباء کو یہ حدیث نہیں ملی، اور مواہب لدنیہ میں یہی ایک حوالہ ہے، اور عجلونی کی کشف الخفاء میں بھی یہ حدیث زرقانی ہی کے حوالہ سے نقل کی ہے، اور کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اور سعید زغلول نے موسوعہ اطراف الحدیث میں کشف الخفاء ہی کا حوالہ دیا ہے، رزقانی کا حوالہ نہیں دیا۔

یہ حدیث اس طرح ہے: آپؐ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں پیدا کرنے سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا، پس وہ نور اللہ کی قدرت سے جہاں اللہ نے چاہا گھومتا رہا، اور اس وقت نہ لوح تھی، نہ قلم، نہ جنت، نہ جہنم، نہ فرشتے، نہ آسمان، نہ زمین، نہ دوزخ، نہ چاند، نہ جنات، نہ انسان۔ پھر جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اس نور کے چار حصے کئے، پہلے جزء سے قلم، دوسرے جزء سے لوح، تیسرے سے عرش پیدا کیا، اور چوتھے حصہ کے پھر چار حصے کئے، پہلے حصہ سے حاملینِ عرش، دوسرے سے کرسی، تیسرے سے باقی فرشتے پیدا کئے، پھر چوتھے جزء کے چار حصے کئے، اول سے آسمان، ثانی سے زمینیں، ثالث سے جنت وجہنم پیدا کیں، پھر چوتھے حصہ کے چار حصے کئے، اول سے مؤمنین کی آنکھوں کی روشنی، دوم: سے ان کے دلوں کا نور

یعنی اللہ کی معرفت، سوم سے ان کی انسیت کا نور یعنی توحید: **لا إله إلا الله: محمد رسول الله** کو بنایا (ابھی حدیث اور بھی ہوگی، کشف الخفا میں اتنی ہی نقل کی ہے)

اس حدیث کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے، گھڑی ہوئی بات ہے، اور اس سے وحدت الوجود کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے، ایسی حدیثیں موضوع کہلاتی ہیں، یہ حدیثیں نہیں، پس حدیث اور موضوع: متن کی صفتیں ہیں، جو بات نبی ﷺ نے فرمائی ہے: وہ حدیث ہے، اور جو لوگوں نے آپؐ کے نام لگائی ہے: وہ موضوع ہے۔

اور وہ حدیثیں جو حضورؐ ہی نے فرمائی ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں: صحیح، حسن اور ضعیف۔ یہ متن کی صفتیں نہیں ہیں، بلکہ سند کی صفتیں ہیں، یعنی نبی پاک ﷺ سے وہ حدیثیں جو مصنّفین کتب تک پہنچی ہیں وہ کیسے راویوں کے توسط سے پہنچی ہیں؟ اگر سب راوی اعلیٰ درجہ کے ہیں تو وہ حدیث: صحیح ہے، اور اگر کوئی راوی خفیف الضبط ہے تو وہ حدیث: حسن ہے، اور اگر کوئی راوی کمزور ہے تو وہ حدیث ضعیف ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

البانی صاحب کا کارنامہ:

اور جب سے حدیثیں کتابوں میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے: صحیح، حسن اور ضعیف تینوں قسموں کو ایک ہی کتاب میں جمع کیا جاتا تھا، اور موضوع کے لئے الگ کتابیں لکھی جاتی تھیں، اور چونکہ سند کے اعتبار سے درجے ہوگئے ہیں، اس لئے فقہاء نے مسائل اخذ کرنے کے اعتبار سے بھی درجے قائم کئے ہیں، اگر کسی مسئلہ میں صحیح حدیث بھی ہے اور حسن بھی تو فقہاء پہلے صحیح کو لیتے ہیں۔ اور اگر کسی مسئلہ میں صحیح حدیث بھی ہے اور ضعیف بھی تو فقہاء صحیح کو لیتے ہیں، ضعیف کو نہیں لیتے۔ اسی طرح حسن اور ضعیف جمع ہوجائیں تو حسن کو لیں گے، ضعیف کو نہیں لیں گے، اور اگر کسی مسئلہ میں صرف ضعیف روایت ہو تو دیکھیں گے کہ ضعف کیسا ہے؟ محتمل یعنی قابل برداشت ہے تو چاروں فقہاء اس سے مسائل میں استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: جب مختلف سندوں سے کوئی حدیث آئے تو وہ حسن لغیرہ اور قابل استدلال ہوجاتی ہے، جیسے صلاۃ التسبیح کی کوئی حدیث صحیح نہیں، سب ضعیف ہیں، مگر گیارہ حدیثیں ہیں، پس سب مل کر حسن لغیرہ ہوجائیں گی، اور اس سے صلوۃ التسبیح کا استحباب ثابت ہوگا، چنانچہ دور اول

سے صلاۃ التسبیح مسلمان پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ اور اگر ضعف قابلِ برداشت نہ ہو، اور سند ایک ہی ہو تو فضائل اعمال میں وہ روایت معتبر ہے، مسائل اس سے ثابت نہیں کیئے جاتے۔

بہرحال چاروں فقہاء کے نزدیک صحیح، حسن اور ضعیف: حدیثیں ہیں، اور اپنے اپنے درجے میں معمول بہا ہیں۔ اب ایک صاحب آتے ہیں: جناب ناصر الدین البانی صاحب، انھوں نے حدیث کی کتابوں میں سے پہلے ضعیف روایتوں کو الگ کیا، ضعیف ابی داؤد، ضعیف جامع صغیر، ضعیف مشکوٰۃ وغیرہ کتابیں لکھیں۔ پھر انھوں نے ان سب ضعیف حدیثوں کو موضوع حدیثوں کے ساتھ ملادیا، اور کئی جلدوں میں کتاب لکھی: **سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة وأثرها السَّيِّئ فى الأمة**: یعنی ضعیف اور موضوع روایات کا مجموعہ جن سے امت کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اس طرح عرب ممالک کے نوجوانوں کا اور آپ کے یورپ اور امریکہ کے جوانوں کا ایک ذہن بنادیا کہ ضعیف حدیث: موضوع حدیث ہے، جب بھی کوئی حدیث ان کے خلاف پیش کی جائے گی تو فوراً کہیں گے: **هذا حديث ضعيف**، اور مراد لیں گے کہ یہ حدیث موضوع ہے، یہ حدیث ہی نہیں۔ یہ کارنامہ جناب عالی نے انجام دیا ہے، اور ساری امت کا ذہن خراب کردیا ہے، عرب ممالک میں اگرچہ البانی کی اس حرکت کے ازالہ کے لئے محنتیں ہورہی ہیں، مگر وہ کتابیں آپ کے ملکوں تک نہیں پہنچی ہیں، اس لئے یہاں البانی صاحب نے جوانوں کو جو زہر پلایا ہے اس کا ازالہ کرتے ہوئے دوسو سال لگیں گے۔

غرض صحیح بھی حدیث ہے، حسن بھی حدیث ہے اور ضعیف بھی حدیث ہے، مگر حجت سنت ہے، حدیث حجت نہیں، اسی طرح خلفائے راشدین نے ملک وملت کی تنظیم کے لئے جو طریقے رائج کیئے ہیں وہ اگرچہ حدیثیں نہیں ہیں، مگر سنت ہیں، اور حجت ہیں۔ اب میں خلفائے راشدین کی سنتوں کی ایک ایک مثال پیش کرتا ہوں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سنت:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو جزیرۃ العرب میں لوگ تین طرح کے تھے، ایک: مسیلمۂ کذاب کے ساتھی تھے، ان سے حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے لوہا

لیا، اور ان کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ دوسرے: مسلمان: جو بڑی تعداد میں تھے۔ تیسرے: وہ لوگ جو مسلمان تھے مگر انھوں نے کہا کہ ہم اپنی زکوٰتیں سنٹرل گورنمنٹ کو نہیں دیں گے، ہم اپنے قبیلہ کی زکوٰتیں وصول کر کے خود تقسیم کریں گے، یہ مانعینِ زکات کہلاتے ہیں، ان کی تعداد تھوڑی تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا: میں ان کے ساتھ جنگ کروں گا، حضرت عمرؓ نے کہا: یہ لوگ مسلمان ہیں، ان کے ساتھ جنگ کیسے جائز ہے! حدیث ہے: أُمِرْتُ أَنْ أقاتل الناس یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں، پھر جب انھوں نے کلمۂ اسلام پڑھ لیا تو انھوں نے ہم سے اپنی جانیں اور اپنے اموال محفوظ کر لئے، اب ان سے جنگ جائز نہیں، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: نہیں! میں ان سے جنگ کروں گا، اگر وہ نبی ﷺ کے زمانہ میں زکات میں رسّی دیتے تھے: وہ بھی نہیں دیں گے تو میں ان سے لڑونگا، اور ان کو مجبور کرونگا کہ وہ زکات مرکزی حکومت کو دیں۔ مگر پھر جنگ کی نوبت نہیں آئی، وہ لوگ قائل ہو گئے، اور انھوں نے سنٹرل گورنمنٹ کو زکوٰۃ بھیجنی شروع کر دی۔

مکتبہ حجاز دیوبند

اب مسئلہ طے ہو گیا کہ جو چیزیں شعائرِ اسلام سے ہیں، اگرچہ وہ سنت کے درجے کی چیزیں ہوں، اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت بالاتفاق ان شعائر کو ترک کر دے تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے گی، اور ان کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ شعائرِ اسلام قائم کریں۔ جیسے ختنہ: اصح قول کے مطابق سنت ہے، لیکن اگر کسی علاقہ کے مسلمان طے کر لیں کہ وہ ختنہ نہیں کرائیں گے تو اسلامی حکومت ان کے ساتھ جنگ کرے گی اور ان کو ختنہ کرنے پر مجبور کرے گی۔ اسی طرح اذان سنت ہے لیکن اگر کسی علاقہ کے لوگ طے کر دیں کہ وہ اذان نہیں دیں گے تو حکومت ان کے ساتھ جنگ کرے گی اور ان کو اذان دینے پر مجبور کرے گی، یہ سب مسائل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس سنت سے طے ہوئے۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد خلیفہ نامزد کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے: وہ بھی آپؓ کی سنت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنتیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنتیں تو بے شمار ہیں، انھوں نے بہت سے مسائل طے کئے

ہیں، تراویح کے ذریعہ ملت کی تنظیم کی ہے، اور ایک مجلس یا ایک لفظ سے دی ہوئی تین طلاقیں، جبکہ تاکید کی نیت نہ ہو: تین قرار دے کر چور دروازہ بند کردیا ہے، یہ ملت کی تنظیم ہے۔ اور عراق جو لڑکر فتح کیا گیا تھا اس کی زمینیں مجاہدین میں تقسیم نہ کرنا اور ذمیوں پر جزیہ کی جو شرح مقرر کی ہے یہ سب ملک کی تنظیم ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سنتیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دو زبردست کام کئے ہیں، ایک: جمعہ کی اذان بڑھائی ہے، یہ ملت کی تنظیم ہے۔ دوسرا: امت کو لغت قریش پر جمع کیا ہے، یہ بھی ملت کی تنظیم ہے۔

قرآن قریش کی لغت میں نازل ہوا تھا، پھر اسے متعدد طرح سے پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی، چنانچہ لوگ مختلف طرح سے پڑھتے بھی تھے اور مختلف طرح سے لکھتے بھی تھے، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسلمانوں میں اس سلسلہ میں اختلافات شروع ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کی جو اصل تحریریں تھیں وہ منگوائیں اور قریش کی زبان میں جو قرآن نازل ہوا تھا، اور جس کو نبی ﷺ نے لکھوایا تھا اور ملاحظہ بھی فرمایا تھا، اُس لغت میں متعدد قرآن تیار کرا کر پورے ملک میں پھیلا دیئے اور حکم دیا کہ اس کے علاوہ جو بھی قرآن لکھے گئے ہیں وہ مدینہ میں بھیج دیئے جائیں، آپؓ نے ان سب کو جلوا دیا۔ اور جو سات طرح سے قرآن پڑھنے کی اجازت تھی اس کو موقوف کردیا، جیسے حضرت عمرؓ نے مؤلفۃ القلوب کا حصہ موقوف کردیا تھا، یہ حضرت عثمانؓ کی سنتیں ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سنت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمان آپس میں لڑے، پہلی لڑائی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوئی، اس جنگ میں حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار تھیں، اس لئے وہ جنگ جمل کہلاتی ہے، اس جنگ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہاریں، اور قیدی پکڑے گئے، حضرت عائشہؓ بھی قیدیوں میں تھیں، مالِ غنیمت بھی جمع ہوا، پس حضرت علیؓ کی فوج نے مطالبہ کیا کہ مالِ غنیمت تقسیم کیا جائے، حضرت علیؓ نے تقریر فرمائی، اور فرمایا: اگر مالِ غنیمت

تقسیم ہوگا تو قیدی بھی غلام باندی بنائے جائیں گے، پس تم میں سے کون منحوس ہے جو اپنی ماں حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اپنی باندی بنائے گا؟ بس سناٹا چھا گیا، اور مسئلہ طے ہوگیا کہ اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑیں تو نہ مال: مالِ غنیمت ہوگا، اور نہ قیدی، غلام باندی بنائے جائیں گے۔ یہ حضرت علیؓ کی سنت ہے، اور یہ خلفائے راشدین کے وہ طریقے ہیں جو ملک وملت کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو حدیث شریف کی رو سے اپنانا ضروری ہے۔

حدیث یا سنت کا فیصلہ کون کرے گا؟

بہر حال حجت سنت ہے، حدیث حجت نہیں، اب رہا یہ سوال کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں حدیث سنت ہے، اور فلاں حدیث سنت نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا فیصلہ مجتہدین کریں گے، اور اس میں کبھی اختلاف بھی ہوجاتا ہے۔

مثلاً: تمام فقہاء متفق ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضوء نہیں ٹوٹتی، پس حدیث **توضئوا ممامست النار**: صرف حدیث ہے، سنت نہیں، اور تمام فقہاء متفق ہیں کہ مجامعت شروع ہوتے ہی غسل واجب ہوجاتا ہے، چاہے فراغت نہ ہوئی ہو، پس حدیث **الماء من الماء** صرف حدیث ہے، سنت نہیں۔

اور نماز میں رفع یدین کی بھی حدیثیں ہیں اور ترک رفع کی بھی۔ اب بڑے دو امام کہتے ہیں: رفع یدین کی حدیثیں منسوخ ہیں، اس لئے سنت ترک رفع ہے۔ اور دوسرے دو اماموں کا فیصلہ اس کے برعکس ہے، ایسا ہی اختلاف آمین بالجہر کی حدیث میں ہوا ہے۔ دو بڑے امام کہتے ہیں: آپؐ کا جہر حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی تعلیم کے لئے تھا، اس لئے سنت نہیں، اور دوسرے دو امام جہراً آمین کہنے کو سنت قرار دیتے ہیں۔ اور ایسے ہی اختلاف کی صورت میں تقلید کی ضرورت پیش آتی ہے۔

تقلید صرف تین قسم کے مسائل میں ہے، اور ان میں تقلید کے بغیر چارہ نہیں:

اور ائمہ کی تقلید صرف تین قسم کے مسائل میں کی جاتی ہے، باقی ساری شریعت میں کسی کی تقلید نہیں کی جاتی، اللہ اور اس کے رسول ہی کی تقلید کی جاتی ہے، اور ان تین قسم کے مسائل

مکتبہ حجاز دیوبند

میں تقلید کے علاوہ چارہ نہیں۔ اور وہ تین قسم کے مسائل فقہ کے بیس فیصد مسائل ہیں۔

وہ تین قسم کے مسائل یہ ہیں:

۱- کبھی نص فہمی میں اختلاف ہوجاتا ہے کہ اِس آیت کا اور اِس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ ایک امام کہتا ہے: یہ مطلب ہے، دوسرا کہتا ہے: یہ مطلب ہے، اور زبان کی رو سے دونوں مطلب ہوسکتے ہیں تو تقلید کے علاوہ چارہ نہیں رہتا۔

۲- کبھی ناسخ ومنسوخ متعین کرنے میں اختلاف ہوجاتا ہے، یعنی کونسی روایت مقدم ہے اور کونسی مؤخر: اس میں اختلاف ہوجاتا ہے۔

۳- کبھی مسئلہ استنباطی ہوتا ہے، نص کی تہ میں جا کر مسئلہ لانا ہوتا ہے، اور اس میں اختلاف ہوجاتا ہے۔ سب کی مثالیں یہ ہیں:

نص فہمی میں اختلاف کی مثالیں:

پہلی مثال: قرآنِ کریم میں ہے: ﴿أَوْ لاَ مَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾: یا تم نے عورتوں سے قربت کی ہو۔ اس آیت میں وضوء توڑنے والی چیز کا ذکر ہے یا غسل توڑنے والی چیز کا؟ قرآنِ کریم میں **لاَمَسَ**: باب مفاعلہ سے ہے، **لَمَسَ**: مجرد نہیں ہے، **لَمَسَ** کے معنی ہیں: چھونا، اور **لاَمَسَ** کے معنی ہیں: دو شخصوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کو چھونا۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت میں موجباتِ غسل کا بیان ہے، **لاَمَسَ** باب مفاعلہ سے ہے، اور ایک ساتھ مرد عورت کو پکڑے اور عورت مرد کو پکڑے: ایسا کب ہوتا ہے؟ جب آدمی صحبت کرتا ہے اور فراغت کا وقت آتا ہے تو مرد بیوی کو پکڑتا ہے اور بیوی مرد کو، اور دونوں فارغ ہوتے ہیں۔ پس جب انزال ہوگیا تو غسل واجب ہوگیا۔ غرض امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿لاَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ میں نواقض غسل کا بیان ہے۔

اور دوسرے تین اماموں کے نزدیک **لاَمَسَ**: **لَمَسَ** کے معنی میں ہے اور اس آیت میں نواقض وضوء کا بیان ہے، وہ کہتے ہیں: اگر باوضوء آدمی نے کسی عورت کو ہاتھ لگایا تو وضوء ٹوٹ گئی۔ اور عربی زبان کے قواعد سے دونوں معنی کی گنجائش ہے، ہر ایک کی بات معقول نظر آتی ہے، پس یہ نص فہمی کا اختلاف ہے۔

دوسری مثال: اسی آیت کا اگلا ٹکڑا ہے: ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنكُمْ مِنَ الْغَائِطِ﴾: یا آیا ہو تم میں سے کوئی نشیبی جگہ سے (تو وضوء ٹوٹ جائے گی) اب فقہاء میں اختلاف ہوا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: جب آدمی نشیبی جگہ میں جاتا ہے تو انسان کے بدن سے ناپاکی نکلتی ہے، پس سر سے پیر تک کہیں سے بھی ناپاکی نکل کر بہہ جائے: تو وضوء ٹوٹ جائے گی۔ دو راہوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ اور تین اماموں نے کہا: نشیبی جگہ میں ناپاکی اگلی راہ سے یا دونوں راہوں سے نکلتی ہے، باقی جسم سے نہیں نکلتی، اس لئے انھوں نے طے کیا کہ سبیلین سے ناپاکی نکلے گی تو وضوء ٹوٹے گی، ورنہ نہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک قئی، نکسیر، پھوڑے پھنسی سے پیپ یا خون نکلنے سے وضوء نہیں ٹوٹتی۔

جب ایسا اختلاف ہو جائے تو ہم کیا کریں؟ جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی تقلید کرے، ایسی صورت میں تقلید کے علاوہ راستہ کیا ہے؟ ہمارے پاس اتنا علم نہیں کہ ہم خود فیصلہ کریں کہ آیت کا یہ مطلب ہے یا وہ۔

تیسری مثال: نبی پاک ﷺ نے فرمایا: صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خِفْتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِرَكْعَةٍ: رات کی نماز (تہجد کی نماز) دو دو، دو دو رکعتیں ہیں، پس جب تمہیں اندیشہ لاحق ہو کہ صبح صادق ہونے والی ہے تو ایک رکعت کے ذریعہ نماز کو طاق بناؤ۔

اس حدیث میں دو مسئلوں میں اختلاف ہوا ہے:

پہلا اختلافی مسئلہ: تہجد کی نماز میں ہر دو رکعت پر سلام پھیرنا مسئلہ ہے یا یہ تہجد گذاروں کے لئے سہولت ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ تہجد گذاروں کے لئے ایک سہولت ہے، مسئلہ نہیں ہے۔

مسئلہ کیا ہے: مسئلہ اختلافی ہے کہ نفلوں میں دو پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے یا چار پر؟ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کہتے ہیں: خواہ رات کے نفل ہوں یا دن کے (اور سنت مؤکدہ بھی نفل ہیں) دو رکعتوں پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے، اور اگر کوئی ایک سلام سے چار پڑھے تو یہ بھی جائز ہے، البتہ دو رکعت پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے۔

اور امام مالکؒ فرماتے ہیں: رات میں ایک سلام سے چار رکعتیں پڑھنا جائز ہی نہیں،

اور دن میں اولیٰ یہ ہے کہ دو پر سلام پھیرے، اور چار ایک سلام سے جائز ہیں۔

اور صاحبینؒ نے فرمایا کہ رات میں دو پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے، اور دن میں چار نفلیں ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا: رات کے نفل ہوں یا دن کے: چار ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے، اور دو پر سلام پھیرنا جائز ہے۔

اور امام اعظم کی دو دلیلیں ہیں:

ایک: دن میں بھی فرض نماز چار رکعتوں والی ہے (ظہر اور عصر) اور رات میں بھی فرض نماز چار رکعتوں والی ہے (عشاء) اور فرائض غیر اولیٰ ہیئت پر نہیں ہو سکتے، بہترین حالت پر ہی فرائض ہوتے ہیں۔ پس ایک سلام سے چار نفلیں پڑھنا اولیٰ ہے۔

دوسری دلیل: نبی ﷺ سے دن میں چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا ثابت ہے، حضور ظہر سے پہلے چار سنتیں ہمیشہ ایک سلام سے پڑھتے تھے، اور کبھی عصر سے پہلے بھی چار سنتیں ایک سلام سے پڑھتے تھے، اور نبی کبھی مسئلہ کی وضاحت کے لئے تو غیر اولیٰ کام کر سکتا ہے، جیسے آپؐ نے ایک مرتبہ کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا، مگر نبی بالدوام یا بالاکثر غیر اولیٰ کام نہیں کرتا، اور حضورؐ نے دن میں چار سنتیں ہمیشہ یا اکثر ایک سلام سے پڑھی ہیں، اس لئے یہی افضل ہے، اور رات کے نفلوں کو دن کے نفلوں پر قیاس کریں گے، پس رات میں بھی چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے۔

اور حضورؐ نے جو فرمایا ہے: صلاۃُ اللیل مثنیٰ مثنیٰ: امام اعظم رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ مسئلہ نہیں ہے، مصلحت ہے، یہ تہجد گذاروں کے لئے ایک سہولت ہے۔

صحابہ تہجد کی نماز بہت لمبی پڑھتے تھے، پس اگر چار کی نیت باندھیں گے تو تھک جائیں گے، اس لئے فرمایا: دو کی نیت باندھو اور لمبی پڑھو، پھر سلام پھیر کر ذرا ٹانگیں سیدھی کرو، اور ستا لو، پھر اگلی دو کی نیت باندھو۔ اس طرح اگر کوئی رات بھر بھی نفلیں پڑھتا رہے تو تھکے گا نہیں۔

بہر حال حدیث کے پہلے ٹکڑے میں اختلاف ہوا ہے، امام اعظم کی رائے اور ہے، اور

صاحبین کی اور، اور دیگر ائمہ کی اور۔ اور سب حضرات اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، پس ایسی صورت میں تقلید کے علاوہ راستہ کیا ہے؟

دوسرا اختلافی مسئلہ: حدیث کا اگلا ٹکڑا ہے: إِذَا خِفْتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِرَكْعَةٍ: جب تمہیں اندیشہ لاحق ہو کہ اب صبح ہونے والی ہے تو ایک رکعت کے ذریعہ نماز کو طاق بناؤ۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ تین امام کہتے ہیں: اب دو رکعتوں پر سلام پھیر دو، اور ایک رکعت علاحدہ پڑھو، ایک رکعت کے ذریعہ طاق بنانے کا یہی مطلب ہے، چنانچہ ان کے نزدیک دو پر سلام پھیرتے ہیں، اور ایک رکعت الگ سلام سے پڑھتے ہیں۔

اور احناف کہتے ہیں: اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں صبح کا اندیشہ لاحق ہو تو اب دو کی نیت مت باندھو، بلکہ تین کی نیت باندھو، اور دو کے ساتھ تیسری رکعت بھی ملاؤ، یہ آخری تین رکعتیں طاق ہو گئیں، اِس سے پہلے والی سب رکعتیں جفت تھیں۔

اور حنفیہ کے نزدیک اس حدیث کا یہ مطلب اس لئے ہے کہ نسائی شریف میں سند صحیح سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی ﷺ وتروں کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے(۱) اس حدیث کی روشنی میں حنفیہ نے مذکورہ بالا حدیث کا مطلب سمجھا ہے۔

احناف کے نزدیک أوتر برکعة: ایک رکعت کے ذریعہ نماز طاق بناؤ کا یہی مطلب ہے کہ اس سے پہلے والی دو رکعتوں کو طاق بناؤ، غرض یہی حدیث حنفیہ کی بھی دلیل ہے اور تین اماموں کی بھی، اور اختلاف نص فہمی کا ہے۔ اب ہم کیا کریں؟ ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے: جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی تقلید کرے۔

روایات میں بھی اختلاف اور تطبیق میں بھی اختلاف:

دوسری قسم کے مسائل: کبھی روایات میں بھی تعارض ہوتا ہے، اور ان کی تطبیق میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے، یعنی ناسخ ومنسوخ کی تعیین میں اختلاف ہو جاتا ہے، جیسے حدیث کی کتابوں میں رفع یدین کی روایات بھی ہیں اور عدم رفع کی بھی، یہ دونوں روایتیں ایک زمانہ کی نہیں ہو سکتیں۔ اب ان میں سے کونسی دور اول کی ہیں اور کونسی دور مابعد کی؟ یہ طے کرنے

میں ائمہ میں اختلاف ہوگیا، بڑے دو امام کہتے ہیں: رفع والی روایتیں دورِ اول کی ہیں، اور عدم رفع والی روایتیں بعد کی ہیں، اور چھوٹے دو امام کہتے ہیں: عدم رفع والی روایتیں دورِ اول کی ہیں اور رفع والی بعد کی۔ غرض ناسخ ومنسوخ طے کرنے میں اختلاف ہوگیا، پس ہم کیا کریں؟ یہی کہ جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی تقلید کرے۔

اور بڑے دو اماموں کی دلیل یہ ہے کہ خلفائے راشدین نے رفع یدین نہیں کیا۔ اگر رفع یدین نبی ﷺ کا آخری عمل ہوتا تو چاروں خلفاء رفع ضرور کرتے، ایسا ممکن نہیں کہ خلفاء آپؐ کے مصلیٰ پر کھڑے ہوتے ہی آپؐ کا عمل بدل دیں۔

استنباطی مسائل میں اختلاف:

تیسری قسم کے مسائل: استنباطی مسائل ہیں۔ موتی دریا کی تہ میں ہوتے ہیں، اوپر نہیں تیرتے، اور موتی ہر کوئی نہیں نکال سکتا، غواص (غوطہ خور) ہی نکال سکتا ہے۔ ایسے ہی استنباطی مسائل ہیں: جو قرآن وحدیث کی ظاہری سطح پر نہیں ہیں، بلکہ تہ میں ہیں: ان کو کون نکالے گا؟ مجتہدین امت نکالیں گے، مگر ان میں کبھی اختلاف ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں تقلید (پیروی) کے علاوہ راستہ کیا ہے؟ میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں:

آیتِ وضو میں پانچ استنباطی مسائل اور ان میں اختلاف

قرآنِ کریم میں آیتِ وضوء ہے، اس آیت میں وضوء کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے: دنیا کے تمام مسلمان اسی طرح وضوء کرتے ہیں، لیکن اس آیت میں پانچ استنباطی مسائل ہیں، جن میں اختلاف ہوا ہے:

پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ وضوء میں نیت ضروری ہے یا نہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ضروری ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک: ضروری نہیں، اور اس کی صرف نادر صورت ہے: ایک آدمی کھیت میں ہل چلا رہا تھا، بارش شروع ہوگئی اور وہ سر سے پیر تک بھیگ گیا، اب نماز کا وقت آگیا، تو کیا نماز پڑھنے کے لئے اُس کو وضوء کرنی پڑے گی یا وہ جو بھیگا ہے اس سے وضوء ہوگئی؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے وضوء نہیں ہوئی، اس لئے کہ اس نے نیت نہیں کی، اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں: اس کی وضوء ہوگئی۔

یا ایک آدمی جنبی تھا اور تالاب پر کھڑا تھا، اس کا دوست آیا اور دھکا دیدیا، وہ تالاب میں گر پڑا اور ڈوب کر نکل آیا، پس کیا اس کا غسل ہو گیا؟ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: نہیں ہوا، کیونکہ اس نے غسل کی نیت نہیں کی، اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں: غسل ہو گیا۔ یہ مسئلہ آیت کے ظاہر میں نہیں ہے، یہ استنباطی مسئلہ ہے، اور اس میں اختلاف ہوا ہے، پس ہم کیا کریں؟ یہی نا کہ جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی پیروی کرے۔

دوسرا مسئلہ: آیت میں وضوء کی جو ترتیب ہے وہ لازم ہے یا غیر لازم؟ یعنی اسی ترتیب سے وضوء کرنی ضروری ہے یا نہیں؟ ایک آدمی کھیت سے آیا، اس نے پہلے مٹی سے آلودہ پیر دھوئے، پھر چہرہ دھویا، پھر ہاتھ دھوئے اور مسح کیا، تو وضوء ہوئی یا نہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وضوء نہیں ہوئی، کیونکہ وضوء میں ترتیب ضروری ہے، دوسرے ائمہ کہتے ہیں: وضوء ہو گئی، ترتیب سنت ہے، ضروری نہیں، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں جو واو ہے وہ ترتیب کے لئے ہے یا مطلق جمع کے لئے؟ اس میں اختلاف ہوا ہے، اور یہ استنباطی مسئلہ ہے، اس میں تقلید کے علاوہ چارہ کیا ہے؟

تیسرا مسئلہ: آیت وضوء میں **إلی المرافق** اور **إلی الکعبین** ہے، یعنی ہاتھوں کو کہنیوں تک اور پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ، اس ''تک'' کا کیا مطلب ہے؟ کہنیاں دھونی ہیں یا نہیں؟ ٹخنے دھونے ہیں یا نہیں؟ امام زفر رحمہ اللہ کہتے ہیں: نہیں ہونے، غایت: مغیا سے خارج ہے۔ باقی ائمہ کہتے ہیں: دھونے ہیں، غایت: مغیا میں داخل ہے۔ غرض **إلی** کے معنی متعین کرنے میں اختلاف ہو گیا۔

چوتھا مسئلہ: وضوء میں موالات شرط ہے یا نہیں؟ موالات کے معنی ہیں: ایک عضو خشک ہونے سے پہلے دوسرا عضو دھونا۔ کسی نے ایک عضو دھویا، پھر کسی سے باتیں کرنے لگا، اور دھویا ہوا عضو خشک ہو گیا، پھر اگلا عضو دھویا تو وضوء ہوئی یا نہیں؟ امام مالکؒ کہتے ہیں: وضوء نہیں ہوئی، موالات شرط ہے۔ باقی ائمہ کہتے ہیں: وضوء ہو گئی۔

پانچواں مسئلہ: وضوء میں پیر دھونے ہیں یا ان پر مسح کرنا ہے؟ شیعہ کہتے ہیں: پیروں پر مسح کرنا ہے، اور اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں: پیر دھونے ہیں، اگر ان پر خفین نہ ہوں۔

مکتبہ حجاز دیوبند

شیعہ آیت کی جر والی قراءت سے استدلال کرتے ہیں، اور اہل السنہ فتح والی قراءت سے۔

میں یہ مثالیں اس کی دے رہا ہوں کہ جو استنباطی مسائل ہیں، جو نص کی تہ میں ہیں، ان مسائل میں غواصوں (ائمہ مجتہدین) کے درمیان اختلاف ہوئے ہیں، پس یہ تین قسم کے مسائل ہیں: ۱- نص فہمی کا اختلاف ۲- جہاں روایات میں تعارض ہو اور تطبیق میں بھی اختلاف ہو ۳- استنباطی مسائل، جن کے استنباط میں اختلاف ہو جائے تو ان تین قسم کے مسائل میں تقلید کرنی ضروری ہے، ان میں تقلید کے علاوہ کوئی راستہ نہیں، اور یہ مسائل فقہ اسلامی کا بیس فیصد حصہ ہیں، باقی اسّی فیصد مسائل وہ ہیں جو قرآن وحدیث میں صراحۃً آئے ہیں، ان میں کسی امام کی تقلید نہیں، ان میں اللہ ورسول ہی کی تقلید کی جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام: میں نے خطبہ میں آیت پڑھی تھی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ أَدْعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ﴾ آپ کہئے: یہ میرا راستہ ہے۔ اسی راستہ کا نام سنت ہے، اور مشہور حدیث ہے کہ یہود کے اکہتر فرقے ہوئے، جو سب جہنم میں جائیں گے، اور عیسائیوں کے بہتر فرقے ہوئے، وہ بھی سب جہنم میں جائیں گے، اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے، جن میں سے بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا، صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ ایک فرقہ جو جنت میں جائے گا: کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ: وہ ایک فرقہ وہ ہے جو اس طریقہ پر ہوگا جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ یہیں سے چار ائمہ کے متبعین کے لئے نام تجویز کیا گیا: اہل السنہ والجماعۃ: سنتِ نبوی اور جماعت مسلمین کے فیصلوں (اجماع) کو ماننے والے، جس راہ پر حضور ہیں اس کا نام سنت ہے، اور جس راہ پر صحابہ ہیں وہ جماعت مسلمین کے اجماعی مسائل ہیں۔

حدیث کے حجت ہونے کی کوئی دلیل نہیں:

حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِيْ فَلَهٗ أَجْرُ كَذَا: جب امت میں بگاڑ آجائے: اس وقت جو میرے طریقے سے چمٹا رہے گا اس کو اتنا ثواب ملے گا۔ اور مشکوٰۃ میں باب ہے: باب الاعتصام بالكتاب والسنة: اس باب میں چھ روایتیں ہیں، سب میں سنت ہی کا لفظ ہے۔ اس لئے چار ائمہ کے ماننے والوں کا

مشترک نام: اہل السنہ والجماعۃ ہے۔ اور وہ جو چار ہو گئے ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسے دیوبند، سہارن پور اور لکھنؤ سے فارغ ہونے والے طلبہ اگرچہ قاسمی، مظاہری اور ندوی کہلاتے ہیں، مگر وہ سب دیوبندی ہیں، اسی طرح حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی اگرچہ جدا جدا نام ہیں، مگر وہ سب اہل السنہ والجماعۃ ہیں، اور ان کے درمیان جو اختلافات ہیں: وہ مسائل میں ہیں، اصول وعقائد میں کوئی اختلاف نہیں، اور مسائل کے اختلاف سے فرقے نہیں بنتے، فرقے عقائد میں اختلاف سے بنتے ہیں، اور وہ جو تہتر فرقوں والی حدیث ہے اس کا تعلق عقائد سے ہے، مسائل سے نہیں ہے۔ جب اصول وعقائد الگ ہو جاتے ہیں تو فرقوں کے نام الگ ہو جاتے ہیں، کوئی اہل حدیث کہلاتا ہے، کوئی اہل قرآن۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ حدیث اور سنت ایک چیز ہے: وہ دھوکہ ہے۔ میرے بھائیو! اس دھوکہ میں مت آؤ، اہل قرآن بھی تو یہی کہتے ہیں کہ ہم قرآن کے ماننے والے ہیں۔ یہ سب گمراہ فرقے ہیں، اور سنت اور حدیث ایک چیز نہیں ہیں، بلکہ ان میں وہ فرق ہے جو میں نے گوش گذار کیا، اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

آپ کے ملک میں کچھ لوگ فتنہ پرداز ہیں، وہ آکر نوجوانوں کو پریشان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ حدیث ہے، یہ بخاری کی حدیث ہے، نوجوان پریشان ہو جاتے ہیں کہ اب ہم کیا کریں؟ اس لئے میں نے فرق سمجھایا کہ حدیث اور ہے اور سنت اور۔ اور سنت کو مضبوط پکڑنے کا حکم ہے، حدیث کو نہیں، وہ لوگ اہل حدیث ہوں تو ہوتے رہیں، ہم اہل السنہ والجماعۃ ہیں، پس ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

اجماع بھی حجت شرعیہ ہے!

اور اجماع بھی حجتِ شرعیہ ہے، اور اس کا استناد قرآن سے ثابت ہے، سورۃ النساء کی (آیت ۱۱۵) ہے کہ جو مسلمانوں کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہولیا: وہ جہنم رسید ہوگا۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی آیت سے اجماع کی حجیت پر استدلال کیا ہے، اس لئے اہل حق کے نام کا دوسرا جزء والجماعۃ ہے۔

ناچنا نہیں آنگن ٹیڑھا!

اور اہل حدیث (غیر مقلدین) اجماع کی حجیت کے قائل نہیں، عرف الجادی کے مقدمہ میں اس پر بحث ہے، مگر وہ صاف انکار نہیں کر سکتے، مسلمان ان کے منہ پر تھوکیں گے، اس لئے کہتے ہیں: ہم قطعی اجماع کو مانتے ہیں، ظنی اجماع کو نہیں مانتے!

تو کیا اجماع کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ہوگا؟ قطعی ہونے کی اس کے علاوہ کیا صورت ہے؟ یا تواتر سے منقول ہوگا، درانحالیکہ کوئی حدیث متواتر ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، پھر جب خبرِ واحد جو مفید ظن ہے: حجت ہے تو اجماع جو اسی طرح مروی ہو: حجت کیوں نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ناچنا نہیں آنگن ٹیڑھا!

قیاس محض آلۂ استنباط ہے:

رہا قیاس تو وہ حجت بایں معنی ہے کہ وہ آلۂ استنباط ہے، وہ ایک ڈوئی ہے جس کے ذریعہ ڈیگوں سے کھانا نکالا جاتا ہے، اور ڈیگیں: قرآن، سنت اور اجماع امت ہیں۔ قیاس خود کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ آلۂ استنباط مسائل ہے، پس اگر قیاس معتبر نہیں تو یہ تین ڈیگیں بھی معتبر نہیں، ہاں وہ قیاس جس کا کوئی شرعی استناد نہ ہو: وہ حجت نہیں، وہ ابلیس کا قیاس ہے۔

آخری چیلنج!

اب آخر میں ایک چیلنج دیتا ہوں، اور قیامت کی صبح تک دیتا ہوں کہ کوئی ایسی حدیث لاؤ، چاہے وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو کہ نبی ﷺ نے حدیث کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ حدیثیں یاد کرنے کے اور ان کو روایت کرنے کے فضائل آئے ہیں، مگر ایسی ایک حدیث بھی نہیں ہے: جس میں حدیث کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہو۔ تمام حدیثوں میں سنت ہی کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔

۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصلی سلفی اور آج کے سلفی

(یہ تقریر شوال ۱۴۳۰ھ میں ٹورنٹو (کناڈا) کی مسجد دار السلام میں کی گئی ہے)

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ، وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ، وَرَضِیْتُ لَکُمُ الإِسْلَامَ دِیْنًا﴾ [المائدہ ۳]

ترجمہ: آج کے دن (۱۰ھ میں عرفہ کے دن) میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا (قوت اور قواعد واحکام میں) اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا، اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا یعنی اب قیامت تک تمہارا یہی دین رہے گا، اب اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین تجویز نہیں کیا جائے گا۔

مکتبہ حجاز دیوبند

دین کے دو حصے: عقائد اور اعمال

بزرگو اور بھائیو! جیسا کہ آپ جانتے ہیں: اللہ نے جو دین نازل فرمایا ہے اس کے دو حصے ہیں: عقائد اور اعمال، عام طور پر عقائد کو دین اور اعمال کو شریعت کہتے ہیں۔ اور آیتِ پاک میں یہی عام معنی مراد ہیں، مگر دونوں میں بڑا فرق ہے، اور وہ یہ ہے کہ دین بمعنی عقائد آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النّبیین ﷺ تک ایک رہا ہے، اور جب اب تک ایک رہا ہے تو قیامت تک آپؐ کے بعد بھی ایک ہی رہے گا، البتہ گذشتہ نبیوں کے زمانوں میں لوگوں نے دین میں اختلاف کیا اور اختلاف کرتے کرتے لوگ انبیاء کے دین سے بالکل ہٹ گئے، مگر نبی پاک ﷺ کے بعد اگر چہ عقائد میں اختلاف ہوگا، مگر امت مکمل دین سے ہٹ جائے ایسا نہیں ہوگا، قیامت تک امت میں مسلسل ایک طائفہ موجود رہے گا جو دین

حق پر برقرار رہے گا، ان کی مخالفت کرنے والے خواہ کتنی ہی مخالفت کریں ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہ مضمون ایک حدیث میں آیا ہے: **لا تَزَالُ طائفةٌ من أمتی ظَاهِرِیْنَ علی الحق، لَایَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ:**

پس پچھلی امتوں میں اور اس امت میں یہ فرق ہے کہ پچھلی امتیں اپنے انبیاء کے دین وعقائد سے ہٹیں اور مکمل طور پر ہٹ گئیں، ایک گروہ بھی صحیح عقیدہ پر باقی نہ رہا، اس وقت اللہ تعالیٰ دوسرا نبی مبعوث فرماتے تھے اور وہ ان کو صحیح دین وعقائد پر لاتا تھا، لیکن نبی پاک ﷺ آخری نبی ہیں، اب اگر تمام انسان عقائد حقہ سے ہٹ جائیں تو دنیا میں اندھیرا چھا جائے، اور روشنی دکھانے کے لئے کوئی نیا نبی آنے والا نہیں، اس لئے اللہ نے اس کا انتظام یہ کیا ہے کہ حضور ﷺ کے بعد بھی اگرچہ عقائد میں اختلاف ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوگا کہ پوری امت غلط عقائد پر پڑ جائے، بلکہ قیامت تک ایک جماعت صحیح عقائد پر رہے گی۔

البتہ شریعتوں (احکام) کا حال مختلف ہے، آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک نبیوں کی شریعتیں مختلف رہی ہیں، شریعت: اعمال کا نام ہے اور اعمال میں اختلاف رہا ہے، ایک نبی کی شریعت میں کچھ احکام ہوتے تھے، دوسرے نبی کی شریعت میں وہ منسوخ کئے جاتے تھے، اور دوسرے احکام آتے تھے، پس نبی پاک ﷺ کے بعد بھی احکام میں اختلاف ہوگا لیکن اس اختلاف میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ اختلاف تو شریعتوں میں بھی رہا ہے اور جب شریعتوں میں اختلاف رہا ہے تو حضورؐ کی امت میں بھی اعمال میں اختلاف ہوگا اور یہ اعمال میں اختلاف کوئی اہم بات نہیں، لیکن دین بمعنی عقائد میں اختلاف برداشت نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ دین آدمؑ سے آخری نبیؐ تک ایک ہی رہا ہے۔

البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ انبیاء کی شریعتوں میں اختلاف صرف ایک فیصد رہا ہے، قوموں کے مزاج اور زمانوں کے تقاضوں کا لحاظ کرکے کچھ احکام علاحدہ دیئے جاتے تھے۔

اور اس کی نظیر: ہماری شریعت میں مردوں اور عورتوں کے احکام کا اختلاف ہے، یہ اختلاف بھی ایک فیصد ہے، دین دونوں کے لئے ایک ہے، جو عقائد مردوں کے لئے ہیں: وہی عورتوں کے لئے بھی ہیں، اور جو احکام نوعی ہیں: وہ بھی یکساں ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج

وغیرہ دونوں کے لئے ضروری ہیں، البتہ صنفی احکام عورتوں کے لئے علاحدہ ہیں، ان کو ماہواری آتی ہے، ان کا بدن پر کشش بنایا گیا ہے، مردوں کو یہ عارضہ پیش نہیں آتا، اور نہ ان کا بدن پر کشش ہے، اس لئے حیض وغیرہ کے احکام عورتوں کے لئے ہیں، اور حجاب (پردہ) کا حکم بھی انہی کے لئے ہے۔ اور احکام کا یہ اختلاف ایک فیصد سے زیادہ نہیں۔

عقائد میں اختلاف صحابہ کے بعد ہوا:

اس امت کا پہلا قافلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا، ان کے زمانہ تک عقائد میں اختلاف نہیں ہوا، یہ اختلاف تابعین کے زمانہ سے شروع ہوا۔ اور اعمال میں اختلاف صحابہ کے زمانہ میں بھی ہوا ہے، نہ صرف صحابہ کے زمانہ میں بلکہ حضورؐ کی حیات میں صحابہ میں اختلاف ہوا ہے، مشہور واقعہ ہے: غزوۂ احزاب میں بنو قریظہ نے غداری کی تھی، نبی پاک ﷺ نے غزوۂ احزاب سے فارغ ہونے کے بعد صحابہ کو حکم دیا کہ فوراً تیاری کرو اور بنو قریظہ پر چڑھائی کرو اور عصر کی نماز وہاں جا کر پڑھو، چنانچہ صحابہ نے ضروری سامان لیا اور بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو گئے، راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو صحابہ میں اختلاف ہوا، بعض نے کہا: ہمیں حضورؐ نے حکم دیا ہے کہ عصر کی نماز بنو قریظہ میں جا کر پڑھو، لہٰذا ہم عصر کی نماز وہیں پڑھیں گے، اور بعض نے کہا: حضور کے حکم کا منشا یہ تھا کہ فوراً بنو قریظہ پہنچو، عصر کی نماز قضا کرو: یہ حضورؐ کا منشا نہیں تھا، چنانچہ آدھوں نے عصر کی نماز پڑھی اور آدھوں نے نہیں پڑھی، پھر آگے چلے: مغرب کا وقت ہوا تو سب نے مغرب پڑھی، کیونکہ حضورؐ نے مغرب کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا تھا، پھر عشاء کے وقت لشکر بنو قریظہ پہنچا، وہاں جا کر جنھوں نے عصر نہیں پڑھی تھی انھوں نے عصر پڑھی، پھر سب نے عشاء پڑھی۔ نبی پاک ﷺ دوسرے دن صبح پہنچے، حضورؐ سے یہ واقعہ ذکر کیا گیا، حضورؐ نے دونوں جماعتوں میں سے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

اور حدیث ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، ہم تقدیر کے مسئلہ میں جھگڑ رہے تھے، پس آپؐ اس حد تک غضبناک ہوئے کہ رخ انور سرخ ہو گیا، گویا آپؐ کے دونوں رخساروں میں انار نچوڑ دیئے گئے ہیں، پس آپؐ نے فرمایا: "کیا تمہیں اسی کا حکم دیا گیا ہے؟ اور کیا میں اسی کے ساتھ تمہاری طرف بھیجا

گیا ہوں؟ وہ لوگ جو تم سے پہلے ہوئے وہ اسی وقت ہلاک ہوئے: جب انھوں نے اس معاملہ میں جھگڑا شروع کیا، میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ تقدیر میں مت جھگڑو“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگلے لوگوں نے جب تقدیر میں بحث وتکرار شروع کی تو ان میں فکری گمراہی رونما ہوئی، اور وہ جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے، یہی معاملہ دیگر عقائد کا ہے، جب ان میں نزاع شروع ہوگا تو ضرور کچھ لوگ صراطِ مستقیم سے ہٹ جائیں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی پاک ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کے درمیان احکام میں اختلاف ہوا ہے، لیکن عقائد میں اختلاف صحابہ کے زمانہ میں نہیں ہوا، عقائد کا اختلاف تابعین کے زمانہ سے شروع ہوا۔

صحابہ کے بعد اختلاف کی وجوہ:

اور وہ جو تہتر فرقوں والی حدیث ہے اس حدیث کے شروع میں حضورؐ نے سین استعمال کیا ہے۔ ستفترق امتی: عنقریب میری امت میں اختلاف ہوگا، اس سین میں اشارہ ہے کہ صحابہ کے زمانہ تک یہ اختلاف نہیں ہوگا، اس کے بعد یہ اختلاف ہوگا۔

مکتبہ حجاز دیوبند

اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی پہلی وجہ: یہ ہے کہ صحابہ حضورؐ کے شاگرد تھے، تبع تابعین: تابعین کے شاگرد تھے اور استاذ سے جتنا بُعد ہوتا جاتا ہے اثر کمزور پڑتا جاتا ہے، جیسے صحن میں کھڑے ہوئے شخص پر دھوپ براہ راست پڑتی ہے اور دھوپ میں کھڑے ہوکر، آئینے سے اس مسجد میں فوکس (عکس) ڈالیں اور دھوپ یہاں آئے تو دونوں دھوپوں میں بڑا فرق ہوگا، کیونکہ وہاں سورج کی دھوپ براہ راست آرہی ہے اور یہاں بالواسطہ دھوپ آرہی ہے، اس لئے اس میں کمزوری ہوگی، یا جیسے سورج نکل کر اپنی روشنی زمین پر براہِ راست ڈالتا ہے اور چاند پر بھی ڈالتا ہے، پھر چاند زمین پر روشنی ڈالتا ہے تو دونوں روشنیوں میں فرق ہوتا ہے، اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ صحابہ کی خصوصیت اس وجہ سے ہے کہ ان کے معلم حضورؐ تھے، پھر آگے کمزوری آئی، کیونکہ معلم اول سے دوری ہوگئی اور معلم اول سے جتنی دوری ہوتی جائے گی فتنے شروع ہونگے۔ اسی لئے حدیثوں میں قیامت کے قریب فتنوں کی خبریں دی گئی ہیں، کیونکہ معلم

اول سے زمانہ دور ہو جائے گا۔

اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کی بعثت دوہری ہے: آپؐ براہ راست کام کے اعتبار سے امیوں کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے، اور باقی دنیا کی طرف کام کے اعتبار سے صحابہ کے واسطے سے مبعوث فرمائے گئے تھے، اس طرح صحابہ بھی نیابۃً مبعوث ہیں، اور انھوں نے ہی آپؐ کے بعد ساری دنیا تک دین پہنچایا ہے، اس لئے جس طرح آپؐ معصوم ہیں: صحابہ محفوظ ہیں۔ اور عملی خرابی سے بڑی عقیدوں کی خرابی ہے، چنانچہ اللہ نے دونوں قسم کی خرابیوں سے صحابہ کی حفاظت فرمائی، یہ بہت تفصیل طلب مضمون ہے۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں مبحث سادس کے دوسرے باب میں یہ مضمون تفصیل سے بیان کیا ہے، اور میں نے رحمۃ اللہ الواسعہ کی دوسری جلد میں اس کی مفصل شرح کی ہے۔

قرونِ ثلاثہ زمانہ کے عرض میں ایک ساتھ ہیں:

صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور چوتھا دور زمانہ کے طول میں بھی ہیں اور چوڑائی میں بھی، زمانہ کی لمبائی کو تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ صحابہ کا دور ختم ہوا تو تابعین کا دور شروع ہوا، وہ ختم ہوا تو تبع تابعین کا دور شروع ہوا۔ اور زمانہ کی چوڑائی میں بھی یہ تینوں دور ساتھ ساتھ چلتے ہیں، کیونکہ صحابی وہ ہے جس نے حالتِ ایمان میں نبی پاک ﷺ کی زیارت کی ہے، اور ایمان ہی پر اس کی وفات ہوئی ہے، اور حضورؐ کے زمانے میں سارے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل گیا تھا، مگر جتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے: سب نے حضورؐ کی زیارت نہیں کی تھی، جس کی قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی اسی نے حضورؐ کی زیارت کی تھی، پھر مدینہ سے کوئی صحابی مثال کے طور پر سفر کرتے ہوئے کسی قبیلہ کے پاس سے گذرے یا زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے یا گورنر بن کر کسی قبیلہ میں گئے تو وہاں کے مسلمانوں نے صحابی کو دیکھا، پس وہ تابعی ہوگئے، یہ تابعی بھی حضور کے زمانہ میں موجود تھے، اور حضورؐ کے زمانہ میں بعض مسلمان ایسے بھی تھے جنھوں نے کسی صحابی کو بھی نہیں دیکھا تھا، بلکہ ان لوگوں کو دیکھا تھا جنھوں نے کسی صحابی کو دیکھا ہے، پس یہ تبع تابعین ہوئے، پھر ایسے بھی مسلمان تھے جنھوں نے کبھی کسی تابعی کو بھی نہیں دیکھا

تھا، بلکہ تبع تابعین کو دیکھا تھا تو ان کا شمار چوتھے قرن میں ہوگا، کیونکہ حضورؐ نے تین ہی درجے قائم فرمائے ہیں: **خیر الناس قرنی، ثم الذین یَلُوْنَھُمْ، ثم الذین یلونھم:** بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر اس سے متصل زمانہ ہے، اور یہ متصل ہونا لمبائی بھی ہے اور چوڑائی میں بھی۔ پھر وہ لوگ ہیں جو ان سے متصل ہیں پس صحابہ، تابعین اور تبع تابعین خیر القرون ہیں اور چوتھے قرن کے لئے کوئی فضیلت نہیں۔

دو مکتبِ فکر: حجازی اور عراقی:

اور یہ تو آپ جان چکے ہیں کہ امت میں صحابہ کے زمانہ سے مسائل میں اختلاف چلا آرہا ہے، مگر ان کے زمانہ میں فقہی مکاتب فکر وجود میں نہیں آئے تھے، سب سے پہلی تقسیم جو امت میں ہوئی وہ یہ ہے کہ امت دو حصوں میں منقسم ہوئی، ایک: حجازی مکتبِ فکر وجود میں آیا اور دوسرا: عراقی مکتبِ فکر، اور اس تقسیم کی وجہ یہ ہوئی کہ حضورؐ کے بعد جو چار خلفاء ہوئے ہیں ان میں سے تین مدینہ میں رہے ہیں، اس وقت تمام علماء مدینہ میں اکٹھا تھے، پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو وہ خلافت کو لے کر کوفہ (عراق) چلے گئے اور ان سے پہلے وہاں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھیج چکے تھے، اس لئے ان کے شاگرد وہاں پہلے سے موجود تھے، اب جب خلافت یہاں آئی تو سارے علماء اِدھر آگئے، اس طرح قدرتی طور پر دو مکتبِ فکر بن گئے، ایک: حجازی مکتب فکر: جو تین خلفاء اور ان کے زمانہ کے علماء سے بنا، اور ایک عراقی مکتب فکر: جو حضرت ابن مسعود، حضرت علی اور ان کے شاگردوں سے بنا، سب سے پہلی تقسیم امت میں یہی ہوئی ہے، اس سے پہلے مکاتب فکر کا اختلاف نہیں تھا، پوری امت ایک تھی اور جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا: وہ جو بھی عالم ملتا اس سے پوچھ لیتا تھا، لیکن جب امت دو مکتبِ فکر میں بٹ گئی تو آہستہ آہستہ ایسا ہونے لگا کہ حجازی مکتب فکر کا جو ذہن رکھتے تھے وہ اپنے مکتبِ فکر کے عالم ہی سے مسئلہ پوچھتے تھے، عراقی مکتب فکر کے عالم سے مسئلہ نہیں پوچھتے تھے، اور جو عراقی مکتب فکر کا ذہن رکھتے تھے وہ اپنے مکتب فکر کے عالم ہی سے مسئلہ پوچھتے تھے، دوسرے سے نہیں پوچھتے تھے، جیسے آج کل حنفی: حنفی عالم ہی سے مسئلہ پوچھتا ہے، شافعی، مالکی، حنبلی سے نہیں پوچھتا، اور شافعی: شافعی عالم ہی سے پوچھتا ہے، دوسروں سے نہیں

پوچھتا، کیونکہ اب چار مکاتب فکر الگ الگ ہوگئے ہیں، اور جب یہ الگ الگ ہوگئے تو یہ قدرتی بات ہے کہ آدمی اپنے مکتبِ فکر ہی کے علماء سے مسئلہ پوچھے گا۔ بہرحال امت میں سب سے پہلے یہ دو مکتب فکر وجود میں آئے، اور یہ تابعین کے زمانہ کی بات ہے۔

دونوں مکاتب فکر کا اصلی اور ذیلی کام:

حجازی مکتب فکر کا اصل کام حدیثیں روایت کرنا تھا اور وہ مسائل جو حدیث میں نہیں ہیں ان کے بارے میں اگر کوئی سوال کرتا تو وہ اس کے بھی جواب دیتے تھے، کیونکہ وہ مجتہد بھی تھے، آج اُس دور کی کتاب موطا مالک موجود ہے، اس میں ایک چوتھائی حدیثیں ہیں اور تین چوتھائی امام مالک کے اقوال ہیں، پس اصل کام ان کا حدیثیں روایت کرنا تھا اس لئے وہ محدثین فقہاء کہلائے۔ وہ درحقیقت محدث ہیں مگر مجتہد بھی ہیں، جو مسائل قرآن وحدیث میں صراحۃً نہیں ہیں ان کے بھی جواب دیتے ہیں۔

اور عراقی مکتب فکر کا اصل کام فقہ پر محنت کرنا تھا، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے جو خلافت مدینہ سے نکل کر عراق میں چلی گئی تھی وہ واپس نہیں آئی اور یہ قدرتی بات ہے کہ گورنمنٹ کو حدیثوں سے زیادہ پیش آمدہ معاملات میں احکام شرعیہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اس مکتب فکر کے علماء کی اصل محنت مسائل پر ہوتی رہی، مگر مسائل کے لئے قرآن وحدیث کو جاننا ضروری ہے، ان کے بغیر مسائل کیسے نکلیں گے، پس وہ قرآن وحدیث بھی جانتے تھے مگر محنت ان کی مسائل پر ہوتی تھی، اس لئے وہ فقہاء محدثین کہلائے یعنی وہ درحقیقت فقہاء تھے، مگر محدث بھی تھے، کیونکہ قرآن وحدیث کے بغیر مسائل نہیں نکل سکتے۔

پھر مسائل طے کرنے میں فقہاء اتنے آگے بڑھ گئے کہ وہ زمانہ سے پانچ سو سال آگے سوچنے لگے کہ اگر یہ صورت پیش آئے تو یہ حکم ہے اور یہ صورت پیش آئے تو یہ حکم ہے، امام محمد رحمہ اللہ کی مبسوط میں ایسے فرضی سوالات، أَرَأَیْتَ (بتلایئے) کے عنوان سے بیان کئے گئے ہیں، ابھی صورتِ مسئلہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے فرض کرلی اور اس کے احکام بیان کردیئے، تاکہ جب وہ صورت پیش آئے تو اس کے احکام پہلے سے معلوم ہوں، اسی لئے لوگوں نے ان کا نام: أَرَأَیْتِیُّوْن: رکھ دیا۔

اور حجازی مکتب فکر والے اس کو ناپسند کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ جب تک واقعہ پیش نہیں آیا، احکام کیوں بیان کرتے ہو؟ مگر فقہاء کے لئے ضروری تھا، وہ گورنمنٹ کی ضرورت سے کام کر رہے تھے، پس جو بھی نیا واقعہ پیش آئے: گورنمنٹ کے پاس اس کا حل پہلے سے موجود ہونا چاہئے تھا، یوں وہ محدثین فقہاء بن گئے اور یہ فقہاء محدثین بن گئے۔

چار مکاتبِ فکر کیسے وجود میں آئے؟

اور یہ سلسلہ پیچھے سے چلا آرہا تھا لیکن پھر ایک وقت آیا کہ حجازی مکتب فکر میں رمزی نام امام مالک کا استعمال ہونے لگا اور وہ اس جماعت کے سرخیل بن گئے، پھر امام مالک کے شاگرد امام شافعی رحمہ اللہ آئے، پھر امام شافعی کے شاگرد امام احمد رحمہ اللہ آئے، اور تینوں میں مسائل میں اختلافات ہوئے، اس لئے حجازی مکتبِ فکر تقسیم ہو کر تین مکاتب فکر بن گیا، اور عراق میں جو مکتبِ فکر چلا آرہا تھا، اس سلسلہ میں آگے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ آئے، اس لئے رمزی نام ان کا استعمال ہوا، عراق میں اور بھی مجتہدین پیدا ہوئے ہیں، مگر یہ مکتبِ فکر تقسیم نہیں ہوا، امام اعظم کے دو شاگرد: امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ بہت بڑے مجتہد تھے، اتنے بڑے مجتہد کہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ مکہ میں پیدا ہوئے، پہلے وہاں علم حاصل کیا، پھر امام مالک سے علم حاصل کرنے کے لئے مدینہ آئے، یہاں علم حاصل کرنے کے بعد ان کے استاذ امام مالک نے ان کو مشورہ دیا کہ تم عراق جاؤ اور امام ابو یوسف سے پڑھو —— امام اعظم کا انتقال ہو چکا تھا —— امام شافعی رحمہ اللہ نادار تھے، چنانچہ راستہ کا سارا خرچ امام مالک نے دیا اور پڑھنے کے لئے امام ابو یوسف کے پاس عراق بھیجا، جب وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ امام ابو یوسف کا بھی انتقال ہو چکا ہے، اور ان کی جگہ امام محمد پڑھانے کے لئے بیٹھے ہیں، پس امام شافعیؒ نے ان سے پڑھا اور خود فرماتے ہیں: **حملتُ عن محمد وِقْرَیٰ بعیرٍ**: اونٹ کے اوپر آدھا سامان اِدھر باندھتے ہیں اور آدھا اُدھر اور اونٹ زیادہ سے زیادہ چھ من پکّا اٹھاتا ہے، پس فرماتے ہیں: میں نے امام محمد رحمہ اللہ سے ایک اونٹ کا بوجھ اٹھایا ہے، یعنی چھ من کتابیں لکھی ہیں، اس زمانہ میں موٹے کاغذوں پر طلبہ لکھتے تھے، پھر وہ وطن واپس نہیں لوٹے بلکہ بغداد چلے گئے، وہاں امام احمدؒ

نے امام شافعیؒ سے پڑھا، پھر زندگی کے آخر میں امام شافعیؒ بغداد سے مصر چلے گئے اور وہاں دو سال حیات رہے، پھر حضرت کا مصر میں انتقال ہوا۔ بہرحال عراقی مکتبِ فکر ایک رہا، امام اعظم کے شاگرد مجتہد کے درجے کے تھے، مگر انھوں نے اپنے آپ کو امام ابوحنیفہ سے الگ نہیں کیا، چنانچہ امام ابویوسف کے سارے اقوال فقہ حنفی میں شامل ہیں، امام محمد کے سارے اقوال بھی فقہ حنفی میں شامل ہیں، ان کے علاوہ بھی بڑے بڑے شاگرد تھے وہ سب فقہ حنفی میں شامل رہے، بعد میں جو ہوئے وہ بھی فقہ حنفی میں شامل رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا میں مالکی، شافعی اور حنبلی ایک طرف ہیں اور صرف احناف ایک طرف ہیں، ان تین کے بقدر بلکہ اس سے بھی زائد دنیا میں صرف احناف ہیں۔

تابعین کے دور میں چار گمراہ فرقے وجود میں آئے:

میں نے کہا تھا کہ صحابہ کے دور تک عقائد میں اختلاف نہیں ہوا تھا، تابعین کے دور سے عقائد میں اختلاف شروع ہوا، اور سب سے پہلے چار گمراہ فرقے وجود میں آئے: معتزلہ، خوارج، شیعہ اور مرجئہ۔ اور ان کے وجود میں آنے کے عوامل الگ الگ ہیں، کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں حد سے آگے بڑھ گئے تو وہ شیعہ ہوگئے، کچھ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں سے اختلاف کیا تو وہ خوارج ہوگئے، اور کچھ نے اعمال کی حیثیت گھٹادی اور کہا کہ ایمان کے ساتھ کبائر مضر نہیں: وہ مرجئہ ہوگئے۔ اور کچھ نے عقل کو نقل سے اوپر کردیا تو وہ معتزلہ بن گئے، وہ کہتے ہیں: ہماری عقل میں قرآن وحدیث کی جو باتیں آئیں گی وہ ہم مانیں گے اور جو نہیں آئیں گی: ان کا اگر انکار ممکن ہوگا تو انکار کریں گے ورنہ تاویل کریں گے، مثلاً حدیث میں ہے کہ حجر اسود اللہ کا دایاں ہاتھ ہے، انھوں نے کہا: پتھر اللہ کا ہاتھ کیسے ہوسکتا ہے؟ چنانچہ انھوں نے اس حدیث کو ضعیف (ساقط الاعتبار) قرار دیا، پس جب بھی ایسی کوئی حدیث سامنے آئے گی تو معتزلہ کسی نہ کسی راوی کا کان پکڑ کر کہہ دیں گے: یہ راوی ضعیف ہے، اس لئے حدیث ضعیف ہے، حالانکہ کونسا انسان ایسا ہے جس میں کوئی کمزوری نہیں ہوتی، بلکہ نہیں ہوتی تو زبردستی پیدا کی جاتی ہے، چنانچہ جتنے بڑے روات ہیں ان پر اور بھی سخت تنقیدیں ہوئی ہیں، ان بڑوں میں سے

ایک: امام بخاری رحمہ اللہ بھی ہیں ان کو حدیث میں مدلس، اور عقائد میں کافر قرار دیا گیا۔ اور نیشاپور سے باہر نکالا گیا، اور اپنے وطن بخاری پہنچے تو وہاں بھی ان کو نہیں رہنے دیا۔ پس کوئی چھوٹا راوی تو تنقید سے بچا ہوا ہو سکتا ہے، مگر بڑا کوئی نہیں بچا، پس حدیثوں کو ضعیف قرار دینا تو بہت آسان ہے۔ جیسے آج کل کے سلفیوں کے سامنے کوئی بھی حدیث ان کے مزعومات کے خلاف پیش کریں تو فوراً کہیں گے: **هذا حديث ضعيف**: یہ حدیث نکمّی ہے۔

بہر حال عقل کی سمائی میں نہ آنے والا مضمون اگر حدیثوں میں آیا ہے تو معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں، اور قرآن میں آیا ہے تو قرآن کا انکار نہیں کر سکتے، اس لئے وہ تاویل کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے، وہ نہیں ہے۔

بہر حال انھوں نے عقل کو اوپر کر دیا اور نقل کو نیچے، یوں معتزلہ وجود میں آ گئے۔

شیعوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں غلو کیا، انھوں نے کہا: تین خلفاء کی خلافت صحیح نہیں تھی، وہ غاصب تھے، حضرت علیؓ خلیفہ بلا فصل ہیں، اور اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں: چار خلفاء جس ترتیب سے ہوئے ہیں اسی ترتیب سے خلافتیں برحق ہیں۔

اور خوارج نے کہا: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾: اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں یعنی پنچایت بٹھانا جائز نہیں، اور حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ نے دو آدمیوں کی پنچایت بٹھائی اس لئے دونوں کافر ہو گئے۔

اس طرح یہ بھی ایک مسئلہ بنا کہ دو فریقوں کی لڑائی میں تیسرے کو حکم بنانا اور اُسے فیصلہ سونپنا جائز ہے یا نہیں؟ خوارج کہتے ہیں: جائز نہیں، قرآن میں ہے: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾: (یوسف ۴۰) اور اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں: جائز ہے، وہ کہتے ہیں: یہ آیت: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾: حضورؐ پر نازل ہوئی ہے اور بنو قریظہ کے معاملہ میں حضور نے اور بنو قریظہ نے مل کر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو فیصلہ سونپا، پس کیا ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾: کا مطلب تم سمجھتے ہو یا حضور ﷺ؟

صفات متشابہات اور غیر متشابہات:

معتزلہ جب وجود میں آئے تو انھوں نے سب سے پہلے اللہ کی صفات کا مسئلہ چھیڑا۔

جاننا چاہئے کہ اللہ کی صفات دو طرح کی ہیں، ایک: وہ صفات ہیں جن کی مخلوق سے مشابہت نہیں، جیسے اللہ ایک ہیں، اس کی مخلوق سے کیا مشابہت؟ اللہ بے نیاز ہیں، اس کی مخلوق سے کیا مشابہت؟ دوسری: وہ صفات ہیں جو مخلوق سے مشابہت رکھتی ہیں، جیسے اللہ سنتے ہیں تو ہم بھی سنتے ہیں، اللہ دیکھتے ہیں تو ہم بھی دیکھتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ہے تو ہمارا بھی ہاتھ ہے، اللہ کا چہرہ ہے تو ہمارا بھی چہرہ ہے، اللہ کی پنڈلی ہے تو ہماری بھی پنڈلی ہے، اللہ رات کے آخری حصہ میں سمائے دنیا پر اترتے ہیں تو ہم بھی اوپر کی منزل سے نیچے اترتے ہیں۔ پس جو صفات مخلوق کے مشابہ نہیں ہیں وہ زیر بحث نہیں آئیں اور جو صفات مخلوق کی صفات کی طرح ہیں وہ زیر بحث آئیں کہ ان صفات کا کیا مطلب ہے؟

صفات کے تعلق سے مختلف فرقے وجود میں آئے:

صفاتِ باری تعالیٰ میں اختلاف کی وجہ سے امت میں مختلف فرقے وجود میں آئے:

۱- معتزلہ نے صفات باری کا انکار کردیا، مگر صاف انکار نہیں کیا، بلکہ یہ کہا کہ اللہ کی صفات: اللہ کی ذات کا عین ہیں، صفات باری کا نہ الگ کوئی مفہوم ہے نہ وجود، اللہ کی ذات ہی ان کی صفات ہیں، اور آگے جو مسئلہ بیان کروں گا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ حادث ہے یا قدیم؟ اس کا مدار اسی صفات کے انکار پر ہے، جب معتزلہ کے نزدیک تمام صفات اللہ کا عین ہیں تو صفتِ کلام بھی ان کا عین ہے، اور قرآن دنیا میں موجود ہے، ہم اس کو پڑھتے لکھتے ہیں، پھر وہ اللہ کی صفت کیسے ہوسکتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے قرآن کو مخلوق مانا۔

۲- **مُعَطِّلَة** نے کہا: اللہ کی صفات متشابہات ہیں ہی نہیں، کیونکہ ان سے اللہ کا مخلوق کے مشابہ ہونا لازم آتا ہے، درانحالیکہ اللہ مخلوق کے مانند نہیں۔ غرض انھوں نے اللہ کو صفات سے معطل کردیا، صفات کی چھٹی کردی!

۳- **مُجَسِّمَة** نے کہا: اللہ کا بھی ہماری طرح جسم ہے، ہاتھ، پیر اور چہرہ وغیرہ ہیں۔

۴- **مُشَبِّهَة** نے کہا: اللہ کا جسم تو نہیں ہے، مگر اللہ کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح ہیں۔

۵- جمہور امت (اہل السنہ والجماعہ) نے کہا: اللہ کی جو صفتیں قرآن وحدیث میں آئی ہیں: وہ سب صفتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، مگر وہ مخلوق کی صفات جیسی نہیں ہیں۔ پھر

اللہ کی یہ صفات کیسی ہیں؟ جمہور نے کہا: ہم ان کی کیفیت نہیں جانتے، بالاجمال اتنا جانتے ہیں کہ وہ صفات ہیں۔

خلفائے عباسیہ معتزلہ کے خیالات سے متاثر ہوئے:

پھر معتزلہ کا اثر ورسوخ اتنا بڑھا کہ خلافت عباسیہ ان کے اثر میں آگئی، آپ جانتے ہوں گے کہ ہارون رشید کا بیٹا مامون بڑا فلسفی تھا، اسی نے یونانیوں کا فلسفہ عربی میں ترجمہ کرایا ہے، وہاں سے امت میں عقلیت کا دور شروع ہوا اور سب سے پہلے مامون معتزلہ کے خیالات سے متأثر ہوا۔

صفتِ کلام کی بحث:

اللہ کی صفات بے شمار ہیں، ان میں سے ایک: صفتِ کلام ہے، سب سے پہلے وہ زیر بحث آئی، اور اسی وجہ سے علم العقائد کا نام علم الکلام پڑا، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾: اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کھل کر بات چیت کی، پس اللہ کے لئے صفتِ کلام ثابت ہوئی، یہ صفت زیر بحث آئی کیونکہ دوسری صفات کا پیکر محسوس نہیں تھا، جیسے اللہ سمیع ہیں تو سمیع کا کوئی پیکر نہیں، اللہ کے بصیر ہونے کا بھی کوئی پیکر محسوس نہیں، مگر اللہ کی صفتِ کلام کا پیکر محسوس قرآنِ کریم ہے، یہ قرآن جو اللہ کا کلام ہے زیر بحث آیا کہ قرآن جو آج دنیا میں موجود ہے وہ قدیم ہے یا حادث؟ معتزلہ نے کہا: یہ قرآن اگرچہ اللہ کا کلام ہے، مگر قدیم نہیں، حادث ہے، یعنی اللہ کی صفتِ کلام تو قدیم ہے مگر اس کا یہ پیکر قدیم نہیں، یہ مخلوق ہے اور حادث ہے۔ ان کے نزدیک صفتِ کلام کا مطلب ہے: کسی محل میں کلام پیدا کرنا، پس قرآن مخلوق (پیدا کیا ہوا) ہے، وہ قاری کی زبان پر پیدا کیا جاتا ہے۔

اور اہل السنہ والجماعہ نے کہا: قرآن چونکہ اللہ کی صفت کلام کا پیکر محسوس ہے، اس لئے وہ قدیم اور غیر مخلوق ہے، اگر یہ حادث ہوگا تو اللہ کی صفتِ کلام حادث ہوگی اور اللہ کی صفت حادث نہیں ہوسکتی؟

بہ الفاظ دیگر:

یہ مشکل مسئلہ ہے، اس کو پھر تفصیل سے سمجھاتا ہوں: دو لفظ ہیں، ان کے معنی اچھی طرح

ذہن نشین کرلیں: ایک: پرتو ہے، جس کے معنی ہیں: اثر، سایہ، عکس۔ دوسرا: پیکر محسوس ہے، اس کے معنی ہیں: نظر آنے والی صورت۔

اور سب کا اتفاق ہے کہ سارا عالم اللہ کی صفات کا پرتو ہے، یعنی اثر، سایہ اور عکس ہے، صفات محسوس نہیں ہوتیں بلکہ ان کا اثر اور عکس محسوس ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ رزاق ہیں، مگر ان کی صفت رزّاقیت نظر نہیں آتی، نظر رزق اور مرزوق آتے ہیں، اور یہ دونوں مخلوق ہیں، رزق بھی مخلوق ہے اور مرزوق بھی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ خالق ہیں، مگر ان کی صفت خلق نظر نہیں آتی، مخلوقات نظر آتی ہیں، جو نو پید ہیں، قدیم نہیں ہیں، یہی حال صفتِ کلام کے علاوہ تمام صفات کا ہے۔

اور صفتِ کلام میں اختلاف ہوا: معتزلہ کہتے ہیں: قرآنِ کریم بھی اللہ کی صفتِ کلام کا پرتو (اثر) ہے، اللہ تعالیٰ محل میں اپنا کلام پیدا کرتے ہیں، اور وہ مخلوق (نو پید) ہے، یہ اللہ کی صفتِ کلام کا پیکر محسوس (نظر آنے والی صورت) نہیں ہے، جو غیر مخلوق (قدیم) ہو۔

معتزلہ کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ایک غلط نظریہ قائم کر چکے ہیں، وہ صفات باری کو عین ذات مان چکے ہیں، یعنی صفات ذات سے زائد کچھ نہیں، اب وہ کیسے قرآن کو غیر مخلوق (قدیم) کہیں!

اور اہل السنہ والجماعہ کہتے ہیں کہ صفتِ کلام کا معاملہ دوسری صفات سے مختلف ہے، دیگر صفات کے تو پرتو موجود ہیں، مگر صفتِ کلام کا پیکر محسوس قرآنِ کریم موجود ہے، اس لئے وہ غیر مخلوق (قدیم) ہے، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن بھی پرتو ہوتا یعنی صفتِ کلام کا اثر ہوتا تو پھر اس کے ذریعہ تحدّی (چیلنج) کیسے واقع ہوتی؟ لوگ اللہ کی صفت کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اثرات کا مماثل تو بنا سکتے ہیں، وہ أحسن الخالقین ہیں، معلوم ہوا کہ کسی درجہ میں خالق اور بھی ہو سکتے ہیں، وہ أحکم الحاکمین ہیں، معلوم ہوا کہ کسی درجہ میں حاکم اور بھی ہو سکتے ہیں، مگر قرآن کا مماثل کوئی نہیں بنا سکتا، اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآنِ کریم اللہ کی صفتِ کلام کا پرتو نہیں ہے، بلکہ پیکر محسوس ہے، اور اللہ کی کسی بھی صفت کا کوئی مماثل نہ بنا سکتا ہے، نہ لا سکتا ہے، پس ثابت ہوا کہ قرآنِ کریم اللہ کا کلام ہے اور قدیم ہے۔

اور امت میں غالباً سب سے پہلا جھگڑا معتزلہ اور اہل السنہ والجماعہ کے درمیان یہی ہوا

ہے، اس سے پہلے تک بات سادہ انداز میں چلی آرہی تھی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ پرتو ہے یا پیکر محسوس؟ قدیم ہے یا حادث؟ یہ مسئلہ زیر بحث نہیں آیا تھا، مگر جب یہ مسئلہ چھڑا تو بڑا فتنہ برپا ہوا، مامون کے بعد معتصم آیا اس نے زبردستی مسلمانوں کو قائل کرنا چاہا کہ کہو: قرآن مخلوق ہے، اور سلف کے لاکھوں آدمیوں کو یہ بات نہ ماننے کی وجہ سے اس نے تہ تیغ کردیا۔ یہ دور امام احمد رحمہ اللہ کا تھا۔ امام احمدؒ نے اہل السنہ کی طرف سے مردانہ وار اس فتنہ کا مقابلہ کیا، ان کو جیل جانا پڑا، بار بار کوڑے کھائے، مگر وہ مستقیم رہے، پھر معتصم کی بیوی جو اچھے خیالات کی تھی اس نے معتصم پر زور ڈالا، چنانچہ اس نے امام احمدؒ کو چھوڑ دیا، پھر معتصم کے بعد جو بادشاہ آئے وہ معتزلہ کے اثر میں نہیں تھے، اس لئے فتنہ فرو ہوا۔

اصل سلف اور بعد کے سلف میں اختلاف:

امام احمدؒ نے بس اتنا ہی فرمایا تھا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق (قدیم) ہے، اس کی کوئی تفصیل نہیں کی تھی، اور یہی سلف صالحین کا طریقہ تھا، ابھی بیان کروں گا کہ انھوں نے استواء علی العرش کی بھی تفصیل نہیں کی تھی، کیونکہ اللہ کی صفات کو پوری طرح سمجھنا ہماری بس کی بات نہیں، مگر امام احمدؒ کے بعد ان کے ماننے والوں میں غلو پیدا ہوا، اور انھوں نے بات آگے بڑھائی، انھوں نے کہا: قرآن اللہ کی صفتِ کلام ہے اور قدیم ہے، اور قاری جو پڑھتا ہے وہ بھی قدیم ہے، اور جس کاغذ پر قرآن لکھا ہوا ہے وہ کاغذ بھی قدیم ہے، روشنائی بھی قدیم ہے اور جلد بھی قدیم ہے۔ یہاں تک وہ لوگ پہنچ گئے، البتہ امام بخاریؒ نے اختلاف کیا، ان کو نیشاپور اور بخاریٰ سے اس مسئلہ کی وجہ سے نکالا گیا، امام بخاری رحمہ اللہ جب نیشاپور پہنچے ہیں تو ان کا بڑا استقبال کیا گیا تھا، پھر سبق میں کسی نے پوچھ لیا کہ ہم جو قرآن پڑھتے ہیں اور سامعین سنتے ہیں یہ حادث ہے یا قدیم؟ آپؒ نے فرمایا: **لفظی بالقرآن مخلوق:** میں جو قرآن پڑھتا ہوں وہ قدیم نہیں، پھر کیا تھا حنابلہ نے شور مچادیا: یہ معتزلی ہے! اور امام بخاریؒ کو کافر قرار دے دیا، چنانچہ وہ نیشاپور سے نکالے گئے، اور جب بخاریٰ پہنچے تو نیشاپور میں جو ان کی ٹکر کے محدث تھے بلکہ استاذ تھے: محمد بن یحییٰ ذہلی، انھوں نے بخاریٰ کے امیر کو خط لکھا کہ بخاری آرہا ہے اس نے یہاں بدعت

(گمراہی) کی بات کہی ہے، پس اس کو باہر نکالو، چنانچہ آپ بخاریؒ سے بھی نکالے گئے، حالانکہ امام بخاری کی بات صد فیصد صحیح تھی، اور یہ بات امام بخاریؒ سے سو سال پہلے امام ابوحنیفہؒ اپنی کتاب الفقہ الاکبر میں لکھ چکے تھے کہ کلامنا بالقرآن مخلوق اور امام بخاریؒ حدیث میں امام احمدؒ کے شاگرد تھے اور امام احمدؒ نے قرآن کے بارے میں جو کہا تھا کہ وہ مخلوق نہیں ہے، قدیم ہے، اس کا مطلب امام بخاری بہتر جانتے تھے بمقابلہ بعد کے لوگوں کے، اور امام احمد امام اعظم کے شاگردوں کے شاگرد ہیں، پس امام اعظم کی بات امام احمد کے سامنے تھی، اور امام بخاری اپنے استاذ کا مذہب صحیح سمجھ رہے تھے، مگر حنابلہ میں اتنا غلو ہو گیا تھا کہ امام بخاری کا یہ قول ان کو ہضم نہیں ہوا۔

استواء علی العرش کا مسئلہ:

پھر زمانہ آگے بڑھا تو اللہ کی ایک دوسری صفت زیر بحث آئی، قرآن کریم میں سات جگہ ہے: ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾: نہایت مہربان ہستی عرش نشیں ہوئی، ان سات جگہوں میں سے ایک جگہ سورۂ یونس کے پہلے رکوع میں ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِیْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ، يُدَبِّرُ الْأَمْرَ﴾: اللہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے آسمان وزمین کو چھ دنوں میں یعنی چھ دوروں میں پیدا کیا۔ دن: دنیا کا بارہ گھنٹے کا دن نہیں تھا، کیونکہ اس وقت سورج نہیں تھا، بلکہ یہ اللہ کے یہاں کا دن ہے، اس لئے میں نے لفظ دور استعمال کیا، ایک دور کتنے دن کا ہوتا ہے؟ معلوم نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں! غرض اللہ تعالیٰ عرش نشیں ہوئے، وہ پوری کائنات کا انتظام کر رہے ہیں۔ اس آیت سے رد کرنا ہے ان ہندوؤں اور مشرکوں پر جنھوں نے اللہ کی حکومت کے شعبے بنائے ہیں: بارش کا خدا یہ ہے، دولت کا خدا یہ ہے، صحت کا خدا یہ ہے، مشرکین مکہ نے بھی یہی کر رکھا تھا، وہ کہتے تھے: بادشاہ اکیلا حکومت نہیں چلا سکتا، پھر اللہ اتنی بڑی کائنات کا انتظام کیسے کر سکتے ہیں؟ اللہ نے بھی الگ الگ شعبے قائم کر کے الگ الگ خداؤں کو سونپ دیئے ہیں۔ قرآن جگہ جگہ اس کی تردید کرتا ہے، کہتا ہے: اللہ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دوروں میں بنایا، پھر کوئی انتظام کسی کو نہیں سونپا، وہ خود عرش نشیں ہیں اور وہی معاملات کا انتظام کر رہے ہیں۔

استواء علی العرش میں سلف کا مذہب

سلف میں امام مالک، سفیان ثوری اور ایک روایت میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ قرآن میں جو استواء علی العرش آیا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ سب نے ایک ہی جواب دیا کہ **الاستواءُ معلوم، والکیفُ مجهول، والإیمان به واجب، والسؤال عنه بدعة**: لغت میں استواء کے جو معنی ہیں وہ معلوم ہیں، جو بھی عربی جانتا ہے وہ اس کے معنی سمجھتا ہے، وہ معنی ہیں: سیدھا ہونا، جم کر بیٹھنا۔ اور اللہ کے عرش پر بیٹھنے کی کیفیت کیا ہے؟ وہ ہمیں معلوم نہیں۔ اور اللہ کے عرش پر بیٹھنے کی جو بھی کیفیت ہے اس پر ہم ایمان لاتے ہیں، ایمانیات میں سب سے پہلے ایمان بالغیب ہے، قرآنِ کریم کی دوسری سورت میں ہے ﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ اور غیب کیا ہے؟ جو بھی چیز حواس خمسہ ظاہرہ کے دائرے میں نہیں آتی وہ غیب ہے، ایسی چیزیں کیا ہیں؟ جنت ہے، جنت کی نعمتیں ہیں، جہنم ہے جہنم کا عذاب ہے، فرشتے ہیں، اللہ ہیں، اللہ کی صفات ہیں، یہ سب حواس خمسہ ظاہرہ کے دائرے میں نہیں آتے، پس یہ سب غیب ہیں، اور ان پر ایمان لانا واجب ہے، کس بنیاد پر؟ اللہ کے رسول جو سچی خبر دینے والے ہیں ان کی خبر پر اعتماد کر کے جنت بھی ماننی ہے، اس کی نعمتیں بھی ماننی ہیں، جہنم بھی ماننی ہے، فرشتے بھی ماننے ہیں، اللہ کی جو صفات قرآن وحدیث میں آئی ہیں وہ سب ماننی ہیں۔ غرض: ان حضرات نے کہا کہ عرش الٰہی پر جم کر بیٹھنا یہ اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات غیب ہیں، لہٰذا اس کو پوری طرح سمجھے بغیر ماننا ضروری ہے، جیسے جنت کو پوری طرح سمجھے بغیر ماننا ضروری ہے، جہنم کو بغیر سمجھے ماننا ضروری ہے، تھوڑا بہت تو سمجھیں گے مگر مکمل نہیں سمجھیں گے، ایسے ہی اللہ کی صفات کو تھوڑا بہت تو سمجھیں گے مگر پوری کیفیت نہیں سمجھ سکتے، اس لئے پوری کیفیت سمجھے بغیر ماننا ضروری ہے۔ اور یہ جو تم پوچھ رہے ہو کہ اللہ کے عرش پر جم کر بیٹھنے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ سوال بدعت ہے، کیونکہ یہ آیتیں آج نہیں اتریں، اور کسی صحابی نے حضور سے نہیں پوچھا، پھر تم کیوں پوچھتے ہو؟ سب نے یہی جواب دیا ہے، اور یہی اصل سلفیت ہے۔

لیکن جب حنابلہ میں غلو پیدا ہوا، اور مسلمانوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ کاغذ

بھی قدیم ہے، سیاہی بھی قدیم ہے، جلد بھی قدیم ہے، ہم جو قرآن پڑھتے ہیں وہ بھی قدیم ہے، آپ جو سنتے ہیں وہ بھی قدیم ہے، یہ بات کیسے مسلمانوں کے گلے اترتی! حنابلہ جس طرح مسئلہ کو لے کر آگے بڑھے تھے، اس طرح مسئلہ کو سمجھنا ناممکن تھا اس لئے معتزلہ کا اثر بڑھتا جارہا تھا۔

پھر عراق میں حضرت امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ پیدا ہوئے، امام ابوالحسن اشعری خود پہلے معتزلی تھے، پھر توبہ کرکے اہل السنہ میں آئے تھے، چنانچہ وہ گھر کے بھیدوں سے واقف تھے، اور ماوراء النہر میں حضرت ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ پیدا ہوئے، عراق میں امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ کا مقابلہ کیا اور ماوراء النہر میں ابومنصور ماتریدی نے، اور حنابلہ جس طرح مسئلہ لے کر بڑھے تھے، اس طرح مسئلہ کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا، چنانچہ ان دونوں اماموں نے کہا کہ اگر آپ اللہ کی صفات کا کوئی مناسب مطلب بیان کریں اور مناسب تاویل کریں تو یہ جائز ہے۔ انھوں نے کہا: عرش نشیں ہونے کا مطلب: کائنات کا کنٹرول سنبھالنا ہے۔ جب انھوں نے یہ مطلب بیان کیا تو غالی حنابلہ نے کہا: یہ شرک ہے، کفر ہے، بس یہ کہو کہ اللہ تخت پر بیٹھے ہیں، ان دونوں اماموں نے کہا: نہیں اگر اس طرح کہیں گے تو بے پینڈے کے لوٹے لڑھک جائیں گے۔ ان کے لئے ذہن کو روک لینا مشکل ہوگا، جو دین میں پکا ہوگا وہ تو اپنے ذہن کو روک لے گا، لیکن جو عقلیت پسند ہے وہ نہیں روک سکتا یا تو وہ معطلہ میں شامل ہوجائے گا اور اللہ کی صفات کا انکار کردے گا یا مشبہہ بن جائے گا اور کہے گا: اللہ کا تخت پر بیٹھنا انسانوں کے بیٹھنے کی طرح ہے یا وہ مجسمہ کی طرف جائے گا کہ اللہ کا بھی جسم ہے، اور جیسے جسم والا بیٹھتا ہے اللہ بھی ویسے ہی بیٹھے ہیں، اور یہ سب گمراہیاں ہیں، لہٰذا مناسب تاویل کرنی چاہئے۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں، درجۂ احتمال میں کہنا چاہئے کہ اللہ نے چھ دن میں کائنات پیدا کرکے ساری کائنات کا کنٹرول خود سنبھالا ہے، جیسے ایک بادشاہ مرتا ہے تو دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے، مگر تخت پر بیٹھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ واقعۃً وہ وہاں بیٹھ جاتا ہے، اور ہر وقت بیٹھا رہتا ہے، تخت پر بیٹھنا ایک محاورہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ نے ملک کا انتظام سنبھالا، اللہ کے عرش پر بیٹھنے کا بھی یہی مطلب ہے۔

اسی طرح فرمایا: اللہ تعالیٰ رات کا اتنا حصہ گذرنے پر سمائے دنیا پر اترتے ہیں، اب کوئی پوچھے کہ اللہ کیسے اترتے ہیں؟ تو یہ مت کہو کہ ہم نہیں جانتے، کیونکہ اگر ایسا کہو گے تو بیمار ذہن نہیں رکے گا، کچھ نہ کچھ سوچے گا، لہٰذا کوئی پوچھے کہ اللہ کے اترنے کا کیا مطلب ہے؟ تو کہو کہ رات کے اس حصہ میں اللہ کی عنایتیں مخلوق کی طرف مبذول ہوتی ہیں، اب آگے وہ سوچنا چھوڑ دے گا۔

غرض: اشاعرہ اور ماتریدیہ نے معتزلہ کے پھیلائے ہوئے فتنے کو دبانے کے لئے تاویل کا دروازہ کھولا، اور امام احمدؒ کا انتقال ۲۴۱ھ میں ہوا ہے، امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کا ۳۰۳ھ میں اور امام ابومنصور ماتریدیؒ کا ۳۳۳ھ میں، پس یہ سب ایک زمانہ کے لوگ ہیں۔

غرض: حضرت امام احمدؒ سے علم کلام میں جو مسلک چلا اور جس میں حنابلہ نے بعد میں غلو کیا اس کا نام سلفیت پڑا، اور امام ابومنصور ماتریدیؒ سے جو مسلک چلا وہ ماتریدیہ کہلایا، اور امام ابوالحسن اشعری سے جو مسلک چلا وہ اشعریت کہلایا، اور اسی ایک مسئلہ کی وجہ سے یہ سب فرقے وجود میں آئے۔

رہی اللہ کی صفتِ کلام تو اگرچہ اس کی بحث ختم ہوگئی تھی مگر اس مسئلہ کی بھی اشاعرہ اور ماتریدیہ نے تاویل کی۔ اور یہ کہا کہ ’کلام نفسی‘ قدیم ہے، اور قرآنِ کریم اس کا پیکر محسوس ہے، اس لئے وہ بھی قدیم ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کے چار وجود ہوتے ہیں، ان میں سے حقیقی وجود ایک ہوتا ہے، باقی اعتباری وجود ہوتے ہیں، جیسے آگ کا ایک نفس الامری وجود ہے، چولہے میں جو آگ جل رہی ہے: وہ حقیقی آگ ہے، اور ہم جو ذہن میں آگ کا تصور کرتے ہیں: وہ آگ کا وجود ذہنی ہے، اور منہ سے لفظ ’آگ‘ کا جو تلفظ کرتے ہیں: وہ اس کا لفظی وجود ہے، اور کاغذ وغیرہ پر جو لفظ آگ لکھتے ہیں: وہ اس کا کتابی وجود ہے، اور یہ تینوں وجود اعتباری ہیں، اس لئے ان وجودوں پر آثار مرتب نہیں ہوتے، نہ ذہن جلتا ہے، نہ زبان، نہ کاغذ، آثار صرف نفس الامری وجود پر مرتب ہوتے ہیں۔

اسی طرح کلام کے بھی چار وجود ہیں: ایک نفس الامری وجود ہے: وہی حقیقی وجود ہے،

باقی تین اعتباری وجود ہیں، اول: کلام نفسی ہے، اور وہ قدیم ہے، اور اس کا مظہر قرآن کریم ہے، اس لئے وہ بھی قدیم ہے، باقی ہم جو قرآن کو لکھتے ہیں یا حفظ کرتے ہیں، یا پڑھتے ہیں: یہ تینوں اعتباری وجود ہیں، اس لئے وہ قدیم نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر قاری صاحب نے قرآن پڑھا اور آپ نے سنا، آپ نے کیا سنا؟ اللہ کا کلام سنا! اللہ کا کلام کیسے سنا؟ آپ نے قاری صاحب کا پڑھنا سنا، قاری صاحب نے کیا پڑھا؟ اللہ کا کلام پڑھا، اس کے بعد آگے سوچو، کیا اللہ کا کلام صرف یہی قرآن ہے؟ دیکھو میں متکلم ہوں، مجھے اللہ نے بولنے کی طاقت دی ہے اور شروع رمضان سے تقریریں کر رہا ہوں تو آج کی جو تقریر ہے کوئی یہی میرا کلام تھوڑئے ہے! اسی طرح اللہ کا کلام صرف یہ قرآن نہیں ہے، بلکہ قاری صاحب کا پڑھنا اللہ کی صفت کلام پر دلالت کرتا ہے، اور اللہ کا کلام صرف قرآن نہیں ہے، ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾: اللہ نے موسیٰ سے کھل کر بات کی، اللہ جانے وہ بات کیا تھی؟ قرآن نہیں تھا، بہر حال قاری کا پڑھنا قرآن پر دلالت کرتا ہے اور قرآن کریم اللہ کی صفت کلام پر دلالت کرتا ہے، پس یہ جو اللہ کی صفت کلام ہے وہ قدیم ہے اور قرآن کریم صفتِ کلام کا پیکر محسوس ہے، اس لئے وہ بھی قدیم ہے، باقی اس سے نیچے جو کچھ ہے وہ مخلوق اور حادث ہے۔ جیسے ہم مخلوق ہیں اور ہمارا وجود اللہ کی صفتِ خلق پر دلالت کرتا ہے، پس ہم قدیم نہیں ہیں، ہمارا وجود جو اللہ کی صفت خلق پر دلالت کرتا ہے وہ صفت قدیم ہے۔

غرض: اشاعرہ اور ماتریدیہ نے کہا: قدیم: اللہ کی صفتِ کلام ہے اور وہ کلام نفسی ہے اور اس کا ایک مظہر (پیکر محسوس) قرآن کریم ہے، پس وہ بھی قدیم ہے، مگر یہ قرآن ہمیں نظر نہیں آتا، اس کو حضور نے پڑھ کر سنایا، پس حضور کا پڑھنا حادث ہے، پھر اسے کاغذ پر لکھا گیا تو یہ بھی حادث ہے، پھر اس کو قاری نے پڑھا تو یہ بھی حادث ہے، اور آپ جو سنتے ہیں یہ بھی حادث ہے۔

یہ جو اس انداز سے متکلمین نے سمجھایا تو حنابلہ (سلفیوں) کے گلے نہیں اترا، انھوں نے کہا: تم مشرک ہوگئے! تم کافر ہوگئے! مگر جس طرح انھوں نے غلو کیا تھا اس کو کون عقیدہ بنائے گا؟ وہ تو اول نمبر کا شرک ہے کہ کاغذ بھی قدیم، سیاہی بھی قدیم، جلد بھی قدیم، پڑھنے

والا بھی قدیم **سبحان اللہ، ھذا بھتان عظیم!**

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ دمشق پہنچا، جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد گیا، نماز کے بعد ایک صاحب تقریر کے لئے منبر پر چڑھے اور وعظ شروع کیا، انھوں نے حدیث بیان کی کہ جب رات کا اتنا حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سمائے دنیا پر اترتے ہیں، جب یہ حدیث بیان کی تو ایک شخص نے پوچھا: **کیف ینزل؟** اللہ تعالیٰ کیسے اترتے ہیں؟ اس نے یہ کیوں پوچھا؟ آج اگر کوئی مقرر یہ حدیث بیان کرتا ہے تو مجمع میں سے کوئی نہیں پوچھتا، اس وقت کیوں پوچھا؟ یہ ابن تیمیہؒ کا دور تھا، اور انھوں نے صفات کا یہ مسئلہ چھیڑ رکھا تھا، اس لئے کسی نے پوچھا: **کیف ینزل؟** واعظ منبر سے نیچے اتر آیا اور کہا: **ھکذا ینزل:** اس طرح اللہ تعالیٰ اترتے ہیں، ابن بطوطہ لکھتا ہے: لوگوں نے اس کی خوب پٹائی کی، ابن بطوطہ نے لوگوں سے پوچھا: یہ کون بے وقوف ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ ابن تیمیہ ہے۔

اس واقعہ پر لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ واقعہ غلط ہے کیونکہ جس زمانہ میں ابن بطوطہ دمشق پہنچا ہے اور جتنے دن وہاں رہا ہے ان دنوں میں ابن تیمیہ جیل میں تھے، پھر یہ واقعہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب: یہ ہے کہ وہ امام ابن تیمیہؒ نہیں ہونگے تو کوئی اور ابن تیمی ہوگا، جو ان کے خیالات سے متاثر ہوگا، اور مسافران دونوں باتوں میں فرق نہیں کرسکتا، بہر حال یہ جھوٹا واقعہ نہیں، ابن بطوطہ کا سفرنامہ دو جلدوں میں چھپا ہوا ہے، پوری کتاب میں کسی بات پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی، آخر یہی واقعہ ابن بطوطہ نے جھوٹا کیوں لکھ دیا؟

اس کی نظیر: یہ ہے کہ کوئی شخص دین میں عقلی گھوڑے دوڑاتا ہے تو لوگ کہہ دیتے ہیں: یہ مودودی ہے! یعنی مودودی خیالات سے متاثر ہے، اس لئے اس کو مودودی کہہ دیا جاتا ہے۔ یہی حال اس واعظ ہوگا، وہ چونکہ امام ابن تیمیہؒ کے خیالات سے متاثر تھا: اس لئے اس کو ابن تیمیہ کہہ دیا ہوگا۔ بہر حال اس کی بات سے امام ابن تیمیہؒ کے خیالات کی ترجمانی خوب ہوتی ہے۔

کلام نفسی کی بات ایک تاویل ہے:

اسی طرح حنابلہ کے اس غلو کو کون صحیح کہے گا کہ اللہ تعالیٰ واقعی عرش پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

اب صحیح بات کیسے سمجھائی جائے؟ سلف کے زمانہ میں جس طرح بات سمجھائی جاتی تھی اس طرح اب نہیں سمجھائی جاسکتی تھی کہ ہم نہیں جانتے کہ اس کی کیفیت کیا ہے۔ اس لئے اشاعرہ اور ماتریدیہ نے گمراہی پر کنٹرول کرنے کے لئے تاویل کا دروازہ کھولا۔ انھوں نے کہا: اللہ کی صفتِ کلام نظر آنے والا اور سنا جانے والا قرآن نہیں ہے، بلکہ کلام نفسی ہے، اور یہ قرآن صفتِ کلام کا پیکر محسوس ہے۔ اس لئے یہ بھی اللہ کا کلام ہے اور قدیم ہے۔ سلف یہ سب تفصیل نہیں کرتے تھے، وہ مجمل بات کہتے تھے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، ہمیں بھی بس یہی بات کہنی چاہئے، کلام نفسی اور کلام لفظی کی بحث میں نہیں پڑنا چاہئے۔

سلفی، اشعری اور ماتریدی: سب اہل حق ہیں:

بہرحال: میں اشعری بھی ہوں ماتریدی بھی، اور سلفی بھی، کیونکہ ان تینوں میں کوئی جھگڑا نہیں، یہ تینوں اہل حق ہیں، لیکن آج کے جو سلفی ہیں وہ اہل حق نہیں، وہ امام احمد رحمہ اللہ کے بعد غلو میں مبتلا ہوگئے ہیں، امام احمد رحمہ اللہ تک جو سلفی تھے وہی اصلی سلفی تھے، اور بعد کے لوگ نام نہاد سلفی ہیں۔

اور دارالعلوم دیوبند میں تینوں مکاتب فکر کی کتابیں نصاب میں داخل ہیں، امام طحاوی رحمہ اللہ کی عقیدۃ الطحاوی بہت پہلے کی کتاب ہے، یہ کتاب سلف کے مسلک کی ترجمانی کرتی ہے، دارالعلوم دیوبند میں سب سے پہلے یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے، پھر شرح عقائد نسفی پڑھائی جاتی ہے، اس کا متن: **العقائد النسفیه**: عمر نسفی ماتریدی کا ہے، اور شارح علامہ سعد الدین تفتازانی شافعی: اشعری ہیں، اس طرح تینوں مکاتب فکر کی کتابیں دارالعلوم دیوبند میں پڑھائی جاتی ہیں، کیونکہ تینوں مسلک برحق ہیں۔

فقہی مکاتب فکر میں سے چار ہی مکاتب فکر برحق ہیں:

یہ تو علم کلام کی تفصیل تھی کہ امت میں کس طرح بحثیں ہوئیں اور کس طرح فرقے وجود میں آئے۔ اب مسائل میں آؤ۔ آپ جانتے ہیں کہ مسائل فقہیہ کے بھی اصول ہیں، وہ اصول کیا ہیں؟ اس میں اختلاف ہوا ہے۔ پس اگر اصول صحیح ہیں تو فقہ صحیح ہے، اور اگر اصول

مکتبہ حجاز دیوبند

غلط ہیں تو فقہ بھی غلط ہے۔

اہل السنہ والجماعہ کے نزدیک اصول شرع کیا ہے؟ نور الانوار کے شروع میں ہے: **اعلم أن أصول الشرع ثلثة: كتابُ الله، وسنةُ رسولِه، وإجماع الأمة، والأصل الرابع: القياس المُسْتَنْبِطُ من هذه الأصول الثلاثة:** یہ بات جان لو کہ شریعت (فقہ وکلام) کے اصول تین ہیں: اللہ کی کتاب، اللہ کے رسول کی سنت اور اجماع امت اور چوتھی اصل وہ قیاس ہے جس کے ذریعہ ان تین اصولوں میں سے مسائل نکالے جاتے ہیں۔

اب آگے چلو، سب سے پہلے ایک فرقہ پیدا ہوا، اس نے کہا: **حسبنا كتابُ الله:** ہمارے لئے قرآن کافی ہے، اس سے آگے ہم کوئی چیز نہیں مانتے، یہ فرقہ خود کو اہل قرآن کہتا ہے، پس یہ فرقہ جو صرف قرآن کو مانتا ہے اس کی فقہ کیسے برحق ہوسکتی ہے؟ اصول تو تین ہیں، ان میں سے جو صرف قرآن کو مانتا ہے: اس کی فقہ کیسے برحق ہوسکتی ہے؟

دوسرا فرقہ کہتا ہے: قرآن کے بعد حدیثیں حجت ہیں، آگے کوئی چیز حجت نہیں، یہ فرقہ خود کو اہل حدیث کہتا ہے، یہ فرقہ چونکہ سنت کو اور اجماع کو حجت نہیں مانتا: اس لئے اس کی فقہ (فقہ ظاہری) کیسے برحق ہوسکتی ہے؟

اور اہل السنہ والجماعہ کہتے ہیں: قرآن کے بعد حدیث حجت نہیں، سنت حجت ہے، اور حدیث اور سنت میں فرق میں نے گذشتہ تقریر میں سمجھایا ہے، پھر تیسری اصل اجماع امت ہے، یہ بھی حجت شرعیہ ہے، اِن حضرات کا نام اہل السنہ والجماعہ ہے۔

پس جو صرف قرآن کو اصل مانتے ہیں اور انھوں نے جو فقہ تیار کی ہے وہ برحق نہیں، اور جو قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی حجت مانتے ہیں، انھوں نے جو فقہ تیار کی ہے وہ بھی برحق نہیں، کیونکہ ان کے اصول صحیح نہیں، اور اہل السنہ والجماعہ کی فقہ چار حصوں میں تقسیم ہوگئی: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی، یہ چاروں فقہیں برحق ہیں، کیونکہ ان کے اصول صحیح ہیں، یہ حضرات قرآن کو بھی حجت مانتے ہیں، سنت کو بھی، اجماع کو بھی اور قیاس کو بھی، اور قیاس تین اصولوں سے الگ کوئی چیز نہیں، وہ تو ایک آلہ ہے اس کے ذریعہ سے تین اصولوں (قرآن، سنت اور اجماع) سے مسائل نکالے جاتے ہیں۔

مکتبہ حجاز دیوبند

اہل حق وہ ہیں جو دونوں سلسلوں سے برحق ہوں:

اب سمجھو: عقائد میں برحق تین فرقے ہیں: اشاعرہ، ماتریدیہ اور امام احمد رحمہ اللہ تک کے سلفی، آج کے یہ سلفی نہیں، یہ تو امام احمدؒ کے بعد غلو کرنے والے سلفی ہیں، یہی تین جماعتیں برحق ہیں، ان کے علاوہ سب گمراہ ہیں۔

اور فقہ میں چار جماعتیں برحق ہیں: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی: پس جب دونوں طرف سے حق پر جمع ہونگے تو مکمل برحق ہوں گے، عقائد میں اشعری، ماتریدی یا سلفی ہوں، اور فقہ میں حنفی، مالکی، شافعی یا حنبلی ہوں تو وہ مکمل طور پر برحق ہیں، اور اگر ایک سلسلہ سے برحق ہے اور دوسرے سلسلہ سے گمراہ تو وہ کریلا نیم چڑھا ہے۔ مثلاً: عقائد میں تینوں میں سے کچھ نہیں اور فقہ میں چار میں سے ایک ہے، جیسے علامہ جار اللہ زمخشری عقائد میں معتزلی تھے، اور فقہ میں حنفی، پس وہ کریلا نیم چڑھا تھے، اسی طرح ہندوستان کے وہ سلفی (غیر مقلد) جو سعودیہ میں پیٹرول نکلنے سے پہلے اشعری تھے اور فقہ میں ظاہری تھے: وہ برحق نہیں، وہ بھی کریلا نیم چڑھا ہیں۔

ہندوستان کے غیر مقلد: سلفی کب سے بنے اور کیوں بنے؟

امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ: شافعی تھے، اس لئے دنیا کے تمام شوافع اشعری ہیں، اور امام ابومنصور ماتریدی: حنفی تھے، اس لئے دنیا کے تمام حنفی ماتریدی ہیں، اور سلفیت امام احمدؒ سے چلی ہے جس طرح حنبلیت ان سے چلی ہے، اس لئے تمام حنبلی: سلفی ہیں، اور مالکیہ میں تینوں مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

غرض: سعودیہ والے فقہ میں حنبلی ہیں اور علم کلام میں سلفی، پھر وہاں پیٹرول نکل آیا تو ہندوستان کے غیر مقلدین نے خود کو سلفی کہنا شروع کر دیا حالانکہ پہلے ان کا ہر عالم خود کو اشعری لکھتا تھا، ماتریدی وہ کبھی نہیں رہے، کیونکہ حنفیہ سے ان کو اللہ واسطے کی دشمنی ہے، اس لئے وہ ماتریدی نہیں ہو سکتے تھے، ہاں اشعری ہو سکتے تھے، کیونکہ امام ابوالحسن اشعری شافعی تھے، اور غیر مقلدوں کے شوافع سے فقہ میں ڈانڈے ملتے ہیں۔ شوافع بھی رفع یدین کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں، شوافع بھی امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں: وہ بھی پڑھتے ہیں، شوافع بھی آمین بالجہر کے قائل ہیں: وہ یہ بھی یہی کہتے ہیں، چنانچہ وہ علم کلام میں اشعری بن گئے

اور وہ خود کو اشعری کہتے اور لکھتے تھے۔

پھر جب انھوں نے دیکھا کہ اب سلفی بنے بغیر چارہ نہیں، یہ لبادہ اوڑھے بغیر ریال ہاتھ نہیں آسکتے تو انھوں نے اشعریت کا لبادہ اتار پھینکا اور سلفی بن گئے اور سعودیہ والے بے چارے دھوکہ میں آگئے، وہ سمجھے کہ یہ بھی ہمارے جیسے سلفی ہیں، حالانکہ وہ نقلی سلفی ہیں۔

غرض مسئلہ میں یہ سمجھا رہا تھا کہ اہل حق کون ہیں؟ جو عقائد میں تین میں سے ایک ہو، اور فقہ میں چار میں سے ایک ہو، وہی مکمل طور پر اہل حق ہیں، اور اگر ایک طرف سے اہل حق میں سے ہو، اور دوسری طرف سے اہل باطل میں سے تو وہ کریلا نیم چڑھا ہے، اور اگر دونوں طرف سے اہل باطل میں سے ہو تو اس سے اللہ کی پناہ!

خلاصہ کلام:

اب آخر میں دو باتیں سنو!

پہلی بات: سب سے پہلا سلفی میں ہوں، لیکن میں اشعری بھی ہوں، اور ماتریدی بھی، تینوں کس طرح جمع ہو سکتے ہیں؟ اس طرح کہ اللہ کی تمام صفات کو جو قرآن وحدیث میں آئی ہیں: میں مانتا ہوں، قرآن میں ہے: ﴿أَأَمِنتُم مَّنْ فِي السَّمَآءِ﴾: پس میں مانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہیں، چنانچہ ہم جب بھی کہتے ہیں: اللہ نے یہ فرمایا تو ہم انگلی اوپر کی طرف کرتے ہیں، زمین کی طرف نہیں کرتے، مگر اللہ کے آسمان میں ہونے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ عرش نشیں ہیں، اللہ کا عرش بھی مانتا ہوں، اللہ کے عرش پر بیٹھنے کو بھی مانتا ہوں لیکن کوئی پوچھے کہ اس کی کیفیت کیا ہے؟ تو میں یہ بات نہیں جانتا، اسی طرح اللہ کا چہرہ بھی ہے، ہاتھ بھی ہے، پنڈلی بھی ہے، میں یہ سب باتیں مانتا ہوں، مگر کوئی پوچھے کہ وہ کیسے ہیں؟ تو میں یہ بات نہیں جانتا۔

پس میرا مذہب تنزیہ مع التفویض ہے، تنزیہ کا مطلب ہے: اللہ کی مخلوق کی مشابہت سے پاکی بیان کرنا، پس کہیں گے: اللہ کا ہاتھ ہمارے ہاتھ جیسا نہیں، اللہ کا چہرہ ہمارے چہرے جیسا نہیں، اور تفویض کا مطلب ہے: صفات کی کیفیت کو اللہ کے حوالہ کرنا۔ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی صفات کو بہتر جانتے ہیں۔ یہی اصل سلفیت ہے، اور علمائے دیوبند اسی کے قائل ہیں۔

لیکن بیمار ذہنوں کو مطمئن کرنے کے لئے میں اللہ کی صفات کی مناسب تاویل کو بھی جائز کہتا ہوں، یعنی درجۂ احتمال میں مطلب بیان کرنے کو بھی جائز کہتا ہوں، مگر ضروری نہیں کہتا، پس اگر کوئی کہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلاَلِ وَالإِكْرَامِ﴾: زمین پر جو کچھ ہے وہ ختم ہونے والا ہے، اور تیرے پروردگار ذوالجلال والاکرام کا چہرہ ہی باقی رہنے والا ہے، یعنی اللہ کی ذات ہی باقی رہے گی تو ایسا کہنا جائز ہے، صرف جائز ہے فرض نہیں، کیونکہ تاویل تو درجہ احتمال میں ہوتی ہے، وہ فرض وواجب نہیں ہوتی، اسی طرح جب پنڈلی کھولی جائے گی اور لوگوں کو حکم دیا جائے گا کہ اللہ کو سجدہ کریں، تو کافر سجدہ نہیں کرسکیں گے یعنی جس دن اللہ کی خاص تجلی ظاہر ہوگی، اور میدان محشر میں لوگوں سے کہا جائے گا کہ اس تجلی کے سامنے سجدہ کرو تو جنھوں نے دنیا میں اللہ کو سجدہ کیا ہوگا وہی سجدہ کریں گے اور جنھوں نے دنیا میں اللہ کو سجدہ نہیں کیا یعنی کفار وہ اس تجلی کے ظاہر ہونے پر سجدہ نہیں کرسکیں گے۔ غرض پنڈلی کو تجلی سے تعبیر کرنا جائز ہے، اگر ایسا مطلب بیان کیا جائے تو سننے والے جو بیمار ذہن رکھتے ہیں وہ یہیں رک جائیں گے، اس سے آگے اِدھر اُدھر کی نہیں سوچیں گے۔

پس بات کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کل کے سلفی، چاہے وہ ظاہری ہوں یا سعودیہ والے حنبلی سلفی: سب امام احمد رحمہ اللہ کے بعد غلو میں مبتلا ہوچکے ہیں، وہ غلو کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ ان کے نزدیک سارے عقیدے اور سارا علم کلام انہی دو باتوں میں منحصر ہوگیا ہے کہ اللہ کو عرش پر بیٹھا ہوا مانو، اور اللہ کو آسمان دنیا پر اترتا ہوا مانو تبھی تم مسلمان ہو، ورنہ تم مسلمان نہیں!

دوسری بات: تین فرقے علم کلام میں برحق ہیں اور چار فقہیں برحق ہیں، پس جو بھی ان چار سے خارج ہوگا وہ اہل حق میں سے نہیں ہوگا، اور جو بھی ان تین سے خارج ہوگا وہ بھی اہل حق میں سے نہیں ہوگا۔ اور آج کے سلفی ان تین میں سے نہیں، اصلی سلفی اور تھے، اور یہ سلفی اور ہیں، وہ لوگ سلفی نہیں ہیں جو اللہ کے لئے جسم مانتے ہیں، اللہ کو مخلوق کے مشابہ مانتے ہیں، اللہ کے لئے جہت مانتے ہیں، اور اللہ کے لئے مکان مانتے ہیں۔

اللہ کہاں ہیں؟

گجرات کے ایک بڑے عالم حج یا عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ گئے، امام حرم سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اپنا تعارف کرایا، امام حرم نے پوچھا: **أَيْنَ اللّٰه؟** اللہ کہاں ہیں؟ وہ عالم خاموش رہے۔ میں نے ان سے کہا: آپ نے فوراً جواب کیوں نہ دیا کہ **هو في السماء، لقوله تعالىٰ:** ﴿ءَ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ﴾: اللہ تعالیٰ آسمان میں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: کیا تم لوگ ان سے بے خوف ہو گئے جو کہ آسمان میں ہے؟ پھر اگر امام صاحب پوچھتے کہ **كيف هو في السماء**: وہ آسمان میں کس طرح ہیں؟ تو آپ جواب دیتے: **لا أدري**: میں نہیں جانتا۔

اس واقعہ سے مجھے بتلانا یہ ہے کہ سعودیہ والے حنبلیوں کے نزدیک معیارِ حق یہی رہ گیا ہے کہ اللہ کو آسمان میں مانا جائے اور کوئی تاویل نہ کی جائے، جب کوئی تاویل نہیں کی جائے گی تو خود بخود ذہن جہت و مکانیت کی طرف سبقت کرے گا۔

مکتبہ حجاز دیوبند

مچھلی کے ڈبّے پر مذبوح کا لیبل!

اور ایک عجیب بات آخر میں یہ عرض کر دوں کہ آج کل سلفیت سے علم کلام کی سلفیت مراد نہیں لی جاتی، بلکہ ظاہریت (عدمِ تقلید) مراد لی جاتی ہے، یہ عجیب دھوکہ ہے، ہم نے ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں مچھلی کا پکا ہوا ڈبہ خریدا، اس پر لیبل لگا ہوا تھا: **مذبوح على طريقة الإسلام**: اسلامی طریقے پر ذبح کیا ہوا۔ میں نے دوکاندار سے پوچھا: یہ کیا؟ اس نے جواب دیا: کسٹم کے آفیسر جاہل ہوتے ہیں، وہ اس لیبل کے بغیر گوشت کا کوئی آئیٹم ملک میں نہیں آتے دیتے، اس لئے یہ لیبل لگایا ہے۔

خواہ یہ وجہ ہو یا کوئی اور وجہ: بہر حال یہ لیبل ایک دھوکہ ہے، اسی طرح غیر مقلدین نے اپنی ظاہریت پر سلفیت کا لیبل لگایا ہے، اور اپنا کھوٹا مال چلایا ہے، اس لئے تمام مسلمانوں کو ہوشیار رہنا چاہئے، اور ان سلفیوں کے فریب میں نہیں آنا چاہئے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزے اور زکوٰۃ کے ضروری مسائل

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! روزے تم پر لازم کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والوں پر لازم کئے گئے ہیں، تاکہ تم پرہیزگار بنو!

دو قسم کی عبادتیں

بزرگو اور بھائیو! اللہ تعالیٰ نے دو قسم کی عبادتیں رکھی ہیں: بدنی اور مالی۔ بدنی: وہ عبادتیں ہیں جن کا تعلق بدن سے ہے یعنی ان میں بدن استعمال ہوتا ہے۔ مالی: وہ عبادتیں ہیں جن میں مال استعمال ہوتا ہے، بدن استعمال نہیں ہوتا۔ اور ایک تیسری قسم دونوں سے مرکب عبادت ہے، اس میں بدن بھی استعمال ہوتا ہے اور مال بھی، اول دو کو سمجھ لیں تو تیسری خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔

بدنی عبادتیں دو اور مالی عبادت ایک کیوں ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کے بدن میں روح رکھی ہے اور روح کی دو صفتیں (حالتیں) ہیں: ایک: ملکیت یعنی فرشتوں جیسی استعداد، دوسری بہیمیت یعنی جانوروں جیسی استعداد۔ بالفاظِ دیگر: ایک لمۂ خیر ہے، دوسرا لمۂ شر (لمۃ: اثر) قرآن میں ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا﴾ (الشّمس: ۷) قسم ہے نفس (روح) کی اور اس نفس کو درست بنانے کی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کا نفس نہایت عمدہ بنایا ہے ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ پس اللہ نے اُس نفس کو

اُس کی نیکوکاری اور اس کی بدکاری الہام کی۔ یہی روح کی دو صفتیں (ملکیت اور بہیمیت) ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ ہے ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (البلد:۱۰): ہم نے انسان کو دونوں راہیں سُجھا دیں، نیکوکاری کی راہ بھی اور بدکاری کی راہ بھی، اب انسان کو اختیار ہے: نیکوکاری کی راہ پر چلے گا تو جنت میں جائے گا، اور بدکاری کی راہ پر چلے گا تو جہنم رسید ہوگا۔

یہ جو اللہ نے انسان کو دو راہیں سمجھائی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح میں اللہ نے نیکی اور بدی کی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ اب ضروری ہے کہ اللہ کی شریعت میں ایسے اعمال اور ایسی عبادتیں رکھی جائیں جو ملکیت (نیکوکاری) کو بڑھاوا دیں اور بہیمیت (بدکاری) کو لگام دیں، چنانچہ نماز رکھی گئی نیکوکاری کو بڑھاوا دینے کے لئے، لمۂ خیر کی ترقی کے لئے، اور روزہ رکھا گیا نفسانی تقاضے کو دبانے کے لئے، آدمی میں تقوی اور پرہیزگاری پیدا کرنے کے لئے، لمۂ شر کو دبانے کے لئے۔ اسی کو قرآن میں کہا گیا ہے: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾: یعنی روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تم پرہیزگار بنو۔

سوال: ہمارے روزے تو پرہیزگاری پیدا نہیں کرتے؟

جواب: پیدا کرتے ہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہے کہ پیدا نہیں کرتے۔ آپ رمضان سے پہلے اپنے نفس کی حالت کا جائزہ لیں اور رمضان کے بعد اپنے نفس کا جائزہ لیں، آپ خود فرق محسوس کریں گے، تھوڑا یا زیادہ یہ الگ بات ہے، فرق ہر شخص محسوس کرے گا۔ البتہ یہ فرق غور کرنے سے محسوس ہوگا، واضح طور پر محسوس نہیں ہوگا۔

اور واضح طور پر فرق محسوس نہ ہونے کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: ہم لوگ جہاں تک گنجائش ہوتی ہے دبا کر کھاتے ہیں، افطاری میں بھی اور سحری میں بھی۔ یہ جو صورت ہمارے کھانے کی ہے اس سے ہمیں روزوں کی نورانیت محسوس نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ زکریا قدس سرہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے ''اکابر کا رمضان'' اس کو پڑھو: اکابر رمضان میں افطاری کتنی کھاتے تھے، اور سحری کتنی کھاتے تھے۔ کیا ان کا کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا؟ چاہتا تھا، مگر انہیں روزوں کی نورانیت حاصل کرنی تھی، اور وہ نورانیت کم خوری سے حاصل ہوتی ہے، اُس کتاب میں یہ واقعہ ہے کہ بڑے حضرت رائپوری شاہ

عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ رمضان میں سحری میں صرف ایک فنجان چائے اور ایک نیم برشت انڈا لیا کرتے تھے، افطاری میں کچھ نہیں لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ چونکہ صوم وصال سے حضور نے منع کیا ہے اس لئے اتنا لے لیتا ہوں، ورنہ مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں۔

صوم وصال سے منع کرنے کی وجہ؟

خود نبی پاک ﷺ صوم وصال رکھتے تھے، پندرہ دن کا ایک روزہ رکھتے تھے، صحابہ نے دیکھا تو انھوں نے بھی شروع کیا۔ حضور نے منع فرمایا، صحابہ نے عرض کیا: إِنَّكَ تُوَاصِلُ یارسولَ اللّٰہِ! آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ حضور نے فرمایا: إنی لَسْتُ كَأَحَدِكم **يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ**: میرا معاملہ اور ہے اور تمہارا معاملہ اور ہے، مجھے میرا رب کھلاتا پلاتا ہے، تمہیں کہاں کھلائے گا پلائے گا جو میری حرص کرتے ہو، مگر اس کے باوجود حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت فاروق اعظم، حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم ایک ہفتہ کا روزہ رکھتے تھے، اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ حضور نے جو امت کو منع کیا ہے وہ **إِبْقَاءً علیهم**: ان پر شفقت فرماتے ہوئے منع کیا ہے، ورنہ فی نفسہ صوم وصال جائز ہے، اسی لئے حضرت عائشہؓ وغیرہ ایک ہفتہ کا روزہ رکھتے تھے، پس کیا ان کے پاس کھانا نہیں تھا؟ تھا مگر چونکہ ان کو روزے کا مقصد حاصل کرنا تھا اس لئے وہ کم کھایا کرتے تھے۔

اور روزوں کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے: غریبوں کی غریبی کو یاد کرنا، مگر پورے رمضان ہمیں غریب یاد نہیں آتے، کیونکہ ہمارے پیٹ میں جتنی گنجائش ہوتی ہے اتنا ہم بھر لیتے ہیں۔ ایک وجہ تو نورانیت کم محسوس ہونے کی یہ ہے۔

دوسری وجہ: روزوں کو گناہوں سے اور لغویات سے پاک رکھنا ضروری ہے۔ آپ غسل خانے میں نہانے کے لئے جائیں اور ایگزاسٹر کھولے بغیر نہائیں تو نہانے کے بعد سارا آئینہ میلا ہو جائے گا، آپ خود کو اس میں نہیں دیکھ سکیں گے، اور اگر آپ پہلے ایگزاسٹر کھول دیں، پھر نہائیں، تو جب آپ کھڑے ہونگے آئینہ صاف ہوگا اور آپ اس میں خود کو دیکھ سکیں گے، اسی طرح ہم روزہ رکھتے ہیں، مگر ایگزاسٹر نہیں کھولتے، جھوٹ بولتے رہتے ہیں، گالیاں بکتے رہتے ہیں، دنیا بھر کی غیبتیں کرتے رہتے ہیں، الزامات اور تہمتیں لگاتے

رہتے ہیں، صبح سے شام تک ہم یہ سارے کام کرتے رہتے ہیں پس آئینہ تو میلا ہونا ہی ہے، اور جب آئینہ میلا ہو گیا تو روزے کے انوار کہاں سے نظر آئیں گے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے: مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ أَنْ يَّدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ: جس نے روزے میں جھوٹی بات نہیں چھوڑی، غلط کام نہیں چھوڑا اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی اللہ کو کوئی حاجت نہیں، جو چھوڑنا تھا وہ تو چھوڑا نہیں۔ معلوم ہوا کہ روزہ میں صرف کھانا پینا چھوڑنا ہی مطلوب نہیں، بلکہ لغو اور بے کار باتوں سے اپنے آپ کو بچانا بھی ضروری ہے۔ جب آپ ایسا روزہ رکھیں گے تو روزوں کے انوار محسوس کریں گے، ہمیں جو روزوں کی نورانیت کم محسوس ہوتی ہے اس کی یہ دو وجہیں ہیں۔

غرض روزہ جو بدنی عبادت ہے وہ بہیمیت پر، لمۂ شر پر، کنٹرول کرنے کے لئے ہے، تا کہ آدمی میں تقوی اور پرہیز گاری پیدا ہو، اور نماز بھی بدنی عبادت ہے اور وہ اس لئے ہے کہ آدمی میں نورانیت پیدا ہو، ملکیت ابھرے، لمۂ خیر ابھرے، اللہ کا قرب حاصل ہو، اللہ کی یاد آئے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَر﴾: اللہ کی یاد نماز کا بڑا فائدہ ہے، اور حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اللہ کے قدموں پر سجدہ کرتا ہے، یعنی اتنا قریب ہو جاتا ہے۔

بہر حال نماز کا مقصد یہ ہے، اور روزے کا مقصد وہ ہے، اور چونکہ ایسی کوئی بدنی عبادت نہیں جس سے دونوں مقصد حاصل ہوں اس لئے بدنی عبادتیں دو رکھیں اور مالی عبادت فقط ایک رکھی، کیونکہ مال میں دو مقصد نہیں، اور وہ مالی عبادت: زکوٰۃ ہے اور صدقۃ الفطر اور نفلی صدقات اسی لائن کی چیزیں ہیں۔

حج بدنی عبادت ہے یا مالی؟

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حج بدنی عبادت ہے، اور ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں: حج مال اور بدن سے مرکب ہے، چنانچہ امام مالک کے نزدیک ہر وہ شخص جس کو استطاعت بدنی حاصل ہے یعنی وہ مکہ چل کر پہنچ سکتا ہے اس پر حج فرض ہے، زاد و راحلہ شرط نہیں ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً﴾ میں امام مالک استطاعت سے استطاعت بدنی مراد لیتے ہیں۔ اور دیگر ائمہ کے

نزدیک استطاعت بدنی بھی ضروری ہے اور ساتھ میں سواری بھی موجود ہونی ضروری ہے، جو مکہ تک لے کر جائے اور اتنا خرچہ بھی پاس ہو کہ پیچھے فیملی کو دے کر جائے اور واپس آنے تک وہ چلتا رہے تب اس پر حج فرض ہوگا۔ اور ان کی دلیل ایک روایت ہے جس کو امام مالک ضعیف قرار دیتے ہیں۔ حضور سے پوچھا گیا: مایُوْجِبُ الحَجَّ؟ حج کو کیا چیز واجب کرتی ہے؟ حضور نے فرمایا: الزَّادُ وَالرَّاحِلَةَ: زاد وراحلہ واجب کرتے ہیں۔

امام مالک نے یہ حدیث ضعیف ہونے کی وجہ سے نہیں لی، مگر دوسرے ائمہ کہتے ہیں: ہمیں حدیث سے کوئی حکم ثابت نہیں کرنا، صرف قرآن کی آیت: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً﴾: کی تفسیر کرنی ہے اور آیت کی تفسیر میں ضعیف حدیث کو لینے میں کوئی حرج نہیں، باقی ائمہ اس حدیث سے کوئی حکم ثابت نہیں کرتے، وہ اس حدیث کو سامنے رکھ کر صرف اتنا کہتے ہیں کہ ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً﴾ میں صرف استطاعت بدنی مراد نہیں، استطاعت مالی بھی مراد ہے۔ خیر امام مالکؒ کے نزدیک حج صرف بدنی عبادت ہے، دیگر ائمہ کے نزدیک بدن اور مال دونوں سے مرکب ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بدنی عبادتیں دو رکھی ہیں اور مالی عبادت ایک رکھی ہے، ایسا کیوں ہے؟ بدنی عبادتیں دو اس وجہ سے ہیں کہ روح میں دو صفتیں ہیں، دونوں صفتوں کے لئے دو عبادتیں چاہئیں، ایک سے ملکیت بڑھے گی اور دوسری سے بہیمیت پر کنٹرول ہوگا اور چونکہ مال میں ایسی دو صفتیں نہیں، اس لئے عبادت مالی ایک ہی رکھی۔

زکوٰۃ عام مال میں ہے، خاص مال میں نہیں:

مالی عبادت میں شریعت نے کئی باتوں کا لحاظ کیا ہے:

ایک: یہ کہ جو اموال عام طور پر جمہور کے پاس ہوتے ہیں انہی میں زکوٰۃ رکھی ہے مخصوص آدمیوں کے پاس جو مال ہوتا ہے اس میں زکوٰۃ نہیں رکھی، بکریاں، گائے، بھینس، اونٹ جہاں لوگ پالتے ہیں سبھی پالتے ہیں، جب گولڈ اور سلور کرنسی تھے تو ہر آدمی کے پاس تھے۔ اور ہیرے جواہرات بنیوں کے پاس ہی ہوتے ہیں، ہم ستر سال کے ہوگئے، ہم نے ہیرے کی شکل بھی نہیں دیکھی، ہیرے بڑے مہنگے ہوتے ہیں، مگر ان میں زکوٰۃ نہیں، زکوٰۃ

جو شریعت نے فرض کی ہے اس میں اس کا لحاظ کیا ہے کہ وہ اموال عام طور پر لوگوں کے پاس پائے جاتے ہوں، مخصوص لوگوں کے پاس جو اموال ہوتے ہیں ان میں زکوٰۃ نہیں۔

زکوٰۃ میں غناء کا لحاظ ہے:

دوم: زکوٰۃ فرض کرتے وقت غنا (بے نیازی) کا لحاظ رکھا گیا ہے، جس مال کی آدمی کو ضرورت نہیں، اسی میں زکوٰۃ رکھی ہے، اور جو مال ضرورت میں مشغول ہے اس میں زکوٰۃ نہیں رکھی، شریعت نے یہ طے کیا ہے کہ جو قابلِ زکوٰۃ اموال ہیں ان میں ایک معتد بہ مقدار (نصاب) ہونی چاہئے، جیب میں صرف دس ڈالر ہونے سے بے نیازی نہیں پائی جاتی، پھر وہ نصاب سال بھر اس کے پاس رہے، معلوم ہوا کہ اس کی ضرورت سے زائد ہے، اور ضرورت سے زائد ہونے کا نام غناء (بے نیازی) ہے، یہی مالداری ہے، صبح کو لاکھ دو لاکھ آئے، شام کو خرچ ہو گئے تو اس کا نام بے نیازی نہیں ہے۔

زکوٰۃ اصل مال میں نہیں، بڑھے ہوئے مال میں ہے:

سوم: شریعت نے مال میں جو بڑھوتری ہوتی ہے اس میں زکوٰۃ واجب کی ہے، اصل مال میں زکوٰۃ واجب نہیں کی۔ ایک آدمی کے پاس چالیس بکریاں ہیں، وہ ایک سال تک اس کی ملکیت میں رہیں تو سال بھر میں پندرہ بیس بچے پیدا ہو جائیں گے، اب شریعت کہتی ہے کہ جب سال پورا ہو جائے تو ایک بکری زکوٰۃ میں دو، بیس بکریاں بڑھ گئیں تو اگر شریعت نے ایک بکری لے لی تو کیا پریشانی کھڑی ہوئی؟ چالیس بکریاں آتے ہی فوراً ایک بکری نہیں لی، سال پورا ہونے پر لی ہے۔ یہی حال گایوں بھینسوں کا ہے۔ غرض شریعت نے زکوٰۃ زائد اموال میں رکھی ہے، اصل مال میں زکوٰۃ نہیں رکھی۔

پھر اس میں یہ بھی شرط ہے کہ جانور سائمہ ہوں، یعنی سال کا اکثر حصہ جنگل کی مباح گھاس چرتے ہوں تو زکوٰۃ ہے، اور اگر کوئی اپنے کھیت میں گھاس اگا کر جانوروں کو کھلائے یا چارہ خرید کر جانوروں کو کھلائے (یعنی جانور علوفہ ہوں) تو زکوٰۃ نہیں۔

اسی طرح عوامل یعنی وہ جانور جو سواری میں، ہل جوتنے میں، گاڑی وغیرہ کھینچنے میں

استعمال ہوتے ہیں ان میں بھی زکوٰۃ نہیں رکھی، یہ عوامل اگر مادہ ہوں تب بھی ان میں زکوٰۃ نہیں۔

اسی طرح اگر سب جانور نابالغ (بچے) ہوں تو بھی ان میں زکوٰۃ نہیں، کیونکہ وہ بچے نہیں دیں گے، اس لئے بڑھوتری نہیں ہوسکتی۔

سوال: جانور تو بچے دیتے ہیں لیکن گولڈ سلور اور کرنسی کہاں بچے دیتے ہیں؟ مالِ تجارت بے شک بڑھتا ہے، مگر مذکورہ تین چیزیں نہیں بڑھتیں، پھر ان میں زکوٰۃ کیوں ہے؟

جواب: شریعت نے ان میں نماء تقدیری مانا ہے یعنی بڑھوتری فرض کرلی ہے، کیونکہ سونا، چاندی اور کرنسی کاروبار میں لگانے کی چیزیں ہیں، اب اگر کوئی بینک یا تجوری میں رکھے رہے تو یہ اس کی کوتاہی ہے، گولڈ، سلور اور کرنسی کاروبار میں لگا کر بڑھانے کے لئے ہیں۔

جو اموال گردش میں رہتے ہیں ان میں زکوٰۃ کم رکھی ہے:

چہارم: پھر شریعت نے ایک لحاظ یہ بھی کیا ہے کہ جو اموال گردش میں رہتے ہیں ان میں زکوٰۃ کم رکھی ہے اور جو گردش میں نہیں رہتے ان میں نسبتاً زکات زیادہ رکھی ہے، کھیت میں دس من پیداوار ہو تو ایک من عشر واجب ہوگا یعنی دس فیصد، اور گولڈ، سلور، کرنسی اور اموال تجارت میں چالیس فیصد زکات ہے، کیونکہ زمین میں سال میں ایک دو مرتبہ پیداوار ہوتی ہے اس لئے اس میں زکوٰۃ زیادہ رکھی اور گولڈ وغیرہ اموال گردش میں رہتے ہیں اس لئے ان میں زکوٰۃ کم رکھی، تاکہ لوگوں پر زکوٰۃ ادا کرنے میں زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

سونا، چاندی اور اموال تجارت کا نصاب:

اگر کسی کے پاس صرف چاندی ہو تو اس کا نصاب چھ سو بارہ گرام چاندی ہے، یہ دو سو درہم کا وزن ہے، یہی ساڑھے باون تولہ ہے۔ اور اگر کسی کے پاس صرف سونا ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ سونا چاندی پر محمول ہے، یعنی چھ سو بارہ گرام چاندی کی قیمت کے بقدر سونا ہو تو وہ صاحبِ نصاب ہے، پس سونے کا کوئی مستقل نصاب نہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور متقدمین میں سے کئی حضرات کی یہی رائے تھی۔ اور حضور کے زمانہ میں دس ایک کا حساب تھا، ایک دینار کے دس درہم آتے تھے، حدیثوں میں جو بیس دینار آئے ہیں وہ دو سو درہم کی قیمت تھی، بعد میں یہ حساب بدل گیا، چاندی بہت نیچے آگئی اور سونا بہت اوپر چلا گیا، پس آج بھی چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

لیکن چاروں مذاہب میں فتوی اس پر ہے کہ چاندی کا نصاب الگ ہے، اور سونے کا نصاب الگ ہے ساڑھے سات تولے (بیس مثقال) یعنی ستاسی گرام، پوئنٹ پندرہ (87,15) سونے کا نصاب ہے، اور اس سلسلہ میں تین حدیثیں ہیں اور تینوں میں ضعف ہے، مگر تینوں مل کر قوی ہو جاتی ہیں۔

مخلوط اموال کا نصاب:

اور اگر تھوڑی چاندی اور تھوڑا سونا ہو، یا ساتھ میں کرنسی بھی ہو تو چاندی کے نصاب کا اعتبار ہے، چاندی کی قیمت بازار میں پوچھ کر کاغذ پر لکھو، سونے کی قیمت پوچھ کر اس کو بھی کاغذ پر لکھو اور کرنسی کو بھی ملاؤ، پھر اگر ٹوٹل: چاندی کے نصاب (چھ سو بارہ گرام) کی قیمت کے بقدر ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہے۔ غرض ایسی صورت میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا، سونے کے نصاب کا اعتبار نہیں ہوگا، کیونکہ وہی انفع للفقراء ہے، فتوی چاروں ائمہ کے یہاں اس پر ہے۔

قیمتی کرنسی میں سونے کا اعتبار ہے یا چاندی کا؟

جو ہیوی (بھاری) کرنسیاں ہیں میں ان میں سونے کے نصاب کا اعتبار کرتا ہوں، پس جب بھاری کرنسی میں گولڈ کے نصاب کا اعتبار کرلیا تو اگر ٹوٹل ستاسی گرام کے بقدر ہو جائے اور اتنی مالیت پورے سال کسی کے پاس رہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، میں چاندی کے نصاب کا اعتبار بھاری کرنسی میں نہیں کرتا، کیونکہ وہ بے قدر مالیت ہوتی ہے، اور بھاری کرنسیاں: پاؤنڈ، ڈالر اور دینار ہیں۔ لیکن فتوی چاروں ائمہ کے یہاں اس پر ہے کہ چاندی کے نصاب کا اعتبار ہے۔

اموالِ زکوٰۃ کے نصابوں کی پانچ اجناس، اور بڑا نصاب:

اموالِ زکات کی پانچ اجناس ہیں، اور وہ الگ الگ ہیں ایک کو دوسرے کے ساتھ نہیں ملائیں گے اور ہر جنس کا ایک نصاب طے کیا گیا ہے، اور یہ بڑا نصاب کہلاتا ہے، اس کے علاوہ ایک چھوٹا نصاب بھی ہے، چھوٹے نصاب سے پانچ احکام متعلق ہیں اور بڑے نصاب سے چھ۔

پہلی جنس: اگر کسی کے پاس اونٹ ہوں اور وہ جنگل کی مباح گھاس سال کا بیشتر حصہ کھاتے ہوں (یعنی سائمہ ہوں) تو ان کا نصاب پانچ اونٹ ہیں، اس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔

دوسری جنس: گائیں اور بھینسیں ایک ہی خاندان ہیں، ان کا نصاب تیس ہے، بشرطیکہ وہ سائمہ ہوں علوفہ نہ ہوں، تیس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔

تیسری جنس: بھیڑ بکریاں بھی ایک خاندان ہیں، ان کا نصاب چالیس ہے، بشرطیکہ وہ سائمہ ہوں۔ چالیس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔

چوتھی جنس: زمین کی پیداوار ہے۔ اگر سینچائی پر خرچہ کیا گیا ہے یا محنت کی گئی ہے تو پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہے، اور اگر سینچائی پر خرچہ نہیں کیا گیا، بارش سے پیداوار ہوئی ہے تو پیداوار کا دسواں حصہ واجب ہے، اس کے علاوہ دوسرے خرچے: ہل جوتنا، بیج ڈالنا، کھاد ڈالنا وغیرہ نہیں دیکھے جائیں گے، اس زکوٰۃ کو عشر کہتے ہیں اور یہ حکومت وصول کرتی ہے، اور غریبوں پر خرچ کرتی ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کی زمینوں میں عشر کا مسئلہ:

ملک تین قسم کے ہیں: ایک: اسلامی ملک۔ دوسرا: وہ ملک جو کبھی اسلامی تھا پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا جیسے انڈیا۔ تیسرا: وہ ملک جو کبھی بھی اسلامی ملک نہیں بنا، جیسے آپ کا یہ ملک کناڈا۔ ان سب کی زمینوں کے احکام الگ الگ ہیں۔

وہ ملک جو اسلامی ہیں ان کی زمینیں دو قسم کی ہیں: ایک: وہ ہیں جو قدرتی دریاؤں سے سینچی جاتی ہیں اور شروع سے زمین کے مالک مسلمان ہیں تو اس میں عشر (دسواں حصہ)

واجب ہے۔ اور اگر وہ زمینیں کنوؤں سے یا ٹیوب ویل سے سینچی جاتی ہیں تو اس میں بیسواں حصہ واجب ہے۔ دوسری قسم: وہ زمینیں ہیں جو اگرچہ قدرتی دریاؤں سے سینچی گئی ہوں مگر وہ زمینیں پہلے غیر مسلموں کے پاس رہی ہیں، ان کے پاس سے مسلمانوں کے پاس آئی ہیں تو ان میں عشر نہیں، بلکہ بیگہ (خراج) لیا جاتا ہے، خراج حکومت لیتی ہے اور اس کا بڑا حصہ فوج پر اور ملک کی ترقی میں خرچ ہوتا ہے۔

اور وہ ملک جو کبھی مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے ہیں، پھر وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے جیسے انڈیا تو ایسے ملکوں کے بارے میں فتوی یہ ہے کہ چونکہ وہاں گورنمنٹ زمینوں سے بیگہ لیتی ہے اس لئے ان زمینوں میں عشر واجب نہیں۔ کیونکہ دو مؤنتیں (خرچ) جمع نہیں ہوتیں، البتہ مستحب یہ ہے کہ ان کا بھی عشر نکالا جائے۔

تیسرے وہ ملک ہیں جو کبھی بھی اسلامی ملک نہیں بنے، جیسے کناڈا۔ اس میں بہ درجۂ اولی عشر واجب نہیں، جب انڈیا جیسے ملک میں عشر واجب نہیں تو اس تیسری قسم کے ملکوں میں عشر کیسے واجب ہوگا؟ یہاں بھی صرف استحباب ہوگا۔ بہر حال یہ جو زمین کا عشر لیا جاتا ہے وہ زکوٰۃ کے حکم میں ہے اور یہ ایک مستقل جنس ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

پانچویں جنس میں چار چیزیں شامل ہیں، اور چاروں مل کر ایک جنس ہیں: سونا، چاندی، کرنسی اور اموالِ تجارت۔ اگر صرف سونا ہے تو اس کا نصاب گذر چکا، اگر صرف چاندی ہے تو اس کا نصاب بھی گذر چکا، اگر صرف کرنسی یا اموالِ تجارت ہیں تو چاندی کے نصاب سے موازنہ کریں گے یا سونے کے نصاب سے؟ مفتیوں کا فتوی یہ ہے کہ چاندی کے نصاب سے موازنہ کریں گے۔ اور میں کہتا ہوں: جو بھاری کرنسیاں ہیں ان کو سونے کے نصاب سے موازنہ کریں گے۔

اور اگر تھوڑا سونا، تھوڑی چاندی، تھوڑی کرنسی اور تھوڑا مال تجارت ہے تو سب کی قیمت لگائیں گے، اگر چاندی یا سونے کے نصاب کے بقدر ہو جائے تو حولانِ حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یہ پانچ اجناس ہیں، ان میں سے زمین کی پیداوار کو الگ کردیں، باقی چار اجناس بڑا نصاب ہیں۔ یہ قدرتِ مُیَسِّرَہْ والا نصاب ہے۔

چھوٹا نصاب اور اس سے متعلق احکام:

اور ایک چھوٹا نصاب ہے یعنی قدرتِ مُمَکِّنَة والا نصاب، اور وہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی حاجاتِ اصلیہ میں جو چیزیں مشغول ہیں ان کو الگ کرلیا جائے اور جو ضرورت سے زائد چیزیں ہیں ان کی قیمت لگائی جائے، اور وہ نصاب میں گنی جائیں۔ جیسے اتنی زمین جس سے اس کی فیملی کا گذارہ چل سکے اس کی حاجت میں مشغول ہے، اس سے زائد زمین قیمت لگا کر نصاب میں آئے گی، اگر مکانات ہیں اور ان کے کرایوں سے اس کا گذارہ ہوتا ہے تو اتنے مکان جن سے اس کا اور اس کی فیملی کا گذارہ ہوسکے الگ کرلئے جائیں گے، اس سے زائد جو مکان ہیں ان کی قیمت لگ کر نصاب میں آئے گی۔ گھر میں برتن بھرے ہوئے ہیں، مردوں یا عورتوں کے پاس بے حساب کپڑے ہیں پس جو برتن یا کپڑے ضرورت کے ہیں ان کو الگ کرلیا جائے گا، باقی زائد کپڑے اور برتن قیمت لگا کر نصاب میں آئیں گے۔ پھر چاندی کے نصاب کے بقدر یا سونے کے نصاب کے بقدر مالیت ہوجائے تو وہ چھوٹے نصاب کا مالک ہوگیا۔

چھوٹے نصاب سے پانچ احکام متعلق ہیں: ۱- اس پر قربانی واجب ہے۔ ۲- اس پر صدقۂ فطر واجب ہے۔ ۳- اس کے لئے زکوٰۃ لینا حرام ہے وہ غنی ہے، اس کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ ۴- اس پر حج فرض ہے۔ اگر رقم حج کے لئے کافی ہو۔ ۵- اس پر دوھیال اور ننھیال کے ایسے مرد یا عورت کا جو کمانے کے قابل نہیں، اور غریب ہیں ان کا نفقہ واجب ہے۔

اور جس کے پاس بڑا نصاب ہے یعنی پانچ اونٹ یا تیس گائیں بھینسیں یا چالیس بکریاں یا سونا، چاندی، کرنسی یا اموالِ تجارت کا نصاب ہے: اس پر چھ چیزیں واجب ہیں۔ پانچ وہی اور چھٹی چیز: اس پر زکوٰۃ نکالنا فرض ہے۔

تجارت کا مال کونسا ہے؟

وہ چیز جسے خریدا گیا ہے بیچنے کی نیت سے: وہ تجارت کا مال ہے اور اگر خریدتے وقت

مکتبہ حجاز دیوبند

بیچنے کی نیت نہیں تھی تو وہ تجارت کا مال نہیں۔ پھر وہ کیوں خریدی ہے؟ خریدی تھی کرایہ پر دینے کے لئے اور اس سے پیسا کمانے کے لئے تو یہ تجارت کی چیز نہیں ہے۔ یا اس لئے خریدی تھی کہ بچے بڑے ہوں گے اور مکان کی ضرورت پڑے گی پس ان کے مکان اسی زمین میں بناویں گے اور اگر کوئی اچھی قیمت آئے گی تو بیچ بھی دیں گے۔ یہ بھی تجارت کی چیز نہیں۔ یا ہمارے کھیت میں جو پیداوار ہوتی ہے اور وہ کھانے کی نہیں ہے جیسے کپاس، سرسوں وغیرہ، کسان لامحالہ اس کو بیچے گا، یا کھانے کا اناج پیدا ہوتا ہے، مگر تیس من ہم کھائیں گے اور پیداوار ہوئی ہے دو سو من، پس باقی کسان بیچے گا، مگر یہ بھی تجارت کا مال نہیں، وہ جب تک رکھی رہے گی اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں، جب اسے بیچ دیں گے اور پیسہ بیلنس میں آجائے گا تو بیلنس پر جب سال پورا ہوگا تو اس نئے پیسے پر بھی بیلنس میں شامل ہو کر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ اگر کسی نے کپاس، سرسوں اس لئے خریدا ہے کہ جب ریٹ بڑھیں گے بیچ دیں گے تو یہ تجارت کا مال ہے، اسی طرح اگر مکان خریدا ہے کرایہ پر اٹھانے کے لئے، بیچنے کے لئے نہیں خریدا، ہاں اگر کبھی اچھے پیسے ملے تو بیچ بھی دیں گے تو اس مکان پر زکوٰۃ نہیں، بلکہ اس کا کرایہ بیلنس میں جائے گا اور سال پورا ہونے پر کرایہ پر بیلنس میں شامل ہو کر زکوٰۃ آئے گی۔

زکوٰۃ میں کونسا قرض منہا اور کونسا شامل ہوتا ہے؟

جاننا چاہئے کہ زکوٰۃ کا حساب کرتے وقت بیلنس میں سے سب سے پہلے آپ قرضہ لیس (منہا) کریں، پھر جو باقی بچے اس پر زکوٰۃ آئے گی، اور قرض تین قسم کے ہیں:

۱-قوی قرض: جو آپ کسی بھی وقت وصول کر سکتے ہیں یا آپ سے کسی بھی وقت مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ قرض حسنہ ہے، یہ قرض اگر آپ کو لینا ہے تو بیلنس میں ایڈ (شامل) ہوگا اور اگر دینا ہے تو لیس (منہا) ہوگا۔

۲-ضعیف قرض: جیسے بیوی کے دو مہر ہوتے ہیں، ایک کیش (معجّل) دوسرا ادھار (مؤجل) کیش مہر قوی قرض ہے وہ بہر حال دینا ہے، لیکن جو ادھار مہر ہے وہ موت یا طلاق تک نہیں مانگا جاتا، پس وہ کمزور قرض ہے، لہٰذا عورت مہر کو اپنے بیلنس میں ایڈ نہیں کرے گی

اور شوہر اپنے بیلنس سے لیس نہیں کرے گا۔

اور آج اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں، لوگ قسطوں پر گھر خریدتے ہیں، مشین خریدتے ہیں، پروپرٹی، ٹی وی وغیرہ خریدتے ہیں، پس جو قسط پک گئی وہ قوی قرض ہے اور جو قسطیں ابھی کچی ہیں وہ سب ضعیف قرضے ہیں، وہ نہ لیس ہونگے نہ ایڈ، کیونکہ وہ قسطیں ابھی مانگنے کا حق نہیں، اور جو قسط پک گئی جو کسی بھی وقت مانگی جاسکتی ہے وہ قوی قرضہ ہے۔

مصنوعات اور خام مال کا حکم:

اس کے علاوہ ایک نئی شکل پروڈکشن کی نکلی ہے، بڑے بڑے کارخانے ہوتے ہیں، ان میں لاکھوں روپے کا خام مال ہوتا ہے، وہ خام مال بیچنے کے لئے نہیں ہوتا، بلکہ مصنوعات اس سے تیار ہوتی ہیں، پھر وہ مصنوعات بیچی جاتی ہے، یا جیسے مرغی فارم میں مرغیاں انڈے دینے کے لئے ہوتی ہے، بیچنے کے لئے نہیں ہوتیں، یا بیچنے کے لئے ہوتی ہیں، مگر جب ایک کلو کی ہوجائیں گی تب بکیں گی، اس سے پہلے نہیں بکیں گی۔ یہ سب پروڈکشن ہے۔

اس بارے میں دارالعلوم دیوبند کا فتوی یہ ہے کہ خام مال پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، وہ فروختگی کا مال ہے، لیکن میں خام مال کو تجارت کے مال میں نہیں شمار کرتا، کیونکہ جیسے مشینوں میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیونکہ وہ ذرائع اور آلات ہیں ایسے ہی یہ خام مال بھی ذریعہ ہے، پھر جب اس کی مصنوعات تیار ہوگئیں تو اب بھی ان پر زکوٰۃ نہیں، جیسے آپ کے کھیت میں گیہوں پیدا ہوئے تو جب تک وہ بک نہ جائیں ان پر زکوٰۃ نہیں، ایسے ہی کارخانے کا معاملہ ہے، جو چیز تیار ہوئی ہے اس پر زکوٰۃ نہیں، ہاں جب مال بک جائے تو اس کی قیمت بیلنس میں ایڈ ہوگی اور بیلنس پر جب سال پورا ہوگا تو اس پر بھی زکوٰۃ آئے گی۔ لیکن دارالافتاء کے نزدیک یہ خام مال تجارتی مال ہے اس پر زکوٰۃ آئے گی، لہٰذا اگر کوئی دارالافتاء کے فتوی پر عمل کرے تو اس میں احتیاط ہے۔

۳- متوسط قرض: کسی نے قرض لے رکھا ہے، وہ انکار بھی نہیں کرتا اور دیتا بھی نہیں، پس اگر ایسا قرض دینا ہے تو بیلنس میں سے لیس نہیں ہوگا، دینا ہے تو دیدو، اس کو روک کیوں

رکھا ہے۔ لینا ہے تو اس میں ہمارا اختیار نہیں ہے، لہٰذا وہ فی الحال ایڈ نہیں ہوگا لیکن جب وصول ہوگا گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔

تجارتی مال میں اعتبار مارکیٹ ویلیو کا ہے یا خرید قیمت کا یا نفع کا؟

تجارتی اموال میں کونسی قیمت کا اعتبار ہے، خرید قیمت کا یا جو ہم بیچیں گے اس قیمت کا یا مارکیٹ ویلیو کا؟

جواب: مارکیٹ ویلیو کا اعتبار ہے اور خریدی ہوئی قیمت اور مارکیٹ ویلیو عام طور پر ایک ہوتے ہیں، اگر مدت لمبی نہیں ہوئی اور اگر مدت لمبی ہوگئی جیسے ایک پلاٹ خریدا ہے اور تین سال سے پڑا ہے تو اب مارکیٹ ویلیو بدلے گی، گھٹ بھی سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے، لیکن اگر مال آج آیا اور مہینہ میں ہی بک گیا تو اس کی خرید قیمت اور مارکیٹ ویلیو عام طور پر ایک ہوتی ہے۔ اور جو نفع کے ساتھ بیچنا ہے جیسے ایک روپے کی چیز ڈیڑھ روپے میں بکے گی تو اس نفع (پچاس پیسے) کا اعتبار زکوٰۃ کے باب میں نہیں ہے وہ نفع ہے جب ملے گا ملے گا، اس کا ملنا کوئی ضروری نہیں، ہوسکتا ہے اس سے پہلے چوری ہوجائے یا قیمت گھٹ جائے، لہٰذا اگر مارکیٹ ویلیو اور خرید کا زمانہ قریب ہے تو وہاں تو دونوں ایک ہی ہوتے ہیں اور اگر زمانہ بعید ہوگیا ہے تو مارکیٹ ویلیو کا اعتبار ہوگا، خرید کا اعتبار نہیں۔ یہ چند ضروری مسائل ہیں جو میں نے آپ حضرت کے سامنے عرض کیے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

٦

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزوں کے تعلق سے رمضان کی تخصیص

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ، هُدًى لِّلنَّاسِ، وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ، فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: من صام رمضان إیمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه، ومن قام رمضان إیمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه، ومن قام لیلة القدر غفرله ماتقدم من ذنبه۔

مکتبہ حجاز دیوبند

بزرگو اور بھائیو! یہ مبارک مہینہ جس سے ہم اور آپ گذر رہے ہیں: رمضان شریف کا مہینہ ہے، اور اللہ تعالیٰ جس کو جتنی توفیق دیتے ہیں اتنا وہ نیک اعمال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس مبارک مہینہ کی قدر کرنے کی اور زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

اس مبارک مہینہ کے تعلق سے قرآن وحدیث میں بہت سی باتیں ذکر کی گئیں ہیں، اس وقت مجھے وہ سب ذکر نہیں کرنی، وہ آپ حضرات نے سن بھی رکھی ہونگی اور پڑھ بھی رکھی ہونگی، مجھے آج مختصر وقت میں صرف دو باتیں عرض کرنی ہیں۔

خاص رمضان کے روزے کیوں فرض کئے گئے ہیں؟

پہلی بات: قرآنِ کریم میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے خاص رمضان کے روزے کیوں لازم کئے گئے ہیں؟ دوسرے گیارہ مہینوں میں روزے کیوں نہیں رکھے گئے؟ آدمی کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ رمضان کے روزے فرض کرنے

میں کوئی نہ کوئی حکمت ہونی چاہئے، اگر چہ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم اللہ کے فیصلوں پر اعتراض نہیں کرتے، مگر حکمت جاننا چاہتے ہیں کہ اللہ نے باقی گیارہ مہینوں میں روزے فرض نہیں کیئے، صرف اسی مہینہ میں فرض کیئے، آخر اس میں حکمت کیا ہے؟

حکمت جاننے کا ہر مؤمن کا جذبہ ہوتا ہے، قرآن وحدیث میں بہت سے احکام کی اللہ نے حکمتیں بیان کی ہیں، اللہ کے رسولؐ نے بھی حکمتیں بیان کی ہیں، اور جو باقی چھوڑی ہیں وہ علمائے امت نے بیان کی ہیں۔

کپڑا ٹخنے سے اوپر پہننے کی حکمت:

مثلاً احادیثِ شریفہ میں یہ حکم آیا ہے کہ اپنا کپڑا خواہ لنگی ہو، پائجامہ ہو، پتلون ہو، ٹخنے سے نیچے مت جانے دو، اگر ٹخنہ چھپ گیا تو جتنے حصہ کو کپڑا چھپائے گا وہ حصہ جہنم میں جائے گا، اور ایسا تو ہوتا نہیں کہ ایک انگلی جہنم میں جائے اور باقی جسم جنت میں جائے۔ جب کچھ حصہ جہنم میں جائے گا تو باقی جسم بھی جہنم میں جائے گا۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ جو شخص ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہنتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف مہربانی کی نظر نہیں فرماتے۔ یہ حکم سبھی مسلمان جانتے ہیں، لیکن آدمی کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حکم کیوں ہے؟ اس میں مصلحت کیا ہے؟ یہ مصلحت اللہ کے رسول ﷺ نے ایک موقعہ پر سمجھائی ہے۔

شمائل ترمذی میں مختصر روایت ہے اور مفصل روایت دوسری کتابوں میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ بازار تشریف لے گئے، وہاں ایک صحابی کھڑے تھے، وہ دوسری طرف منہ کر کے کھڑے تھے، حضورؐ نے پیچھے سے آکر دونوں ہاتھوں سے ان کی آنکھیں دبا دیں، انھوں نے کہا: کون ہے؟ چھوڑ مجھے! لیکن حضورؐ نے دبائے رکھا، چھوڑا نہیں، اب جواُن صحابی نے پہچاننے کی کوشش کی تو پہچان گئے کہ یہ حضور اکرم ﷺ ہیں، اب انھوں نے آنکھیں چھڑانے کے بجائے اپنی پیٹھ برکت حاصل کرنے کے لئے حضورؐ کے سینہ سے لگادی، کیونکہ ایسا موقعہ پھر کہاں ملے گا، یہ موقعہ تو آج اتفاق سے مل گیا۔ اب حضورؐ نے ہاتھ ہٹالئے، کیونکہ کھیل ختم ہوگیا۔

انہی صحابی کے لئے آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے: أَزْهَرُ بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْهُ: ازہر ہمارا گاؤں ہے اور ہم اس کا شہر ہیں، یہ صحابی دیہات کے تھے، اور ہر جمعہ کو جمعہ پڑھنے کے لئے مدینہ منورہ آتے تھے، اور جب دیہات سے آتے تھے تو دیہات میں کھیتوں میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں، سبزیاں، ترکاریاں وغیرہ، ان سب کو جمع کر کے حضورؐ کے لئے ہدیہ لایا کرتے تھے، اور جمعہ پڑھ کر اپنے گاؤں لوٹ جاتے تھے، لوٹتے وقت حضورؐ گھر کی ضروریات مثلاً نمک، مرچ، ہلدی وغیرہ بازار سے خرید کر ان کو ہدیہ دیتے تھے۔ اس بات کی طرف حضورؐ نے اشارہ فرمایا ہے کہ ازہر ہمارا گاؤں ہے یعنی وہ ہماری دیہات کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور ہم اس کا شہر ہیں یعنی ان کی شہری ضرورتیں ہم پورا کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے حضرت ازہر کی لنگی کی طرف دیکھا تو وہ ٹخنوں سے نیچے تھی، حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اِرْفَعْ إِزَارَكَ فَإِنَّهُ أَنْقٰى وَأَبْقٰى: لنگی اونچی اٹھاؤ، لنگی اونچی باندھنے میں دو فائدے ہیں: ایک: اس سے کپڑا پاکیزہ اور صاف رہتا ہے، نیچے ہوگی تو زمین پر لگے گی، اور جوتوں کے ساتھ لگے گی، جو لوگ نیچے تک کپڑا پہنتے ہیں آپ دیکھیں: ان کے نیچے کے حصے سڑے ہوئے اور بدبودار ہوتے ہیں، پس حضورؐ نے کپڑے کو اونچا رکھنے میں ایک حکمت تو یہ سمجھائی کہ اس سے کپڑا صاف رہتا ہے۔

کیا روزانہ کپڑے بدلنے ضروری ہیں؟

یہ بہت بڑی حکمت ہے کہ آدمی صاف ستھرا رہے، اور یہ جو غیر مسلم امریکہ ویورپ وغیرہ میں روزانہ کپڑے بدلتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی بعض مسلمان بھی روزانہ کپڑے بدلتے ہیں: یہ کوّے ہیں جو کبوتر کی چال چلتے ہیں! ہمیں روزانہ کپڑے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہمارے لئے تو ہفتہ میں دو مرتبہ کپڑے بدلنا کافی ہے۔

اور ان کو روزانہ اس لئے بدلنے پڑتے ہیں کہ وہ کاغذ سے استنجاء کرتے ہیں، پانی استعمال نہیں کرتے، پس جب کاغذ سے استنجاء کر کے پتلون پہنیں گے اور وہ بھی تنگ تو وہ شام تک بیت الخلاء بن جائے گی، اتنی سڑ جائے گی کہ دوبارہ پہننے کے قابل نہیں رہے گی، اس لئے دوسرے دن کپڑے بدلنا ان کی مجبوری ہے، لیکن مسلمانوں کو کیا آفت ہے کہ وہ

روزانہ کپڑے بدلتے ہیں، مسلمان تو چھوٹا استنجاء کرتا ہے تو پانی استعمال کرتا ہے، بڑا استنجاء کرتا ہے تو پانی استعمال کرتا ہے، اس کے کپڑوں اور بدن پر تو ناپاکی کا ایک قطرہ بھی نہیں لگتا، پھر اس کے کپڑے صبح سے شام تک کیسے میلے ہوگئے کہ دوسرے دن ان کو بدل دیا جائے۔

بہر حال جو مسلمان نماز پڑھتا ہے وہ ہمیشہ پاک صاف رہتا ہے، اب اگر اس کا کپڑا نیچے تک لٹکا ہوا ہوگا تو وہ جوتے پر بھی لگے گا، زمین پر بھی لگے گا اور کسی گندی جگہ پر بھی لگ سکتا ہے، اور جب نچلا حصہ ناپاک ہوگیا تو اب وہ نماز کیسے پڑھے گا؟ لہٰذا اس کو اپنی لنگی، پائجامہ، پتلون وغیرہ جو بھی اس نے پہن رکھا ہے، اس کو زمین سے اتنا اوپر رکھنا چاہیئے کہ ناپاکی سے لگنے کا موقعہ ہی نہ آئے، پس ایک حکمت تو حضورؐ نے یہ بیان فرمائی کہ اس میں صفائی ہے، پاکیزگی ہے!

دوسری حکمت: حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ اگر لنگی اونچی پہنی جائے گی تو کپڑا جلدی پھٹے گا نہیں اور نیچی پہنے گا تو چلتے وقت کپڑا پاؤں میں الجھے گا اور جب کپڑا پاؤں میں پھنسے گا تو آدمی چلتے چلتے گر بھی سکتا ہے اور کپڑا بھی جلدی پھٹے گا۔ اور اونچا پہنا ہوگا تو چلتے وقت کپڑا الجھے گا نہیں اور جلدی پھٹے گا بھی نہیں، یہ کپڑا اونچا پہننے میں اقتصادی فائدہ ہے۔

جب یہ دو باتیں حضورؐ نے حضرت ازہر رضی اللہ عنہ کو بتائیں تو ان میں سے جو پہلی حکمت تھی اس کے بارے میں تو انھوں نے کچھ نہیں کہا، لیکن جو دوسری حکمت تھی کہ کپڑا زیادہ دنوں تک چلتا ہے اس کے بارے میں انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! إِنَّمَا هِيَ بَرْدَةٌ مَلْحَاءُ: اے اللہ کے رسول! یہ تو لٹھے کی لنگی ہے، چار پیسے کی ہے، جلدی پھٹ جائے گی تو کیا پریشانی ہے! کوئی قیمتی کپڑا تو ہے نہیں کہ آدمی اس کو احتیاط سے استعمال کرے، انھوں نے بات ٹھیک ہی کہی تھی، مگر حضورؐ نے ان کی بات کا جواب نہ دے کر بات دوسری طرف پھیر دی اور ارشاد فرمایا: أَمَالَكَ فِيَّ أُسْوَةَ: کیا تیرے لئے میرے اندر نمونۂ عمل نہیں؟!

اصل بات کا جواب نہ دینا اور بات کا رخ پھیر دینا:

جواب دینے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ کسی سے گفتگو ہو رہی ہو اور مخاطب ہماری بات

کا جواب دیدے تو پھر اس کی بات کا جواب دینا بھی ایک طریقہ ہے، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بات کا رخ پھیر دیا جائے۔ قرآنِ کریم میں یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس بادشاہ کے پاس جو خدائی کا دعوے دار تھا اللہ کی دعوت لے کر گئے اور اللہ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا: ﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ﴾: میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، بادشاہ نے جواب دیا: یہ کام تو میں بھی کرتا ہوں ﴿أَنَا أُحْیِیْ وَأُمِیْتُ﴾: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اور اس نے حکم دیا کہ جیل خانے سے ایک ایسے آدمی کو جس کو پھانسی کا حکم ہو چکا ہے بلاؤ، جب وہ لایا گیا تو نمرود نے کہا: جا میں نے تجھے معاف کر دیا! اور ایک بے گناہ راستہ چلتے ہوئے آدمی کو بلایا اور اس کی گردن اڑا دی اور کہا: دیکھو میں نے اس کو قتل کر دیا جس کو پھانسی کا حکم ہو گیا تھا، میں نے اس کو معاف کر دیا، پس زندہ تو میں بھی کرتا ہوں اور مارتا بھی ہوں۔

اس بے وقوف کو کون سمجھائے کہ اس کا نام زندہ کرنا اور مارنا نہیں ہے، مگر وہ بادشاہ تھا، خدائی کا دعویدار تھا، غرور اس کے دماغ میں بھرا ہوا تھا، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، بلکہ دوسری دلیل پیش کی، فرمایا: میرا پروردگار وہ ہے جو روزانہ مشرق سے سورج نکالتا ہے اگر تو خدا ہے تو کل سورج مغرب سے نکال: ﴿فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ﴾: پس وہ حیران رہ گیا کہ کیا جواب دے۔

مجھے اس مثال سے سمجھانا یہ ہے کہ کسی سے گفتگو ہو رہی ہو اور وہ ہماری بات کا جواب دیدے اور وہ جواب غلط ہو مگر اس کی غلطی واضح کرنے کا موقع نہ ہو تو پھر جواب کا جواب دینے سے بہتر یہ ہے کہ بات کا رخ پھیر دیا جائے اور دوسرے انداز سے بات کی جائے۔

غرض: جب حضرت ازہر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ تو لٹھے کی لنگی ہے! چار پیسے کی ہے! جلدی پھٹ جائے گی تو کیا نقصان ہے؟ سسری کو پھینک دیں گے اور دوسری لے آئیں گے، پس حضورؐ نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا حالانکہ اس کا جواب تھا۔

میانہ روی سے خرچ کرنا آدھی کمائی ہے:

اس کا جواب کیا ہے؟ جواب: مال اللہ کی نعمت ہے اور انسان مال میں منیجر ہے، مالک

نہیں ہے﴿جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾: اللہ نے ہمیں مال میں منیجر بنایا ہے، پس ایک ایک پیسہ صحیح طریقہ پر استعمال کرنا: یہ اسلام کی تعلیم ہے، حدیث شریف میں ہے: **الاقتصاد نصف المعيشة**: میانہ روی سے خرچ کرنا آدھی کمائی ہے، اگر آپ مہینہ میں پانچ ہزار روپے کماتے ہیں تو ڈھنگ سے خرچ کرنے کی صورت میں وہ دس ہزار کا کام دیں گے، اور اگر آپ ان کو بے ڈھنگے طریقہ پر خرچ کریں گے تو وہی پانچ ہزار روپے ڈھائی ہزار کا کام کریں گے۔

مال مایۂ زندگانی ہے:

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے مال کو لوگوں کے لئے سہارا فرمایا ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾: اور نہ دو تم کم عقلوں (یتیموں) کو ان کے وہ مال جس کو اللہ نے تمہارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے، یعنی زندگی مال کے سہارے قائم ہے۔ اس آیت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مال کتنی اہم چیز ہے، اتنی اہم چیز کو اناپ شناپ اڑا دینا سمجھ داری کا کام نہیں، چیز جتنی اہم ہوتی ہے اتنی ہی احتیاط کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے، لہٰذا اگر آپ یہ سمجھیں کہ میرے پاس تو پیسے بہت ہیں، اس لئے ایک گڈی صبح چولہے میں جلا کر ناشتہ پکائیں، اور ایک گڈی شام کو تو مال کئی دن چلے گا؟ ٹھیک ہے آپ کے پاس مال بہت ہے، مگر اس طرح گڈیاں جلا جلا کر کھانا پکانا حرام ہے، اس لئے کہ پیسہ لوگوں کے لئے سہارا ہے۔ اس کو فضول خرچ کرنا جائز نہیں۔

فرد کی مالداری قوم کی مالداری ہے:

یہاں ایک اہم بات سمجھ لینی چاہئے، اور وہ ایک سوال کا جواب بھی ہے، سوال یہ ہے کہ ہر فرد کے پاس مال کہاں ہے، مال تو مالداروں کے پاس ہے، پھر مال (تمام) لوگوں کے لئے سہارا کیسے ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فرد کی مالداری قوم کی مالداری ہے، اور فرد کی ناداری قوم کی ناداری ہے، کیونکہ ہر آدمی ملت کا فرد ہے، پس اگر ملت کا کوئی فرد کمزور ہوگا تو پوری ملت کمزور ہوگی

اور ملت کے افراد مضبوط ہونگے تو پوری ملت مضبو ہوگی، جیسے ہاتھ کی کوئی انگلی کمزور ہوگی تو پورا ہاتھ کمزور ہوگا، اور ایک انگلی مضبوط ہوگی تو تمام انگلیوں کو اس کی طاقت پہنچے گی، پس ملت کے بعض افراد اگر کمزور ہوں گے تو ان کی کمزوری کا اثر ملت تک پہنچے گا اور ملت کے افراد مضبوط ہوں گے تو پوری قوم اس کی طاقت محسوس کرے گی، اس لئے اگر کوئی کہے کہ میرے پاس مال ڈھیروں ہے، اس لئے گڈیاں جلا جلا کر کھانا پکاؤں گا تو یہ حرام ہے، کیونکہ تیرے پاس جو مال ہے وہ صرف تیرا نہیں ہے، اس مال سے پوری ملت کو فائدہ پہنچنا ہے، رہے گا اگر چہ وہ تیرے ہی پاس لیکن ملت اس کے ذریعہ سے قوت پائے گی، لہٰذا مال کو سلیقہ کے ساتھ اور پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا یہ شریعت کی تعلیم ہے۔

غرض: ان صحابی کو یہ جواب دیا جا سکتا تھا کہ ٹھیک ہے لٹھے کی لنگی ہے، معمولی قیمت کی ہے، مگر ہے وہ بھی مال! اسے بھی قاعدہ سے استعمال کرنا چاہئے، وہ اگر چار دن سے زیادہ چلتی ہے تو وہ بھی انسان کے لئے سہارا ہے، لیکن حضورؐ نے یہ جواب نہیں دیا، بلکہ بات پھیر دی اور فرمایا: أَمَالَكَ فِيَّ أُسْوَةٌ: کیا تیرے لئے میری ذات میں کوئی نمونہ نہیں! یعنی تو مجھے مشعل راہ کیوں نہیں بناتا؟ اب جو حضرت ازہرؓ نے حضورؐ کی لنگی پر نظر ڈالی تو اس کو آدھی پنڈلی تک بندھا ہوا پایا، پس انھوں نے فوراً اپنی لنگی آدھی پنڈلی پر باندھ لی۔ جب حضورؐ کا نمونہ سامنے آیا تو اب کوئی سوال باقی نہ رہا، اور جہاں تک حضورؐ کی لنگی تھی وہیں تک اپنی لنگی بھی باندھ لی!

احکام کی سب سے بڑی حکمت اللہ ورسول کا فرمان ہے:

اور اس حدیث شریف سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کو احکام کی حکمت جاننی چاہئے، لیکن اگر کسی حکم کی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ وہ اللہ ورسول کا حکم ہے، یہ بات ثابت ہوجانے کے بعد کسی اور حکمت کی ضرورت نہیں رہتی، یہی سب سے بڑی حکمت ہے۔

روزے: رمضان ہی کے کیوں فرض ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ

الْقُرْآنُ﴾: رمضان کے روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآنِ کریم اتارا گیا ہے، اور قرآن کریم اللہ کا کلام ہے، وہ اللہ کی صفت ہے، اللہ کی آخری کتاب ہے اور قیامت تک اس کو باقی رہنا ہے، اتنی اہمیت رکھنے والی کتاب اس مہینے میں اتاری گئی ہے، اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ کسی دن میں یا کسی مہینہ میں کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے تو وہ دن اور مہینہ یادگار بن جاتا ہے، جیسے ہمارے ہندوستان میں ۲۶ جنوری اور ۱۵ اگست کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ ملک کی آزادی کے تعلق سے ان دنوں میں بڑا واقعہ پیش آیا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رمضان کو اہمیت اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ اس میں ایک بہت بڑا واقعہ پیش آیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں قرآن اتارا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی تین صفتیں:

قرآنِ کریم کی کیا اہمیت ہے؟ ارشاد فرمایا: ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾: یہ قرآن تمام لوگوں کے لئے راہ نما کتاب ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں، تمام لوگوں کے لئے راہ نما ہے اور قرآن کریم کے شروع میں جو ہے: ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ﴾: یعنی قرآنِ کریم پرہیزگاروں کے لئے راہ نما کتاب ہے، ان دونوں آیتوں میں بعض لوگ تعارض سمجھتے ہیں، لیکن اگر آپ غور کریں تو ان میں کوئی تعارض نہیں۔ قرآن کے شروع میں جو آیت ہے وہاں یہ تھوڑئے ہے کہ یہ صرف متقیوں کے لئے ہدایت ہے، صرف کا لفظ استعمال نہیں کیا، پھر جب دوسری آیت میں فرمایا کہ قرآن تمام لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے تو متقی بھی اس میں شامل ہو گئے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ یہ چیز دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ہے، پھر کسی موقعہ پر کہے کہ یہ چیز ایشیا والوں کے لئے ہے تو اس میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ تمام انسانوں کے اندر ایشیا والے بھی داخل ہیں، پس جب تمام انسانوں کے لئے قرآن کتاب ہدایت ہے تو اس میں متقی بھی آ گئے، ان کے لئے بھی یہ کتاب: کتاب ہدایت ہے۔

گفتگو کے مواقع مختلف ہوتے ہیں:

اور اگر کوئی کہے کہ چلو مان لیا کہ ان میں تعارض نہیں، مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کہا

ہے؟ یہ اسلوبِ بیان بدلا ہوا کیوں ہے؟ ایک جگہ کہا کہ یہ متقیوں کے لئے کتاب ہدایت ہے، اور دوسری جگہ کہا کہ یہ تمام لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ گفتگو کے مواقع مختلف ہوتے ہیں، ایک موقعہ تعریف کا ہوتا ہے اور ایک موقعہ اظہار حقیقت کا، یعنی بات صاف صاف بیان کرنے کا، دونوں موقعوں کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں، مثلاً کسی ملک کی تاریخ لکھنی ہو تو تاریخ میں سب چیزیں بتائی جائیں گی کہ اس ملک میں یہ جانور ہیں، ان جانوروں میں کتّے، خنزیر، لومڑیاں وغیرہ سب گنائے جائیں گے، جتنے کیڑے مکوڑے ہیں سب گنائے جائیں گے، غرض ملک میں جو بھی چیز ہے اچھی ہو یا بری وہ سب گنائی جائے گی، کیونکہ وہ کتاب ملک کی حالات پر لکھی جارہی ہے، اور اگر اسی ملک کا بادشاہ یا وزیر اعظم مہمان آئے، اور اس کی تعریف میں سپاس نامہ پڑھا جائے، اور اس میں آپ پڑھیں کہ ان کے ملک میں اتنے خنزیر ہیں اور اتنے کتّے ہیں تو لوگ وہیں ماریں گے، وہاں تو اس کی تعریف میں بڑی بڑی چیزیں ذکر کی جائیں گی کہ یہ وہ صاحب ہیں جن کے ملک میں ایسے ایسے سائنس دان ہیں، ایسے ایسے انجینئر اور فلاسفر ہیں، غرض جو قابل تعریف چیزیں ہوتی ہیں وہی سپاس نامہ میں لکھی جاتی ہیں، دوسری چیزیں نہیں لکھی جاتیں، قرآنِ کریم کے شروع میں قرآن کی تعریف کی جارہی تھی، اس لئے وہاں جو اہمیت رکھنے والی چیز تھی اس کا تذکرہ کیا اور فرمایا: ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾: یہ کتاب متقیوں کے لئے راہ نما ہے، دنیا میں جو بڑے بڑے لوگ ہیں انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین وہ سب اس کتاب کے محتاج ہیں، اس کتاب کی راہ نمائی کے بغیر یہ بڑے بڑے حضرات بھی کامیاب نہیں ہوسکتے، اتنے بڑے لوگوں کا اس کتاب کا محتاج ہونا یہ قرآن کی تعریف ہے، اور اگر یوں کہیں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی جاہلوں کو ضرورت ہے تو یہ قرآن کی کیا تعریف ہوئی؟ جاہل کو تو بہر حال ضرورت ہوتی ہے۔ اور آیت ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ میں قرآن کی تعریف نہیں کی جارہی ہے، بلکہ قرآن کی حقیقت سمجھائی جارہی ہے کہ رمضان میں جو قرآن اتارا گیا ہے وہ کس مقصد سے اتارا گیا ہے، فرمایا: ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾: وہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر اتارا گیا ہے۔ یہ قرآن کی پہلی صفت ہے۔

خیر کی طرح شر بھی اللہ کے قبضہ میں ہے:

اس فرق کو ایک مثال سے سمجھو! قرآنِ کریم میں ایک جگہ اللہ کی تعریف ہے: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾: اے اللہ! اے ملک کے مالک! جس کو آپ چاہتے ہیں ملک دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں ملک لے لیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ذلت سے ہم کنار کرتے ہیں، آپ کے قبضہ میں خیر ہے۔

سوال یہ ہے کہ شر کس کے قبضہ میں ہے؟ وہ بھی تو اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، پھر صرف ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ کیوں کہا؟ اور دوسرا حصہ کیوں چھوڑ دیا؟ جواب: یہاں اللہ کی تعریف کی جارہی ہے، تعریف کے موقعہ پر یہ کہنا کہ اے اللہ! آپ کے ہاتھ میں خیر بھی ہے اور شر بھی یہ تعریف کے منافی ہے، اس لئے اس کو چھوڑ دیا اور فرمایا: ﴿إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾: آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ اس طرح جو بات چھوڑ دی تھی اس کو دوسرے انداز میں بیان کردیا۔ غرض: تعریف کے موقعہ پر تعریف کا پہلو اجاگر کیا جاتا ہے اور دوسرے موقعہ پر بات کھول کر سمجھائی جاتی ہے۔

قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ﴾: اس آیت میں مضمون یہ ہے کہ کافر جو نبیوں کے مخالف ہیں، جب ان کو خیر پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: ﴿هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾: یہ خیر تو اللہ نے پہنچائی، اور اگر انہیں برے احوال پہنچتے ہیں تو وہ اپنے پیغمبر سے کہتے ہیں: ﴿هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ﴾: یہ نحوست تمہاری وجہ سے آئی ہے، تم جیسا منحوس آدمی ہماری قوم میں پیدا ہوا اس لئے یہ مصیبتیں آئیں، قرآن نے نبیوں سے کہا: ان کو جواب دو: ﴿قُلْ: كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾: سب حالات اللہ کی طرف سے آتے ہیں، یہاں چونکہ اظہار حقیقت کا موقعہ ہے، اس لئے فرمایا کہ اچھے اور برے سب حالات اللہ کی طرف سے آتے ہیں اور وہاں: ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾: کہہ کر شر کو چھوڑ دیا۔

غرض: گفتگو موقعہ کے اعتبار سے کی جاتی ہے، چونکہ قرآن کے شروع میں قرآن کی تعریف کی جارہی ہے، اس لئے کہا: یہ قرآن متقیوں کے لئے کتاب ہدایت ہے اور یہاں چونکہ قرآن کی حقیقت بیان کی جارہی ہے اس لئے فرمایا: قرآن تمام لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے۔

قرآن میں ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں:

دوسری خوبی قرآن کی یہ ہے کہ اس میں ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں: ﴿وَبَیِّنَاتٍ مِنَ الْهُدٰی﴾: اتنی آسان اور واضح کتاب کہ ہر انسان خواہ مرد ہو عورت ہو، شہری ہو دیہاتی ہو، عالم ہو یا جاہل ہو ہر کوئی قرآن کی بات سمجھ سکتا ہے۔

قرآن: فرقان ہے!

مکتبہ حجاز دیوبند

اور تیسری خوبی اس کی یہ ہے کہ یہ فرقان ہے، جدا کرنے والی کتاب ہے، یعنی اس قرآن نے آکر دودھ اور پانی کو الگ الگ کر دیا ہے، کفر اور ایمان میں خط امتیاز کھینچ دیا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے۔

جب ایسی اہمیت رکھنے والی کتاب اس مہینہ میں اتاری گئی ہے تو اس مہینہ کو بھی کوئی اہمیت ملنی چاہئے، اس لئے فرمایا: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾: پس جو تم میں سے اس مہینے کو دیکھے وہ اس مہینے کے روزے رکھے، اس سے معلوم ہوا کہ اس مہینہ کے روزے اس لئے رکھے گئے ہیں کہ اتنی اہم کتاب اس مہینہ میں اتاری گئی ہے۔

رمضان میں دو چیزیں اہم ہیں:

خلاصہ یہ نکلا کہ اس مہینہ میں دو چیزیں اہمیت رکھنے والی ہیں، ایک قرآن ہے، اور قرآن کی اہمیت پورے بارہ مہینے ہے، لیکن اس مہینہ میں اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ دوسری: خود اس مہینہ کی بھی اہمیت ہے، اس لئے اس مہینہ میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں، روزہ اور تراویح۔ روزہ وقت کی اہمیت کا حق ادا کرنے کے لئے ہے اور تراویح قرآنِ کریم کا حق ادا کرنے کے لئے ہے اور یہی دو عبادتیں اس مہینہ کی خاص عبادتیں ہیں۔

روزہ اور تراویح مؤمن کے لئے سفارش کریں گے:

اور حدیث شریف میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے دن روزہ اور قرآن دونوں مؤمن کے لئے سفارش کریں گے، روزہ کہے گا: اے پروردگار! میں نے آپ کے اس بندے کو کھانے پینے سے اور لذتوں سے دن بھر روکے رکھا اور یہ مسلسل رکا رہا لہٰذا میں اس کے لئے سفارشی بن کر آیا ہوں، آپ میری سفارش قبول فرمائیں، اور اس کی مغفرت فرمائیں۔ اور قرآن کہے گا: خدایا! میں نے اس کو رمضان کی راتوں میں سونے نہیں دیا، اس نے میری بات مانی اور وہ سویا نہیں اور مجھے پڑھتا رہا اور میرا حق اس نے ادا کیا اس لئے خدایا میں آپ کی بارگاہ میں سفارشی بن کر آیا ہوں، لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرمائیں، اور اس کی بخشش فرمائیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ان دونوں کی سفارش قبول فرمائیں گے اور اس مؤمن کی بخشش فرمادیں گے جس نے دونوں کا حق ادا کیا ہے، یہ حدیث بیہقی کی شعب الایمان میں ہے، اور مشکاۃ کی کتاب الصوم (حدیث ۱۹۶۳) میں ہے، پس یہی دو عبادتیں اس مہینہ میں اہم ہیں، اگر ہم ان کا حق ادا کردیں تو بیڑا پار ہے۔

بھاری عبادتوں کو آسان بنانے کا فارمولہ:

لیکن یہ دونوں عبادتیں بھاری ہیں اور جب روزے گرمیوں میں آتے ہیں تو اور بھی بھاری ہوجاتے ہیں، گرمی تو ہوتی ہی ہے، اور دن بھی بڑا ہوجاتا ہے، ایسے میں کاشتکار کو کھیت میں ہل چلانا پڑتا ہے، چھٹی نہیں کرسکتا، کیونکہ کوئی دو دن کا تو مسئلہ نہیں، پورے مہینہ کا کام ہے، اور رات میں سونے کو بڑا دل چاہتا ہے، مگر کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا پڑتا ہے اس لئے حضورؐ نے اُن حدیثوں میں جو میں نے خطبہ میں پڑھی ہے اس بھاری اور مشکل کام کو آسان بنانے کا فارمولہ بیان فرمایا ہے۔

وہ فارمولہ ہے: إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا۔ ایمان کے جو معنی معروف ہیں، وہ یہاں مراد نہیں۔ یہاں ایمان کے معنی ہیں: یقین، اور احتساب کے معنی ہیں: ثواب کی امید رکھنا۔ پس اس

جملہ کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ نے اعمال پر جو ثواب کے وعدے کئے ہیں: اس پر پختہ یقین رکھنا، اور اس کو نظروں کے سامنے لانا یہ مشکل سے مشکل کام کو نہایت آسان بنا دیتا ہے۔

اس کی تھوڑی تفصیل یہ ہے کہ اللہ نے جو احکام ہم پر لازم کئے ہیں وہ بیگار نہیں ہیں۔ بیگار کا مطلب ہے: مفت میں کام لینا، پرانے زمانے میں راجے مہاراجے لوگوں سے مفت میں کام لیتے تھے، اس کو بیگار کہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہمارے خالق و مالک ہیں اور ہم ان کے بندے ہیں، وہ ہمارے پالنہار ہیں اور ہم ان کا رزق کھاتے ہیں وہ جو حکم دیں ہمارے لئے ان کو بجالانا ضروری ہے، وہ اس کے بدلہ میں کچھ بھی نہ دیں تو بھی انہیں حق پہنچتا ہے، مگر انھوں نے ہم سے بیگار نہیں لی، بلکہ یہ کہا کہ کام کرو ہم اتنا ثواب دیں گے۔ یہ جو ثواب کے وعدے اللہ نے کئے ہیں ان وعدوں کو نگاہوں کے سامنے لایا جائے تو کام ہلکا ہو جائے گا۔

جیسے ایک آدمی ہے، اسے معلوم ہے کہ میں دفتر جاؤں گا تو مہینہ کے آخر میں دس ہزار روپے تنخواہ ملے گی، چنانچہ رات کے دو بجے بھی اس کی ڈیوٹی ہوتی ہے تو چاہے آسمان زمین ٹل جائیں، مگر وہ ٹھیک وقت پر حاضر ہوگا، اور جب اس کے آٹھ گھنٹے پورے ہو جائیں گے تو کچھ لے کر نہیں لوٹے گا، جیسا خالی ہاتھ گیا تھا ویسا ہی خالی ہاتھ آجائے گا، جاتے ہوئے بھی گاڑی میں تیل اپنے پیسوں سے ڈلوائے گا اور واپسی میں بھی۔ اب اگر کوئی اس سے کہے کہ بھائی آپ جیسا بے وقوف کون ہوگا کہ اتنی پابندی سے ڈیوٹی پر جاتے ہو اور اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے تیل بھی ڈلواتے ہو، لیکن لاتے کچھ بھی نہیں، تو وہ جواب دے گا کہ بے وقوف میں نہیں ہوں، جناب عالی ہیں (ج: مخفف ہے جاہل کا، ن: نالائق کا، الف: الّو کا، ب: باؤلے کا اور عالی کے معنی ہیں: مہا، بہت بڑا) میں اگرچہ آج کچھ نہیں لاتا، مگر جب مہینہ پورا ہوگا تو لاؤں گا۔

میرے بھائیو! پھر عبادتوں میں اور احکام کی بجا آوری میں انسان کیوں یہ امید رکھے کہ میں گھر سے نماز پڑھنے جاؤں تو میری نماز کا سلام پھرنا نہیں چاہئے کہ میری جیب بھر جائے۔ دنیا کے کاموں میں ایک وقت کے بعد تنخواہ ملتی ہے، اسی طرح اللہ نے جو عبادتیں رکھی ہیں ان کے ثواب کے لئے بھی اللہ نے ایک وقت مقرر کیا ہے، اس وقت تک انتظار

کیوں نہیں کیا جاتا، اور وہ وقت موت ہے، آنکھ بند ہوتے ہی ساری زندگی کے کئے ہوئے کاموں کا ثواب سامنے آجائے گا۔

یہ جو ثواب مرنے کے بعد ملے گا اس کو ذہن میں تازہ کرلیا جائے کہ میں جو روزے رکھتا ہوں اس کا ثواب مجھے ضرور ملے گا، میں جو تراویح پڑھتا ہوں تو مجھے اس کا ثواب ملے گا، اس ثواب کی امید کو تازہ کرنا مشکل سے مشکل کام کو آسان بنادیتا ہے۔ غرض حضورؐ نے یہ فارمولہ بتایا کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے یقین کے ساتھ اور ثواب کی امید کے ساتھ اور جس نے تراویح پڑھی یقین کے ساتھ اور ثواب کی امید کے ساتھ، اور جس نے شب قدر میں عبادتیں کیں اسی ایمان و احتساب کے ساتھ تو تینوں کا بدلہ ہے: **غُفِرَ له ماتقدم من ذنبه**: اس کے گذشتہ تمام گناہ معاف ہوجائیں گے اور اس کی پچھلی تمام زندگی کا ریکارڈ صاف ہوجائے گا۔

چند مکفرات جمع ہوتے ہیں تو جلا پیدا ہوتی ہے:

یہاں اگر کوئی شخص کہے کہ جب ان تینوں کا فائدہ ایک ہی ہے تو پھر تینوں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تینوں میں سے ایک کام کرلیا جائے تو ریکارڈ صاف ہوجائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب چند مکفرات جمع ہوتے ہیں تو جلا پیدا ہوتی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھو: ہمارے ہندوستان میں جب عورتیں کپڑے دھوتی ہیں تو پہلے صابن لگاتی ہیں، صابن کیا کام کرتا ہے؟ میل کاٹتا ہے! پھر کپڑے کو کوٹتی ہیں اور پانی سے دھوتی ہیں، جب کپڑا صاف ہوجاتا ہے تو اس کو نیل میں ڈالتی ہیں، نیل کیا کام کرتی ہے؟ نیل کپڑے میں چمک پیدا کرتی ہے یا ایک پاؤڈر ٹینی پال ہے اس میں ڈالتی ہیں، وہ بھی کپڑے میں جِلا (چمک) پیدا کرتا ہے، پھر جب کپڑے پریس ہوکر تیار ہوجاتے ہیں تو نہایت اجلے معلوم ہوتے ہیں۔

اب اگر کوئی کہے کہ بھائی جب تینوں (صابن، نیل اور ٹینی پال) کا کام ایک ہی ہے تو تینوں چیزیں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بس صابن سے دھو ڈالو، کیا ضرورت ہے نیل ڈالنے کی؟ تو سب یہی کہیں گے کہ نہیں بھائی! ایسا نہیں ہے، اگرچہ سب چیزیں ایک ہی کام

کرتی ہیں، مگر جب یہ سب چیزیں اکٹھا ہوں گی تو ان کی صورت کچھ اور ہو جائے گی۔

اسی طرح دو آنکھیں ہیں، جو کام ایک آنکھ کرتی ہے وہی دوسری بھی کرتی ہے، پھر دوسری بیکار ہوئی؟ نہیں! بیکار نہیں ہے، دو کا کام دو کا ہے، اور ایک کا کام ایک کا ہے، اسی طرح گناہوں کی صفائی اور معافی ایک کام سے ہوگی تو اس کی شکل اور ہوگی، اور تین سے ہوگی تو اس کی شکل اور ہوگی، اس سے آدمی کی صفائی بڑھ جائے گی۔

رمضان میں دو نمازیں الگ الگ ہیں:

رمضان میں دو نمازیں الگ الگ ہیں، ایک نماز سونے سے پہلے ہے، اس کا نام قیام رمضان ہے، اسی کا نام تراویح بھی ہے، اس کی جماعت کے ساتھ بیس رکعتیں ہیں، اور یہ نماز سونے سے پہلے پڑھنی ہے، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو میں نے ابھی سنائی کہ تراویح مؤمن کے لئے سفارش کرے گی، سفارش کرتے ہوئے وہ کہے گی: اے اللہ! میں نے اس بندے کو سونے سے روکا، میں نے اس کو سونے نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ نماز سونے سے پہلے ہے۔

اور ایک دوسری نماز ہے جو پورے سال پڑھی جاتی ہے، اسے رمضان میں بھی پڑھنا ہے، اور وہ تہجد کی نماز ہے، جب آپ سحری کے لئے اٹھیں تو سحری ہی میں نہ لگ جائیں، سحری ضرور کھائیں مگر تہجد بھی پڑھیں، یہ تہجد حضورؐ بارہ مہینے پڑھتے تھے اور اس کی آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے، رمضان کی وجہ سے اس کی رکعتوں میں اضافہ نہیں ہوتا تھا، لہٰذا جب ہم سحری کے لئے اٹھیں تو ہمیں تہجد کی آٹھ رکعتیں ضرور پڑھنی چاہئے، دوسرے گیارہ مہینوں میں تو ہم تہجد کے لئے اٹھ نہیں پاتے، لیکن رمضان میں تو سحری کھانے کے لئے اٹھنا ہی ہے، پھر ہم خرما و ہم ثواب کیوں نہیں کر لیتے، اور آٹھ پڑھنی ضروری نہیں، اگر آپ آٹھ نہ پڑھ سکیں تو چھ پڑھ لیں، چار کا موقعہ ہو تو چار پڑھ لیں، ورنہ کم از کم دو تو ضرور پڑھ لیں۔

تراویح کی نماز آسان ہے، لوگوں نے اس کو مشکل بنا دیا ہے:

اور تراویح کو تراویح کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کہ ہر چار رکعت پر ترویحہ آتا ہے اس

مکتبہ حجاز دیوبند

لئے اس کو تراویح کہتے ہیں اور ترویحہ کے معنی ہیں: آرام کرنا۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ تراویح کی چار رکعتیں جتنی دیر میں پڑھی جاتی ہیں اتنی دیر آرام کرنا چاہئے، پھر اگلی چار رکعتیں پڑھی جائیں، پھر اتنی ہی دیر آرام کیا جائے، دس منٹ میں اگر آپ نے چار رکعتیں پڑھی ہیں تو دس منٹ آرام کریں، مگر ہم اس طرح تراویح نہیں پڑھتے، اس لئے تھک جاتے ہیں۔

مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ جب ہم گھنٹے سوا گھنٹے میں تھک جاتے ہیں تو اگر دس دس منٹ وقفہ کریں گے تو ڈھائی گھنٹے لگیں گے، ڈھائی گھنٹے میں تو ہم اکڑ کر لاٹھی بن جائیں گے۔

میرے بھائیو! ایسا نہیں ہے، ہم جو جلدی جلدی پڑھتے ہیں یہی چیز ہمیں تھکا دیتی ہے، اتنا فٹافٹ جگاڑ چلتا ہے کہ رکوع وسجدہ میں دو مرتبہ بھی تسبیح نہیں کہہ پاتے، یاد رکھو جتنا جلدی کروگے اتنا ہی تھکوگے، اور اگر دس منٹ میں چار رکعات پڑھو اور دس منٹ آرام کرو، پھر اگلا ترویحہ دس منٹ میں پڑھو اور دس منٹ آرام کرو تو کبھی تھکن نہیں ہوگی، جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اس نماز کو بوجھ بنا رکھا ہے، ہم جلد سے جلد اپنے سر سے اس کو ٹال دینا چاہتے ہیں اور گھنٹے سوا گھنٹے میں نمٹ کر پھر چوراہے پر کھڑے کھڑے دو گھنٹے گپ کرتے ہیں، نہ نیند آتی ہے، نہ کسی کام کا تقاضہ ہوتا ہے۔

پس اگر **إيمانا واحتسابا** والا فارمولہ ہمارے پیش نظر رہے تو یہ نماز ہم پر بھاری نہیں ہوگی، بلکہ اس میں مزہ اور لطف آئے گا۔ اللہ تعالی ہمیں اس مضمون کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں اور تمام عبادتوں کو ثواب کے یقین وامید کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین یارب العالمین) **وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔**

۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز عید سے پہلے خطاب

[یہ خطاب شہر لندن کی مسجد قبا میں نماز عید الفطر سے پہلے فرمایا ہے]

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿وَلِتُکَبِّرُوْا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدَاکُمْ، وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ﴾ [البقرۃ ۱۸۵]

محترم بھائیو اور بزرگو! رمضان کا مبارک مہینہ گذر گیا۔ اللہ جل شانہ نے اس مبارک مہینے میں ہمیں جو خیر کے کاموں کی توفیق عطا فرمائی اس پر ہم اللہ کا شکر بجالاتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم سے کوتاہیاں ہوگئی ہیں: ہم بارگاہ خداوندی میں توبہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمائیں۔

مبارک مہینہ گذرنے کے بعد آج شوال کا پہلا دن آیا ہے، یہ عید کا دن ہے، اللہ کی بارگاہ میں دوگانۂ شکر بجالانے کا دن ہے۔ اور ہم اس کی بارگاہ میں دوگانۂ شکر بجالانے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔

عید کی نماز اور تکبیرات زوائد کا قرآن سے استنباط:

اس نماز کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلِتُکَبِّرُوْا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدَاکُمْ، وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ﴾ اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اس نے تمہیں راہ ہدایت دکھائی، اور تاکہ تم شکر بجالاؤ، دنیا میں بے شمار انسان ہیں جن کو ہدایت کی راہ نظر نہیں آئی، کیونکہ انھوں نے ہدایت کا راستہ دیکھنا ہی نہیں چاہا اس لئے اللہ نے ان

کو ہدایت کا راستہ نہیں دکھایا، اور ہم نے اللہ کی توفیق سے ہدایت کا راستہ دیکھنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے دکھلایا، ہمیں مؤمن بنایا، ہمیں اعمال کی توفیق عطا فرمائی، ہمیں اعمال کا شوق عطا فرمایا، پورا مہینہ ہم نے روزے رکھے، تلاوتیں کیں، نمازیں پڑھیں، اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرنی چاہئے، آیت کے اس حصہ میں ایک اشارہ ہے، مگر وہ اشارہ اللہ کا رسول ہی سمجھ سکتا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے، اشارے تو ہم بھی سمجھتے ہیں مگر یہ اشارہ اللہ کا رسول ہی سمجھ سکتا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے، چنانچہ نبی ﷺ نے: ﴿وَلِتُكَبِّرُوْا اللّٰهَ﴾ سے تکبیراتِ زوائد اور ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ سے نماز عید مستنبط فرمائی، پھر تکبیراتِ زوائد کو عید کی نماز میں شامل فرمایا، اس طرح اس اشارے کو پھیلانا مجتہدین کے بس کی بات نہیں، یہ رسول ہی کا منصب ہے۔

اس کی نظیر: قرآن میں جگہ جگہ فرمایا ہے: ﴿أَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ﴾: نماز کا اہتمام کرو، نماز کیا ہے؟ اس کو کس طرح سے پڑھا جائے، اور اس کا اہتمام کیسے کیا جائے؟ یہ سب باتیں اللہ کا رسول ہی سمجھ سکتا ہے، کیونکہ وہ اللہ کے سمجھانے سے سمجھتا ہے، چنانچہ آپؐ نے اس کی پوری تفصیل پیش کر دی ہے۔

اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں جو اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا ذکر ہے، وہ بڑائی کیسے بیان کی جائے؟ یہ بات اللہ کا رسول ہی بتائے گا اور اللہ کے سمجھانے سے بتائے گا۔ چنانچہ اللہ کے رسول نے عملی طور پر سمجھایا کہ رمضان کے ختم پر دوگانۂ شکر ادا کیا جائے، شہر وقصبات اور بڑے گاؤں کے لوگوں پر عید کی نماز پڑھنا واجب کیا، اور اس نماز میں خاص طور پر اللہ اکبر کا اضافہ کیا۔ پہلی رکعت میں تین کا اضافہ کیا اور دوسری رکعت میں تین کا۔ یہ چھ زائد تکبیریں بھی واجب ہیں۔ اور گھر سے نماز عید کے لئے آئے تو بھی تکبیر کہتا ہوا آئے۔

عید کی نماز کے بعد دعا اور دعا کا ادب:

پھر روزوں کے بیان کے بیچ میں ایک آیت آئی ہے: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ، أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ، فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ، وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ﴾: جب آپؐ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ ان کو بتلادیں کہ میں قریب ہوں۔ لوگوں نے پوچھا تھا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں کہ ہم ان کو آہستہ پکاریں یا دور ہیں کہ ہم زور

سے پکاریں؟ پس یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور کہا گیا کہ جب میرے بندے آپؐ سے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ بتادیں کہ اللہ قریب ہیں، پس ان کو آہستہ پکارو، چلانے کی ضرورت نہیں، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے: ﴿أُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾: تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے سے پکارو! اور ایک مرتبہ نبی ﷺ سفر کرتے ہوئے جارہے تھے، لشکر زور زور سے تکبیر پڑھ رہا تھا آپؐ نے لوگوں سے فرمایا: إنكم لاتدعون أصما ولا بعيداً: آپ لوگ کسی بہرے کو نہیں پکار رہے ہو، نہ کسی دور کو پکار رہے، پس آہستہ ذکر کرو، اللہ قریب ہیں، اور سمیع ہیں، سب کی سنتے ہیں۔

اس لئے دعا میں افضل یہ ہے کہ بہت عاجزی سے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جائے، اور یہ آیت یہاں اس لئے آئی ہے کہ عید کی نماز کے بعد دعا مانگنی ہے۔

آگے فرمایا: میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے، پس چاہئے کہ وہ میرے حکم پر لبیک کہیں، اور میری ذات پر یقین رکھیں تاکہ وہ راہ یاب ہوں۔

میرے بھائیو! آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کے دن سب سے پہلے دوگانۂ عید ادا کیا جائے گا، پھر دعا مانگی جائے گی پھر اس کے بعد خطبہ ہوگا، میں ان تینوں کی تھوڑی تفصیل عرض کرتا ہوں:

عید کی نماز کا طریقہ

عید کی نماز ہمیشہ ادا کی جاتی ہے اور بڑے لوگ اس کا طریقہ جانتے ہیں، مگر چھوٹے اس کے محتاج ہیں کہ ان کو عید کی ترکیب بتائی جائے:

سب سے پہلے نیت کرنی ہے، نیت دل سے ہوتی ہے اور زبان سے بھی کہہ لیا جائے تو اچھا ہے، ضروری نہیں، یہ نیت کریں کہ میں عید کی نماز امام کی اقتدا میں پڑھتا ہوں، بس اتنی نیت کافی ہے، اور یہ بات پہلے ہی سے آپ کے دل میں ہوتی ہے، اور اسی لئے آپ تشریف لائے ہیں، مگر پھر بھی اس کا استحضار ضروری ہے، اور زبان سے بھی کہہ لیں تو اچھا ہے۔

اور عام طور پر جو نیت بتائی جاتی ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں عید کی، چھ زائد تکبیروں کے

مکتبہ حجاز دیوبند

ساتھ، منہ میرا کعبہ کی طرف: یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ منہ تو کعبہ کی طرف ہوتا ہی ہے، کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور عید کی دو ہی رکعتیں ہیں اس کو بھی کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اس میں چھ زائد تکبیریں بھی ہوتی ہی ہیں: اس کو بھی کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں! یہ کہنا ضروری ہے کہ امام کی اقتدا میں پڑھتا ہوں، اگر اقتدا کی نیت نہیں کرے گا تو مقتدی کی نماز نہیں ہوگی۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ ہم گھر سے عید کی نماز کی نیت ہی سے آئے ہیں، پھر دوبارہ نیت کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: یہ ہے کہ ٹھیک ہے، مگر نیت کا تکبیر تحریمہ سے اتصال بھی چاہئے، مثلاً ایک آدمی نے نماز کی نیت کرلی، پھر کسی نے اس کے کان میں کوئی بات کہی، وہ اس نے سنی، اب وہ نماز شروع کرتا ہے تو دوبارہ نیت کرے، تکبیر تحریمہ کے ساتھ نیت کا متصل ہونا افضل ہے۔

اس کے بعد امام صاحب تکبیر تحریمہ کہیں گے، ان کی تکبیر کے بعد تمام مقتدی ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہیں، اور تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھ لیں، پھر جس طرح ہر نماز میں ثناء پڑھی جاتی ہے: ثناء پڑھیں، پھر ثنا پڑھ کر خاموش ہوجائیں، اس کے بعد امام صاحب زائد تکبیریں کہیں گے، وہ یکے بعد دیگرے تین تکبیریں کہیں گے، آپ بھی کانوں تک ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑ دیں، اور تیسری مرتبہ میں اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیں۔ اس کے بعد امام صاحب قراءت کریں گے، سورۂ فاتحہ پڑھیں گے اور سورت ملائیں گے، پھر رکوع کریں گے، سجدے کریں گے، پھر کھڑے ہو کر قراءت شروع کریں گے۔ جب سورت پوری ہوگی تو اللہ اکبر کی آواز آئے گی، اس وقت آپ رکوع میں نہ چلے جائیں، یہ زائد تکبیریں کہی جارہی ہیں، آپ کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑ دیں، دوسری مرتبہ میں بھی یہی کریں اور تیسری مرتبہ میں بھی یہی کریں۔ اس کے بعد رکوع کی چوتھی تکبیر ہاتھ اٹھائے بغیر کہہ کر رکوع میں جائیں، اور حسب معمول نماز پوری کریں۔

اس میں اگر مقتدی سے بھول ہوجائے اور وہ تکبیر سن کر رکوع میں چلا جائے، پھر دیکھے کہ باقی سب لوگ کھڑے ہیں اور وہ کھڑا ہوجائے تو کوئی حرج نہیں، امام کے پیچھے بھول

معاف ہوتی ہے۔ باقی اسے اب رکوع ہی میں زائد تکبیریں کہنی چاہئیں، کھڑا نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ یہ فرض سے واجب کی طرف لوٹنا ہے جو جائز نہیں۔

اور اگر امام سے ایسی بھول ہو جائے اور اسے رکوع میں جانے کے بعد یاد آئے تو وہ بھی اب رکوع ہی میں زائد تکبیریں کہے اور مجمع کھڑا کھڑا تکبیریں کہے۔

اور اگر پیچھے سے لوگوں نے لقمہ دیا اور امام ہڑ بڑا کر کھڑا ہو گیا تو یہ کھڑا ہونا غلط ہے، فرض سے واجب کی طرف لوٹنا ہے، لیکن اگر کھڑا ہو گیا تو اب کھڑے ہو کر تین تکبیریں کہے، پھر رکوع کرے اور آخر میں سجدۂ سہو نہ کرے۔ دوسری نمازوں میں ایسا کرنے سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے، لیکن عید کی نماز میں سجدۂ سہو نہیں کیا جاتا، کیونکہ عید کی نماز میں عام طور پر مجمع بڑا ہوتا ہے۔ اس لئے مسئلہ یہ ہے کہ عید کی نماز میں اگر کوئی بھول ہو جائے اور کوئی واجب چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو نہیں کیا جاتا۔

پھر نماز پوری ہونے کے بعد دعا ہوگی، اور دعا میں اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں جو ارمان ہیں: وہ مانگے، البتہ کچھ دعائیں ایسی ہوتی ہیں جو سبھی مؤمنین کی آرزو ہوتی ہیں، اس لئے امام صاحب نماز کے بعد تھوڑی دیر زور سے دعا کریں، پھر وہ خاموش ہو جائیں اور لوگ اپنے دل کی مرادیں مانگیں۔

خطبہ سننا واجب ہے:

پھر دعا کے بعد امام صاحب خطبہ دیں گے، عید کا خطبہ سنت ہے، مگر اس کا سننا واجب ہے، جیسے سلام کرنا سنت ہے، مگر اس کا جواب دینا واجب ہے۔ پس ہر آدمی اپنی جگہ صف میں بیٹھا رہے اور پورا خطبہ سنے، جب خطبہ ختم ہو تو لوگ جا سکتے ہیں۔

عید کی نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ کا حکم:

اس موقعہ پر ایک خاص رسم ہے، لوگ اچھل اچھل کر معانقہ کرتے ہیں، علماء نے لکھا ہے کہ یہ رسم ہے یا بدعت ہے۔ اگر آپ اس میں ثواب کا تصور کر لیں تو بدعت ہے ورنہ رسم ہے، اور رسم سے بھی بچنا ضروری ہے، اس لئے کم سے کم اس بلڈنگ کے احاطہ میں ——

اس وقت پوری بلڈنگ مسجد کے حکم میں ہے، آخر تک نماز ہوتی ہے، صفیں لگتی ہیں، اس لئے یہ پوری بلڈنگ مسجد ہے —— یہ رسم یا یہ بدعت نہیں ہونی چاہئے، آپ باہر نکل کر یا اپنے گھر جا کر جو چاہیں کریں میں منع نہیں کرتا۔ لیکن جہاں اللہ کے حکم کی تعمیل ہو رہی ہو، وہاں اللہ کے حکم کے خلاف نہیں ہونا چاہئے۔

عید کے دن شیر خرما کا حکم:

ہاں ایک بات رہ گئی: اور وہ 'شیر خرما' کی بات ہے، یہ بھی ایک رسم ہے، بدعت نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی، بس ایک رسم چلی آ رہی ہے اور مؤمن کو رسموں کا پابند بھی نہیں ہونا چاہئے۔ عید کے دن کچھ پکانا ہے تو پکاؤ مگر ایک ہی چیز کیوں پکڑ رکھی ہے، پلاؤ پکاؤ، کوئی اور چیز پکاؤ، جو اللہ توفیق دے پکاؤ، مگر ایک چیز پر تکیہ مت کرو، اس طرح تخصیص کرنے سے دین بگڑ جاتا ہے، دین میں جب رسمیں داخل ہوتی ہیں تو دین اصلی حالت پر باقی نہیں رہتا۔

میرے بھائیو! یہ ضروری باتیں تھیں جو عرض کی گئیں، اب اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے مؤمن بندوں میں شامل فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ شکر بجالانا بہت بڑی صفت ہے، اور اللہ کو بہت پسند ہے، ارشادِ پاک ہے: ﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾: یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے اعلان عام کیا کہ اگر تم میری نعمتوں کا شکر بجالاؤ گے تو میں نعمتیں اور زیادہ دوں گا، عبادتوں کی جو ہمیں توفیق ملی ہے یہ بھی ایک نعمت ہے، اس نعمت کا شکر بجالاؤ گے تو اللہ اور عبادتوں کی توفیق دیں گے، اور اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو جان لو: میری سزا بہت سخت ہے۔ ﴿وَقَالَ مُوْسٰى: إِنْ تَكْفُرُوْا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا فَإِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ اگر تم اور ساری زمین کے لوگ مل کر ناشکری کرو گے تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں، ستودہ صفات ہیں، ان کی شان میں ان کی بادشاہت میں، ان کی عظمت میں، ان کی کبریائی میں، ان کی بڑائی میں کچھ کمی نہیں آئے گی! ہم اگر شکر بجالاتے

ہیں تو اپنے فائدے کے لئے بجالاتے ہیں، شکر بجالانے کا فائدہ ہماری طرف لوٹتا ہے۔ اس لئے اللہ کی نعمتوں کا ہمیشہ شکر بجالاؤ، اپنے گناہوں کی معافی مانگو، خاص موقعوں پر آدمی اگر گناہوں سے توبہ کرے تو توبہ کی قبولیت کا چانس زیادہ ہوتا ہے، اور اپنی زندگیوں کو اللہ کے احکام کے مطابق ڈھالنے کا پختہ ارادہ کرو، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، ہماری زندگیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے احکام کے مطابق بنائیں، اور اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا وآخرت کی تمام بھلائیوں سے ہمکنار فرمائیں (آمین)

صدقۂ فطر واجب ہے:

اور آج صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے، اور اس کو عید کی نماز سے پہلے نکالنا مستحب ہے، آپ حضرات میں سے اکثر حضرات تو صدقۂ فطر ادا کر کے عید کی نماز کے لئے تشریف لائے ہونگے، اور جن حضرات نے ابھی ادا نہیں کیا وہ عید کی نماز کے بعد ادا کردیں، باہر فطرہ کا بکس رکھا ہے، اس میں فطرہ کی رقم ڈال دیں، اور جو لوگ رقم ساتھ نہیں لائے ان کو بھی فطرہ ادا کرنا ہے، بھولیں نہیں!

مکتبہ حجاز دیوبند

شوال کے چھ روزے:

اور آخری بات یہ یاد رکھیں کہ شوال میں چھ روزے مستحب ہیں۔ مسلم شریف میں روایت ہے کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے، پھر بعد میں شوال کے چھ روزے رکھے تو اس نے زمانہ بھر کے روزے رکھے، یعنی وہ حکماً صائم الدہر (ہمیشہ روزے رکھنے والا) ہوجاتا ہے، اس لئے جس کو اللہ توفیق دے وہ یہ چھ روزے ضرور رکھے، عید کے دوسرے ہی دن سے یہ روزے شروع کردیئے جائیں تو آسانی سے پورے ہوجاتے ہیں، باقی متصلاً رکھنا ضروری نہیں، شوال میں متفرق طور پر رکھ لئے جائیں تو بھی درست ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ختم نبوت کا بیان

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ، وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الاحزاب آیت ۴۰)

اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کے بقاء کا سامان کیا ہے

بزرگو اور بھائیو! جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہو کر فرعون کے پاس پہنچے اور اس کو ایمان کی دعوت دی تو فرعون نے کہا: ﴿مَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى﴾ (طٰہٰ آیت ۴۹) تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟ یعنی جس رب پر ایمان لانے کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو وہ کون ہے؟ اس کا تعارف کراؤ! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿رَبُّنَا الَّذِیْ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى﴾ (طٰہٰ آیت ۵۰): ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی، یعنی اس کو پیدا کیا، وجود بخشا، پھر اس کی راہنمائی فرمائی، یعنی مخلوقات جس ہدایت کی اور جن چیزوں کی محتاج تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی وہ ضرورت پوری کی اور اس کی راہنمائی فرمائی۔

دنیا میں جتنی مخلوقات ہیں ان کی صرف جسمانی ضروریات ہیں، تمام مخلوقات اپنا وجود باقی رکھنے کے لئے کچھ چیزوں کی محتاج ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اس کی بقاء کا سامان کیا، تا کہ وہ زندگی کے اسٹیج پر برقرار رہ سکے، ساتھ ہی ہر مخلوق کو یہ بھی سمجھا دیا کہ وہ ان چیزوں کو کس طرح استعمال کرے اور ان سے کس طرح متمتع ہو؟ ﴿ثُمَّ هَدٰى﴾ کے مفہوم میں یہ سب کچھ شامل ہے۔

انسان کی دو ضرورتیں: جسمانی اور روحانی

مگر انسان کی دو ضرورتیں ہیں: ایک: اس کے جسم کی ضرورت ہے، یعنی دیگر مخلوقات کی طرح انسان بھی اپنا وجود باقی رکھنے کے لئے کچھ اسباب کا محتاج ہے، اللہ تعالیٰ نے وہ اسباب بھی پیدا کئے جو انسان کے وجود کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہیں، دوسری: انسان کی روحانی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں ایک روح ودیعت فرمائی ہے اور انسان میں دو روحیں رکھی ہیں۔ یہ بات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان فرمائی ہے۔ تمام حیوانات میں صرف ایک روح ہے وہ روح حیوانی ہے (۱) اور انسان میں دو روحیں ہیں: روح حیوانی اور روح ربانی۔ اور اللہ تعالیٰ نے روحِ حیوانی کی ضرورتوں کا بھی انتظام کیا ہے اور روحِ ربانی کی ضرورتوں کا بھی۔ اور انسانیت کے آغاز ہی سے روحِ ربانی کی ضرورتوں کا انتظام فرمایا ہے۔ آپ جانتے ہیں: جو پہلا انسان ہے وہی پہلا نبی ہے، حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں اور وہی سب سے پہلے نبی ہیں، کیونکہ انسان کی روح کی تربیت کا نظم وانتظام اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اور یہ راہنمائی اللہ تعالیٰ نبیوں کے ذریعہ فرماتے ہیں۔ اور حضرت آدم علیہ السلام بھی ایک انسان تھے، ان کی اور ان کی اولاد کی روحانی ضرورت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی بنایا۔ اور ان پر ہدایات نازل فرمائیں۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی روح کی اور ان کی اولاد کی ارواح کی تربیت کا انتظام فرمایا۔ یہی سلسلہ نبوت کہلاتا ہے جو انسانیت کے آغاز ہی سے شروع ہوا، پھر یہ سلسلہ چلتا رہا، مختلف قوموں میں، مختلف زمانوں میں اور مختلف جگہوں میں اللہ جل شانہ نے بہت سے نبی اور رسول بھیجے۔

نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول ہیں

اور چھوٹے حضرات نبی کہلاتے ہیں، اور بڑے حضرات رسول کہلاتے ہیں۔ نبی صرف

---

(۱) اور اسی وجہ سے قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد تمام حیوانات مٹی بنا دیئے جائیں گے، کیونکہ ان میں روح فوقانی نہیں، جس کو عالم بالا میں بھیجا جائے۔

نبی ہوتا ہے، اور رسول نبی بھی ہوتا ہے اور رسول بھی، پس رسالت بڑا درجہ ہے، جیسے مولوی اور مفتی۔ جو مولوی ہے اس کا مفتی ہونا ضروری نہیں، لیکن جو مفتی ہے وہ مولوی ضرور ہوتا ہے (۱)

اور اس طرح بھی فرق کیا گیا ہے کہ جس انسان پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے وہ ‘‘نبی’’ ہے اور جس کو نئی شریعت بھی عطا کی گئی ہے وہ ‘‘رسول’’ ہے۔

اور اس طرح بھی فرق کیا گیا ہے کہ جو مؤمنین کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں: وہ نبی ہیں، اور جو کفار کی طرف بھی مبعوث کئے گئے ہیں: وہ رسول ہیں (۲)

اور اگر ملائکہ کو شامل کر کے نسبت بیان کی جائے تو من وجہ کی نسبت ہوگی، جبرئیلؑ صرف رسول ہیں، انبیائے بنی اسرائیل صرف نبی ہیں، اور اولوالعزم رسول: رسول بھی ہیں اور نبی بھی۔

پس حضرت آدم علیہ السلام صرف نبی ہیں، اور سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام ہیں مسلم شریف بابِ شفاعت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت ہے، اس میں اس کی صراحت ہے: یانوحُ! أنتَ أَوَّلُ الرُّسُلِ إلی الأرض: اے نوح! آپ زمین پر سب سے پہلے رسول ہیں۔

تمام انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں

اور حضرت نوح علیہ السلام کا لقب آدم ثانی اور ابوالبشر ثانی ہے اور آپ کا یہ لقب اس لئے ہے کہ آج دنیا میں جتنے انسان ہیں: سب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ﴾ (الصّٰفّت ۷۷): اور ہم نے انہی کی اولاد کو باقی رہنے والا بنایا یعنی کشتی والوں میں سے اور کسی کی نسل نہیں چلی۔

آپ حضرات جانتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جو طوفان آیا تھا اس میں تمام انسان غرق ہوگئے تھے، اس وقت انسان ساری زمین پر بسے ہوئے نہیں تھے، زمین کے ایک مخصوص حصہ میں بسے ہوئے تھے۔ اور جہاں انسان بسے ہوئے تھے، وہاں

---

(۱) پس دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے، نبی عام ہے اور رسول خاص۔

(۲) ان صورتوں میں بھی وہی عام وخاص کی نسبت ہوگی۔

مکتبہ حجاز دیوبند

پانی کا طوفان آیا تھا، اس لئے سب ہلاک ہوگئے، صرف حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں جو لوگ سوار تھے، جو کم وبیش اسّی مرد وزن تھے، وہی بچے، طوفان کے بعد ان کی نسلیں چلیں، مگر آہستہ آہستہ سب کی نسلیں ختم ہوگئیں، صرف حضرت نوح علیہ السلام کے جو تین صاحبزادے کشتی میں سوار تھے، انہیں کی نسلیں باقی رہیں، آج دنیا میں جتنے انسان ہیں وہ سب حضرت نوح علیہ السلام کے انہیں تین بیٹوں کی اولاد ہیں، یہی مطلب ہے ارشادِ پاک: ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ﴾ کا، یعنی ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہی کو باقی رہنے والا بنایا یعنی سب کی نسلیں ختم ہوگئیں، صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کی نسل چلی، اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام آدم ثانی اور ابوالبشر ثانی ہیں، اور وہی سب سے پہلے رسول ہیں، ان سے پہلے جتنے انبیاء تھے، وہ صرف نبی تھے۔

آدم ونوح علیہما السلام کے درمیان انبیاء کی تعداد

حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے کتنے نبی ہوئے ہیں؟ اور کون ہیں؟ یہ بات میں یقین سے نہیں بتا سکتا۔ قرآنِ کریم میں حضرت آدم ونوح علیہما السلام کا ذکر ہے، مگر آدم ونوح علیہما السلام کے درمیان کتنے انبیاء ہوئے ہیں؟ اور وہ کون ہیں؟ اس کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت شیث علیہ السلام کے بارے میں تقریباً اتفاق ہے کہ وہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان ہوئے ہیں اور حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ آدم ونوح علیہما السلام کے درمیان میں ہوئے ہیں یا بعد میں؟ اور ہمارے لئے یہ بات جاننا ضروری بھی نہیں، اور دونوں کے درمیان کتنی پشتیں گذری ہیں اس کی تعیین بھی ضروری نہیں، اصل بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ رسولوں کا سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا ہے، ان سے پہلے جتنے بڑے حضرات گذرے ہیں وہ سب نبی تھے، رسول نہیں تھے۔

رسول اور نبی میں فرق کی مزید وضاحت

رسول اور نبی میں فرق اچھی طرح سمجھیں:

جو شخصیتیں مؤمنین کی طرف مبعوث کی گئی ہیں وہ انبیاء ہیں، اور جو شخصیتیں کفار کی طرف بھی مبعوث کی گئی ہیں وہ رسول ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک لمبے عرصہ تک سب انسان مؤمن تھے، پھر گمراہی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ کوئی مؤمن باقی نہ رہا۔ سب کفر و شرک کی دلدل میں پھنس گئے، پس ان کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے اور ایمان کی روشنی دکھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، جو ان پر ایمان لائے وہ مؤمنین کہلائے اور جو ایمان نہ لائے وہ کافر رہے۔ غرض کفار کی طرف مبعوث ہونے والی سب سے پہلی شخصیت حضرت نوح علیہ السلام کی ہے، اس لئے وہ سب سے پہلے رسول ہیں، اور جو شخصیتیں مؤمنین کی طرف مبعوث ہوئی ہیں وہ انبیاء ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان میں انبیاءِ بنی اسرائیل ہوئے ہیں، وہ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کئے گئے تھے جو سب مؤمنین تھے، اس لئے وہ نبی کہلاتے ہیں۔

نبیوں اور رسولوں کی تعداد کتنی ہے؟

اور کتنے نبی اور کتنے رسول آئے ہیں؟ ان کی تعداد بتانا مشکل ہے، البتہ ایک ضعیف روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد آئی ہے جن میں سے تین سو پندرہ رسول ہیں (رواہ احمد، مشکوٰۃ حدیث ۵۷۳۷ باب بدء الخلق، كتاب أحوال القيامة) مگر یہ ضعیف حدیث ہے۔ اور تعداد جاننا ضروری بھی نہیں، بالاجمال تمام انبیاء پر ایمان لانا کافی ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی ہیں

نبوت کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا، وہ فخر عالم ﷺ پر پورا ہو گیا۔ اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ﴾ یعنی حضرت محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، البتہ آپ میں دو صفتیں ہیں: ایک: آپؐ اللہ کے رسول ہیں، دوسری: آپؐ نبیوں کے سلسلہ کی آخری کڑی ہیں، نبیوں کے سلسلہ کو پورا کرنے والے ہیں، آپؐ آخری نبی ہیں، اب اور کوئی نیا نبی آنے والا نہیں۔

لے پالک کی مطلقہ سے نکاح جائز ہے

اس آیتِ پاک میں پہلا مضمون یہ ہے کہ نبی ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، اس مضمون کا ایک پسِ منظر ہے اس کو سمجھنا چاہئے۔ نبی پاک ﷺ کی ایک زوجہ تھیں حضرت زینب رضی اللہ عنہا، وہ حضور اکرم ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، ان کا نکاح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، جو حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے، حضور ﷺ نے ان کو گود لیا تھا، ان دونوں میں نباہ نہیں ہوا، چنانچہ حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دیدی، عدت کے بعد نبی ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا، کیونکہ متبنّی کی بیوی سے نکاح جائز ہے، مگر غیر مسلموں میں یہ تصور پایا جاتا تھا اور آج بھی پایا جاتا ہے کہ اگر کسی کی اولاد کو گود لے لیا تو وہ حقیقی بیٹا اور بیٹی کی طرح ہوجاتی ہے، اسلام نے اس خیال کو رد کردیا ہے، گود لینے سے حقیقی بیٹا بیٹی نہیں ہوجاتے، وہ غیر کا ہی بیٹا رہتا ہے، البتہ گود لینے والا اس کے ساتھ حسن سلوک کرسکتا ہے، بلکہ کرنا چاہئے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

ظہار سے بیوی ماں نہیں ہوجاتی

اس کی نظیر ظہار ہے، ظہار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ دے کہ تو میرے لئے میری ماں کی طرح ہے۔ اس طرح کہنے سے ظہار ہوجاتا ہے اور کفارہ کی ادائیگی تک بیوی حرام ہوجاتی ہے، جب تک کفارہ ادا نہیں کرے گا بیوی سے صحبت کرنا جائز نہیں ہوگا، مگر بیوی کو ماں کہنے سے وہ ماں نہیں بن جاتی، بدستور بیوی ہی رہتی ہے، اسی طرح گود لیا ہوا بچہ جس کا ہے اسی کا رہتا ہے، گود لینے سے وہ حقیقی بیٹے اور بیٹی کی طرح نہیں ہوجاتا۔ مگر زمانہ جاہلیت میں غیر مسلم یہ سمجھتے تھے کہ گود لینے سے بچہ حقیقی بیٹے کی طرح ہوجاتا ہے، وہ میراث پاتا ہے، اور باپ کی جگہ گود لینے والے کا نام لکھتے تھے، نبی ﷺ نے جب حضرت زیدؓ کو اپنا بیٹا بنایا تو لوگ ان کو زید بن محمد کہنے لگے۔ آیت کے پہلے حصے میں اسی باطل نظریہ کی تردید ہے۔

حضرت زیدؓ کو گود لینے کی داستان

اور آنحضرت ﷺ نے حضرت زیدؓ کو بیٹا کیوں بنایا تھا؟ دوسرے کی اولاد کو گود وہ لیتا

ہے جس کی کوئی اولاد نہ ہو، آپؐ کی تو اولاد تھی، چار صاحبزادیاں تھیں، تین صاحبزادے ہوئے تھے، اور جس کی اولاد ہوتی ہے وہ دوسرے کے بچہ کو گود نہیں لیتا، پھر حضور اقدس ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو گود کیوں لیا؟

اس کی ایک داستان ہے، زمانۂ جاہلیت میں قبیلے آپس میں لڑتے تھے، اور ایک دوسرے کو قید کرتے تھے، اور ان کو غلام بناتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں حضرت زیدؓ کے قبیلہ پر دشمن قبیلہ نے حملہ کیا، جو قیدی پکڑے گئے ان میں حضرت زیدؓ بھی تھے، اس وقت وہ بچے تھے، وہ غلام بنا کر بیچ دیئے گئے، یہ بچہ بکتا بکتا مکہ پہنچا اور حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا کی ملکیت میں آیا۔ حضرت خدیجہؓ آنحضور ﷺ کی سب سے پہلی بیوی ہیں، پھر جب حضور اکرم ﷺ سے ان کا نکاح ہوا تو یہ بچہ حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضور ﷺ کے گھر میں آیا۔

اُدھر حضرت زید رضی اللہ عنہ کا باپ اپنے بیٹے کی جدائی میں تڑپتا تھا، وہ زندگی بھر تلاش کرتا رہا۔ مگر نامراد رہا، مرتے وقت اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو اور اپنے بھائی کو وصیت کی کہ تم دونوں اس کو ڈھونڈھنا، اور جہاں بھی ملے ہر قیمت پر اس کو واپس لانا، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے قبیلہ کے کچھ لوگ حج کے لئے آئے، زمانۂ جاہلیت میں بھی حج ہوتا تھا، کسی نے حضرت زید کو دیکھا اور پہچان لیا، واپس جا کر ان کے چچا کو اور بھائی کو بتایا کہ زید کو ہم نے منی میں ایک آدمی کے ساتھ دیکھا ہے، ابھی آنحضور ﷺ نبوت سے سرفراز نہیں کئے گئے تھے، مگر آپؐ ہر سال حج کرتے تھے، جب حضرت زید کے بھائی اور چچا کو اطلاع ملی کہ زید مکہ میں ہے اور قریش کے کسی آدمی کے پاس ہے تو وہ بہت سا مال لے کر مکہ آئے تا کہ فدیہ دے کر بھائی کو اور بھتیجے کو چھڑائیں۔ وہ تلاش کرتے ہوئے اور لوگوں سے پوچھتے ہوئے نبی ﷺ تک پہنچے، اور آپؐ سے پوری داستان بیان کی کہ یہ ہمارا بھائی اور ہمارا بھتیجہ ہے، وہ غلام نہیں ہے، وہ کیسے قید ہوا اور اس کے باپ کی کیا حالت تھی اور مرتے وقت اس نے کیا وصیت کی تھی یہ سب داستان آپؐ کو سنائی اور عرض کیا کہ آپؐ جو قیمت چاہیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں، آپؐ اسے ہمیں دیدیں، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: اس سے پوچھ لو، اگر وہ تمہارے ساتھ

جانے کے لئے تیار ہے تو شوق سے لے جاؤ، مجھے کوئی قیمت نہیں چاہیئے، وہ خوش ہو گئے اور حضرت زیدؓ کے پاس گئے، ابھی وہ نابالغ تھے، جا کر ان سے اپنا تعارف کرایا کہ میں تیرا چچا ہوں، یہ تیرا بھائی ہے۔ تیرا باپ تیری جدائی میں بہت تڑپتا رہا ہے اور اس نے مرتے وقت ہمیں وصیت کی ہے اور ہم تجھے لینے آئے ہیں، اور تیرا آقا بھی تجھے بھیجنے پر راضی ہے۔ مگر اس بچے نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: میں زندگی بھر اپنے آقا کے ساتھ رہوں گا، میں نے اپنے آقا میں ایک چیز دیکھی ہے اس لئے میں کبھی ان سے جدا نہیں ہوؤں گا۔ بھائی اور چچا حیرت میں پڑ گئے۔ انھوں نے کہا: باؤلے! تیرا دماغ چل گیا ہے! تو غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے! مگر وہ بچہ کسی صورت میں تیار نہیں ہوا، تو انھوں نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا کہ وہ تو ہمارے ساتھ آنے کے لئے تیار نہیں، آپ سمجھائیں، وہ ہمارے ساتھ آئے، آپؐ نے فرمایا: جب وہ تمہارے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں تو میں اس کو زبردستی اپنے سے کیسے دور کروں!

آپ ﷺ کو زیدؓ کی اس بات سے اتنی خوشی ہوئی کہ آپؐ ان کو لے کر کعبہ شریف کے پاس آئے۔ وہاں قریش کی مجلس جمی ہوئی تھی۔ آپؐ نے ان کو اٹھایا اور فرمایا: لوگو! گواہ رہو، میں نے آج سے اس کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے، ان کے بھائی اور چچا اس سے مطمئن ہو گئے اور خوش ہو کر واپس لوٹ گئے۔ کیونکہ زید اب غلام نہیں رہے تھے، بلکہ عرب کے سب سے معزز قبیلہ قریش کے ایک شخص کے بیٹے بن گئے تھے، یوں آپؐ نے ان کو بیٹا بنایا تھا، ورنہ حضور ﷺ کو بیٹا بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اولاد سے نوازا تھا۔ اور جب بیٹا بنا لیا تو اپنے ہی خاندان میں ان کی شادی کی۔ حضرت زینبؓ جو آپؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں: ان سے ان کا نکاح کیا، مگر دونوں میں موافقت نہ ہوئی، نبی ﷺ بار بار سمجھاتے کہ اللہ سے ڈرو، بگاڑ مت پیدا کرو، باہم الفت و محبت سے رہو، مگر بیل منڈھے نہ چڑھی، بالآخر حضرت زیدؓ نے طلاق دیدی۔ عدت کے زمانہ میں نبی ﷺ نے حضرت زینبؓ پر سے داغ دھونے کے لئے سوچا کہ آپؐ ان سے نکاح کر لیں تا کہ ان کا سر فخر سے اونچا ہو جائے۔ مگر خوف یہ تھا کہ کفار پروپیگنڈہ کریں گے کہ اپنے بیٹے کی مطلقہ (بہو) کو

بیوی بنالیا، اوران کے اس پروپیگنڈہ سے اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ مگر جب عدت پوری ہوئی تو وحی نازل ہوئی، اور آنحضور ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ ہم نے آپؐ کا نکاح حضرت زینبؓ سے کردیا، اب حضور ﷺ کے لئے کچھ سوچنے کا موقع نہیں رہا تھا، چنانچہ باقاعدہ دنیا میں بھی آپؐ کا حضرت زینبؓ سے نکاح ہوا اور وہ بیوی بن کر حضور ﷺ کے گھر میں آگئیں، اور جیسا کہ اندیشہ تھا چاروں طرف طوفان کھڑا ہوگیا کہ لو اپنی بہو کو گھر میں بسالیا، اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، اور یہ بات صاف کردی کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں۔ پس اس کی بیوی سے نکاح جائز ہے۔

آپؐ نے متعدد نکاح کیوں کئے؟

یہاں ایک ضروری بات سمجھ لینی چاہئے۔ نبی پاک ﷺ نے جو متعدد نکاح فرمائے ہیں اس پر اغیار اعتراض کرتے ہیں، اس لئے اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ آپؐ نے متعدد نکاح کیوں کئے ہیں؟ اور اعدائے اسلام جو اعتراض کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

نبی پاک ﷺ نے سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا سے کیا، اس وقت آپؐ کی عمر مبارک ۲۵ سال تھی، اور جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں، آپؐ نے دوسرا کوئی نکاح نہیں کیا۔ آپؐ کی ساری اولاد ـــ ایک صاحبزادے کے علاوہ جو ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے اور جن کا نام ابراہیم تھا ـــ حضرت خدیجہؓ سے ہی ہوئی ہے، دو یا تین صاحبزادے پیدا ہوئے جو بچپن ہی میں وفات پاگئے، اور چار صاحبزادیاں ہوئیں، جب آنحضرت ﷺ نبوت سے سرفراز کئے گئے اس وقت آپؐ کی یہی ایک بیوی تھی۔

حضرت سودہؓ سے نکاح خانگی ضرورت سے کیا:

پھر جب نبوت کے پانچویں یا ساتویں سال حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوگیا تو گھر کا انتظام کرنے والا کوئی نہ رہا۔ آپؐ پر ایک طرف نبوت کی ذمہ داریاں تھیں، دوسری طرف گھر کے انتظام اور بچیوں کی پرورش کا مسئلہ تھا، اس لئے خاندان کی عورتوں نے مشورہ دیا کہ آپؐ شادی کرلیں، تاکہ بیوی آپؐ کے گھر کا انتظام بھی کرے اور بچیوں کو بھی سنبھالے، چنانچہ

آپؐ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا ابتداء نبوت ہی میں مشرف باسلام ہوچکی تھیں اور بیوہ تھیں، ان کا پہلا نکاح ان کے چچازاد بھائی سکران بن عمرو سے ہوا تھا، انھوں نے آکر گھر اور بچیوں کو سنبھالا، یہ دوسری بیوی ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے گھر میں آئیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح بہ اذنِ الٰہی ہوا

اسی زمانہ میں نبی ﷺ نے ایک خواب دیکھا اور دو مرتبہ دیکھا: ایک فرشتہ ریشمی کپڑا لایا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! اس کو کھولئے۔ نبی پاک ﷺ نے اس کو کھولا تو اس میں حضرت عائشہ نظر آئیں۔

حضرت عائشہؓ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں اور ان کے گھر میں آنحضور ﷺ کا بکثرت آنا جانا تھا۔ اس وقت حضرت عائشہؓ بچی تھیں، ۶ سال کی تھیں اور آپؐ نے ان کو دیکھا تھا اس لئے جب آپؐ نے کپڑا کھولا اور اس میں وہ نظر آئیں تو آپؐ نے فوراً پہچان لیا کہ عائشہ ہیں۔ فرشتہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ آپ کی بیوی ہیں۔

(بخاری حدیث ۷۰۱۲)

آپؐ نے سوچا: شادی تو کرنی ہے، مگر عائشہ ابھی بچی ہیں، سات آٹھ سال کے بعد بالغ ہونگی اور رخصتی کے لائق ہونگی۔ اور بیوی کی ضرورت ابھی ہے، جو گھر کو سنبھالے اور بچیوں کی پرورش کرے، بخاری کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے دل میں سوچا: اگر یہ بات اللہ کی طرف سے ہے تو اس کا کوئی سبب بنے گا، چند دن کے بعد آپؐ نے پھر بعینہٖ یہی خواب دیکھا۔

دوسری طرف یہ ہوا کہ جب خاندان کے لوگ آنحضرت ﷺ کے لئے مناسب رشتہ تلاش کر رہے تھے: ابوبکرؓ کے دل میں خیال آیا کہ حضرت سودہؓ بوڑھی عورت ہیں، چند دن کی مہمان ہیں، اگر کسی مناسب جگہ آپؐ کا رشتہ ہوجاتا تو بہتر تھا۔ اس وقت حضرت عائشہ بچی تھیں اور دوسری کوئی صاحبزادی ان کی نہیں تھی۔ آپؓ نے خیال کیا کہ عائشہ ابھی بچی ہیں، نکاح کے لائق نہیں، مگر انھوں نے سوچا کہ حضرت سودہؓ بوڑھی عورت ہیں، بظاہر زیادہ دنوں کی مہمان نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی عمر میں برکت فرمائی، اور وہ حضور ﷺ کے بعد تک

زندہ رہیں، لیکن عمر طبعی کے اعتبار سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ اندازہ کیا کہ چند سالوں میں ان کا انتقال ہوجائے گا، اور اس وقت تک عائشہ بڑی ہوجائیں گی، اور حضرت سودہؓ کے بعد وہ آپؐ کا گھر سنبھال لیں گی، یہ سب باتیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں تھیں۔

اُدھر حضور ﷺ دو مرتبہ خواب میں حضرت عائشہ کو دیکھ چکے تھے، اور فرشتہ کہہ چکا تھا کہ وہ آپ کی بیوی ہیں، چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ نے پیش کش کی تو عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضور ﷺ کا نکاح ہوگیا، مگر وہ شوہر کے گھر بھیجنے کے قابل نہیں تھیں، اس لئے صرف نکاح ہوا، رخصتی عمل میں نہیں آئی (۱)

ہجرت تک تنہا حضرت سودہؓ آپؐ کے گھر میں رہیں، ہجرت کے بعد دوسرے سال حضرت عائشہ اس قابل ہوگئیں کہ وہ شوہر کے گھر بھیجی جاسکیں، چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال ان کی رخصتی عمل میں آئی۔ اب آپؐ کے گھر میں دو بیویاں اکٹھی ہوئیں، اس وقت نبی ﷺ کی عمر مبارک ۵۵ سال تھی۔ اور پوری عمر مبارک ۶۳ سال ہوئی ہے، پس گویا وفات سے آٹھ سال پہلے حضور ﷺ کے گھر میں دو بیویاں جمع ہوئیں ہیں۔

آنحضورؐ نے حضرت خدیجہؓ اور حضرت سودہؓ کے علاوہ تمام نکاح ملّی، ملکی اور شخصی مصلحتوں سے کئے ہیں

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آدمی کو چند بیویوں کی ضرورت جوانی میں ہوتی

---

(۱) یورپ وامریکہ میں لوگ سوال کرتے ہیں: چھ سال کی لڑکی سے نکاح کرنے کا کیا تک تھا؟ وہ لوگ نکاح اور زفاف کا فرق نہیں جانتے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی، ہندوؤں میں بھی اور مسلمانوں میں بھی نابالغوں کے نکاح کا رواج ہے، مگر لڑکی شوہر کے گھر اس وقت بھیجی جاتی ہے: جب وہ شوہر کے قابل ہوجائے، حضرت عائشہؓ بھی بلوغ کے بعد رخصت کی گئی تھیں۔

اور یورپ وامریکہ والوں کے نزدیک بلوغ کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے یہ غلط ہے، اسلام میں جب لڑکی کو ماہواری آجائے تو وہ بالغ ہوجاتی ہے۔

ہے، پچپن سال میں آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں متعدد بیویوں کی ضرورت نہیں ہوتی، اور آپؐ کی جوانی اور ادھیڑ عمر ایک بیوی کے ساتھ گذری ہے، اور ایک سے زائد بیویاں عمر مبارک کے آخری آٹھ سالوں میں کی ہیں۔ اس سے ہر صاحب فہم سمجھ سکتا ہے کہ آپؐ نے جو متعدد نکاح کئے ہیں وہ ذاتی ضرورت سے نہیں کئے، بلکہ کسی مصلحت سے کئے ہیں اور وہ مصلحتیں تین ہیں: ملّی، ملکی اور شخصی۔ اور شخصی سے مراد حضور اکرم ﷺ کی ذات نہیں ہے بلکہ بیوی صاحبہ کی یا ان کے علاوہ کسی کی دلجوئی کے لئے نکاح کیا ہے، یہاں سب نکاحوں کی تفصیل کرنا تو مشکل ہے، ایک ایک مصلحت کی ایک ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت زینبؓ سے نکاح ملّی مصلحت سے کیا ہے

پہلے دو باتیں آپ حضرات ذہن میں رکھیں:

پہلی بات: نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ تمام نکاح بیوہ عورتوں سے کئے ہیں، حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا جو آپؐ کی سب سے پہلی زوجۂ مطہرہ ہیں، اور جن کے ساتھ آپؐ نے پوری جوانی کا زمانہ گذارا ہے وہ بھی بیوہ تھیں، حضور اکرم ﷺ سے پہلے دو جگہ ان کی شادی ہو چکی تھی۔ پہلا نکاح ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوا تھا اور دوسرا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے۔

دوسری بات: دو نکاح اللہ تعالیٰ نے کرائے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نکاح کرنے کا صریح حکم آیا ہے یا اشارہ ملا ہے، اس لئے آپؐ نے وہ دونوں نکاح کئے ہیں: حضرت زینبؓ کا نکاح اللہ نے کرایا ہے اس نکاح کا تذکرہ قرآنِ کریم میں سورۂ احزاب (آیت ۳۷) میں ہے: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾: جب زیدؓ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے (اور انھوں نے طلاق دیدی) تو ہم نے ان کے ساتھ آپؐ کا نکاح کر دیا، پس حضرت زینبؓ سے نکاح وحی متلو سے ہوا ہے، اور حضرت عائشہؓ سے نکاح وحی غیر متلو سے ہوا ہے، ان کو خواب میں دکھایا گیا اور بتایا گیا کہ یہ آپ کی بیوی ہیں، یہ دو نکاح تو اللہ نے کرائے ہیں، باقی جتنے نکاح کئے ہیں وہ حضور اقدس ﷺ نے خود کئے ہیں، اور سارے

نکاح مذکورہ تین مصلحتوں سے کئے ہیں۔

ملّی، ملکی اور شخصی مصلحتوں کی مثالیں

ملّی ضرورت سے حضرت عائشہ اور حضرت زینب ؓ سے اللہ تعالیٰ نے نکاح کرایا ہے اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت معاویہ ؓ کی بہن حضرت ام حبیبہ ؓ سے جو حضور ﷺ نے نکاح کیا ہے وہ ملکی (سیاسی) مصلحت سے کیا ہے، اور شخصی مصلحت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ ؓ اور حضرت ام سلمہ ؓ سے کیا ہے، حضرت حفصہ ؓ سے نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے لئے اور ام سلمہ ؓ سے نکاح ان کی دلجوئی کے لئے کیا ہے۔

حضرت عائشہ ؓ سے نکاح کی مصلحت

نبی ﷺ کی زندگی خلوت وجلوت میں منقسم ہے اور آپ ؐ کے قول وفعل سے شریعت بنتی ہے اور آپ ؐ جلوت میں جو کچھ ارشاد فرمائیں گے یا جو کام کریں گے اس کو صحابہ سنیں گے، دیکھیں گے اور محفوظ کریں گے، مگر خلوت کے اقوال وافعال کو صحابہ اخذ نہیں کر سکتے، جبکہ وہ اقوال وافعال بھی شریعت ہیں اس لئے ضروری تھا کہ آپ ؐ کے گھر میں کوئی ایسی سمجھ دار زیرک بیوی ہو جو خانگی زندگی کے اقوال وافعال کو محفوظ کرے۔ اور حضرت سودہ ؓ اگرچہ آپ ؐ کے گھر میں تھیں، مگر وہ عمر رسیدہ تھیں، اور بہت زیادہ زیرک بھی نہیں تھیں: وہ اس اہم ترین ذمہ داری کو بخوبی انجام نہیں دے سکتی تھیں، اس لئے وحی غیر متلو سے حضرت عائشہ ؓ سے آپ ؐ کا نکاح کرایا گیا تاکہ وہ خانگی زندگی کے اقوال وافعال کو محفوظ کر کے امت تک پہنچائیں اور شریعت مکمل ہو، چنانچہ جب ۲ ہجری سے شریعت نازل ہونی شروع ہوئی تب وہ حضور ﷺ کے گھر میں آئیں (۱)

---

(۱) مکی زندگی میں اسلامی عقائد: توحید، رسالتِ محمدی اور آخرت پر زور دیا گیا تھا، احکام تفصیل سے نازل نہیں ہوئے تھے، بالاجمال زکات وغیرہ کا حکم آیا تھا مگر اس کی تفصیلات نازل نہیں ہوئی تھیں، تفصیلات ۲ ہجری سے نازل ہونی شروع ہوئی ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نصف دین کی حامل

ایک موقع پر حضور ﷺ نے صحابہ میں اعلان فرمایا: **خذوا نصفَ دینکم من حُمیراء**: آدھا دین عائشہؓ سے حاصل کرو، آدھے دین سے پچاس فیصد مراد نہیں، عربی میں لفظ نصف مختلف اعتبارات سے بولا جاتا ہے، علم المیراث (علم الفرائض) کو آدھا علم کہا گیا ہے، **تعلّموا الفرائض فإنها نصف العلم**: علم الفرائض کو سیکھو: وہ آدھا علم ہے، انسان کی زندگی دو حصوں میں منقسم ہے: موت سے پہلے کی زندگی اور موت کے بعد کی زندگی، پس جو احکام دنیا کی زندگی سے متعلق ہیں وہ آدھا علم ہیں، اور علم میراث موت کے بعد کے احوال سے متعلق ہے، اس لئے وہ آدھا علم ہے۔ غرض آدھے کے لئے پچاس فیصد ہونا ضروری نہیں، مختلف اعتبارات سے نصف کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے جو فرمایا ہے کہ نصف علم عائشہؓ سے حاصل کرو، یعنی خلوت کے احکام حضرت عائشہ سے معلوم کرو، اور جلوت کے احکام صحابہ سے سیکھو، نفس الامر میں جلوت کے مسائل زیادہ ہیں اور خلوت کے کم مگر جلوت اور خلوت آپؐ کی زندگی کے دو پہلو ہیں، اس اعتبار سے خلوت کے احکام کو نصف علم کہا گیا ہے (۱)

حضرت زینبؓ سے نکاح لے پالک کی رسم ختم کرنے کے لئے کیا ہے

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ جب سے شریعت کی تفصیلات نازل ہونی شروع ہوئی ہیں تب سے حضرت عائشہؓ حضور ﷺ کے گھر میں آئی ہیں تاکہ خلوت کے احکام محفوظ کر کے امت کو پہنچائیں۔ یہ ملّی مصلحت ہے اسی مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کا نکاح آپؐ سے کرایا ہے اور اسی مصلحت سے حضرت زینبؓ سے بھی اللہ تعالیٰ نے نکاح کرایا ہے، زمانہ

---

(۱) حدیث **خذوا شطر دینکم من الحمیراء** محض بے اصل روایت ہے، کسی کتاب میں اس کی کوئی سند نہیں (تحفۃ الاحوذی ۴: ۳۶۴) مگر ترمذی میں حدیث (نمبر ۳۹۱۰) ہے: ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب بھی صحابہ پر کوئی بات مشتبہ ہوتی تھی تو حضرت عائشہؓ کے پاس اس مسئلہ کا کچھ نہ کچھ علم ہوتا تھا پس مضمون صحیح ہے کہ حضرت عائشہؓ کے پاس دین کا بڑا علم تھا۔

جاہلیت سے یہ تصور چلا آرہا تھا کہ منہ بولا بیٹا، بیٹی حقیقی اولاد کی طرح ہیں۔ حضرت زینبؓ سے جو آپؐ کے متبنی حضرت زیدؓ کی مطلقہ تھیں نکاح کرا کر اس رسم کو ختم کر دیا۔

منہ بولے بیٹے بیٹی سے پردہ واجب ہے

چنانچہ آج معمولی پڑھے لکھے آدمی کے ذہن میں بھی کوئی الجھن نہیں۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ منہ بولا بیٹا اور بیٹی حقیقی اولاد نہیں۔ لہٰذا ان کو میراث نہیں ملے گی۔ ہاں گود لینے والا اپنی زندگی میں ان کو مکان، زمین، دولت وغیرہ دیدے یا تہائی مال کی وصیت کرے تو جائز ہے، مگر ان کو میراث نہیں ملے گی۔ میراث صرف ورثاء کا حق ہے، اور متبنی وارث نہیں، اس کے احکام وہی ہیں جو اجنبی کے ہیں، چنانچہ گود لی ہوئی لڑکی سے بالغ ہونے کے بعد پردہ واجب ہے، کیونکہ وہ اجنبی ہے، گود لینے سے وہ بیٹی نہیں بن گئی، اسی طرح کسی عورت نے کوئی لڑکا گود لیا تو بالغ ہونے کے بعد گود لینے والی پر پردہ کرنا واجب ہے، کیونکہ وہ ماں نہیں ہے۔ یہ تمام احکام اس نکاح کے ذریعہ واضح کئے گئے، اور زمانۂ جاہلیت سے جو تصور چلا آرہا تھا اس کو اس نکاح کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔

حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح ملکی (سیاسی) مصلحت سے کیا ہے

اور حضور ﷺ نے بعض نکاح ملکی مصلحت سے کئے ہیں، نبی ﷺ جہاں اللہ کے رسول تھے، حکومت کے سربراہ بھی تھے، اور حکومت کے سربراہ کو بہت سے معاملات سیاسی انداز سے سوچنے پڑتے ہیں، اور ان کا حل تلاش کرنا پڑتا ہے، اسی ملکی مصلحت سے حضور ﷺ نے کئی نکاح کئے ہیں، ان کی تفصیل کرونگا تو بات لمبی ہو جائے گی، اس لئے میں نے اس کی جو مثال دی ہے، اس کی وضاحت کرتا ہوں۔

وہ مثال حضرت ام حبیبہؓ کے نکاح کی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب نبی ﷺ اور صحابہ کرام ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے، اور جو مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے وہ بھی مدینہ آنے لگے اور انصار نے ہر طرح مسلمانوں کی نصرت وحمایت کا وعدہ کیا تو کفار مکہ نے اہل مدینہ کو خط لکھا کہ جو مسلمان بھاگ کر تمہارے یہاں آئے ہیں ان کو واپس کرو،

مکتبہ حجاز دیوبند

ورنہ ہم تم پر حملہ کریں گے، مدینہ والوں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا، اس سے قریش کا پارہ چڑھ گیا۔ انھوں نے حملہ کی تیاریاں شروع کردیں، ایک قافلہ ہتھیار خریدنے کے لئے ملک شام بھیجا، جب وہ قافلہ ہتھیار لے کر لوٹا تو مسلمانوں کو اس کی خبر ہوئی، انھوں نے اس کا تعاقب کرنے کا ارادہ کیا، جب اس کی اطلاع کفار مکہ کو ہوئی تو وہ بڑے لشکر کے ساتھ قافلہ کو بچانے کے لئے نکلے، اس طرح بدر کا معرکہ پیش آیا۔

یہ اسلام کی سب سے پہلی جنگ تھی، اس جنگ میں مکہ والے حملہ آور نہیں ہوئے تھے، حقیقت میں وہ اپنا قافلہ بچانے کے لئے نکلے تھے جو شام سے ہتھیار لے کر مکہ آرہا تھا، قافلہ تو صحیح سالم نکل گیا، مگر مکہ سے جو لشکر قافلہ کو بچانے کے لئے چلا تھا وہ واپس نہیں لوٹا، بلکہ مدینہ کی طرف بڑھا اور بدر کا معرکہ پیش آیا، اس جنگ کے بعد بھی بار بار مکہ والے مدینہ پر چڑھ کر آئے، احد میں چڑھ کر آئے، غزوۂ احزاب میں تو تمام قبیلے ایک ساتھ اکٹھا ہو کر حملہ آور ہوئے، اور ان تمام جنگوں میں — بدر کے علاوہ — کمانڈر انچیف ابوسفیان تھے، وہی سردار مکہ تھے اور وہی بار بار فوج کشی کر رہے تھے، اگر چہ وہ بعد میں مسلمان ہوگئے تھے مگر جنگ بدر کے علاوہ جتنی مرتبہ کفار مدینہ پر حملہ آور ہوئے ہیں، تمام جنگوں میں کمانڈر انچیف ابوسفیان ہی تھے، ابوسفیان کی ایک صاحبزادی ام حبیبہ تھیں، وہ مسلمان ہوگئی تھیں، اور اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھیں، جب ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا اور نبی ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ایک وفد شاہِ حبشہ نجاشی رحمہ اللہ کے پاس بھیجا۔ آپؐ نے اس وفد کے ساتھ نجاشیؒ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ام حبیبہ کو میرے نکاح کا پیغام دو، چنانچہ شاہ حبشہ نجاشی رحمہ اللہ نے نبی پاک ﷺ کی طرف سے منگنی بھیجی۔ حضرت ام حبیبہ کے لئے اس سے بڑی کیا سعادت ہوسکتی تھی انھوں نے فوراً منگنی قبول کرلی، پھر نجاشی رحمہ اللہ کے دربار میں حضرت ام حبیبہ کا نکاح پڑھا گیا، اور حضور اکرم ﷺ کی طرف سے نجاشیؒ وکیل بنے اور خود انھوں نے اپنی طرف سے مہر ادا کیا اور فرمایا کہ جب نبیوں کا نکاح ہوتا ہے تو اس کے بعد کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور کھلائی جاتی ہے، چنانچہ انھوں نے نکاح کے بعد مٹھائی تقسیم کی، پھر حضرت ام حبیبہؓ کو وفد کے ساتھ بہت سے ہدایا دے کر مدینہ منورہ بھیج دیا۔

اس نکاح کی جب ابوسفیان کو خبر ہوئی تو ان کی مکھی تیل میں گری، اس کے بعد ابوسفیانؓ کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ مدینہ پر چڑھائی کریں۔ غزوۂ احزاب کے بعد یہ نکاح ہوا تھا۔ جب ابوسفیان کو اس نکاح کی خبر ہوئی تو انھوں نے نبی ﷺ کے بارے میں کہا: اس سانڈ کو کوئی نکیل نہیں ڈال سکتا۔

غرض حضرت ام حبیبہؓ کے ساتھ نکاح کرنے کی وجہ سے مکہ والوں سے لڑائی ختم ہوگئی، یہ ملکی مصلحت تھی، اور بھی کئی نکاح حضور ﷺ نے اس مصلحت سے کئے ہیں، پھر کبھی مقصد پورا ہوا، کبھی نہیں ہوا۔ حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کرنے کا جو مقصد تھا اس میں سو فیصد کامیابی ہوئی۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے بھی نکاح ملکی مصلحت سے کیا ہے

اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح یہودیوں کو قریب لانے کے لئے کیا تھا، مگر اس میں ناکامی ہوئی۔ یہود بے بہبود آنحضور ﷺ اور اسلام کے کٹر مخالف تھے، ان کے دل بغض وعناد سے بھرے ہوئے تھے، اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حیی بن اخطب سردار بنی نضیر کی بیٹی تھیں، اور دوسرے سردار کنانہ بن ابی الحقیق کی بیوی تھیں، جنگ خیبر میں یہ دونوں مارے گئے تھے، نبی ﷺ نے حضرت صفیہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا، تا کہ یہود قریب آئیں، کیونکہ جب حضور ﷺ ان کے داماد بن جائیں گے تو قدرتی طور پر ان کو حضور ﷺ سے محبت ہوگی اور قریب آئیں گے، مگر جو مقصد تھا وہ حاصل نہیں ہوا، وہ ناہنجار قوم ذرا قریب نہیں آئی، یہ تو اللہ کے اختیار کی بات ہے کہ مقصد حاصل ہوگا یا نہیں؟ بندہ تو اسباب اختیار کرتا ہے، پھر کبھی اسباب کارگر ہوتے ہیں اور کبھی فیل ہوجاتے ہیں۔

حضرت حفصہؓ سے نکاح حضرت عمرؓ کی دلجوئی کے لئے کیا ہے

اور بعض نکاح حضور ﷺ نے شخصی مصلحت سے کئے ہیں، مگر میں نے بتایا ہے کہ شخص سے مراد حضور اکرم ﷺ کی ذات نہیں ہے، یعنی حضور ﷺ نے اپنی ذاتی ضرورت سے وہ نکاح نہیں کئے، بلکہ یا تو جس عورت سے نکاح کیا ہے اس کی دلجوئی مقصود تھی یا اس عورت

کے کسی متعلق کی، جیسے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے لئے کیا ہے، حضرت حفصہؓ کا پہلا نکاح خُنیس بن حذافہ سَہمی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، یہ بدری صحابی ہیں اور جنگ بدر کے بعد مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوا ہے، جب حضرت حفصہؓ بیوہ ہوگئیں تو حضرت عمرؓ کو ان کی شادی کی فکر ہوئی، چنانچہ وہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملے اور ان کے سامنے پیشکش کی۔ حضرت عثمان غنی نے فرمایا: میں سوچ کر جواب دوں گا، پھر چند دن کے بعد جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا: میرا فی الحال شادی کرنے کا ارادہ نہیں، پھر حضرت عمرؓ: حضرت ابوبکرؓ سے ملے اور ان کے سامنے پیشکش کی، حضرت ابوبکرؓ خاموش ہوگئے، کوئی جواب نہیں دیا، جس سے حضرت عمرؓ کو ملال ہوا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے انکار سے ملال نہیں ہوا تھا، کیونکہ انھوں نے صاف جواب دے دیا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ کے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے، وہ حضرت ابوبکر سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، اور ان سے حضرت عمرؓ کو بہت زیادہ امید تھی، اگر وہ بھی انکار کردیتے تو زیادہ غم نہ ہوتا، کیونکہ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہے، کسی پر زبردستی اپنی مرضی نہیں تھوپی جاسکتی، مگر حضرت ابوبکرؓ بات سن کر خاموش ہوگئے، کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بڑا رنج ہوا۔

اس کے بعد چند دن گذرے تھے کہ نبی ﷺ نے اپنے لئے پیام دیا، حضرت عمرؓ خوش ہوگئے، اور حضرت حفصہؓ کا آپؐ سے نکاح کردیا، تب حضرت ابوبکرؓ نے کہا: تم نے جس وقت حفصہؓ سے نکاح کی پیشکش کی تھی اور میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا: اس وقت تمہیں غصہ تو آیا ہوگا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: بہت غصہ آیا تھا! حضرت ابوبکرؓ نے کہا: وہ ایک راز تھا۔ میں نے اس وجہ سے جواب نہیں دیا تھا کہ حضور اکرم ﷺ نے حفصہ کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا تھا کہ جب سے میں نے عائشہ سے نکاح کیا ہے: عمر کا دل ٹوٹا ہوا ہے، اب حفصہ خالی ہوئی ہیں، پس کیا میں ان سے نکاح کرلوں؟ میں نے آپؐ کو مشورہ دیا تھا کہ آپؐ ضرور ان سے شادی کرلیں، اس سے عمرؓ کی دلجوئی ہوگی، اور میں اس وقت رسول اللہ ﷺ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا، اگر آپؐ حفصہ سے شادی نہ کرتے تو میں کرلیتا، غرض آنحضور ﷺ

نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح نہ اپنی ضرورت کے لئے کیا نہ حفصہؓ کی ضرورت سے، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے لئے کیا تھا(۱)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ سے بھی نکاح شخصی مصلحت سے کیا ہے

اور حضرت ام سلمہؓ سے نکاح خود ان کی دلجوئی کے لئے کیا ہے، ان کا پہلا نکاح ان کے چچازاد بھائی ابوسلمۃ بن عبدالاسد مخزومیؓ سے ہوا تھا، انہی کے ساتھ وہ مشرف باسلام ہوئیں تھیں، اور انہی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی، پھر وہاں سے مکہ مکرمہ واپس آ کر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ جب مدینہ میں حضرت ابوسلمہؓ کا انتقال ہو گیا تو نبی ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کی دلداری کے لئے ان سے نکاح کرلیا۔ اور ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد علم وفضل میں حضرت ام سلمہؓ ہی کا نمبر ہے، آنحضور ﷺ کی خانگی زندگی کو حضرت عائشہؓ کے بعد سب سے زیادہ انھوں نے محفوظ کیا ہے۔

نبی ﷺ کسی مرد کے باپ نہیں

خیر بات دوسری طرف نکل گئی، میں یہ مضمون سمجھا رہا تھا کہ حضرت زینبؓ آنحضور ﷺ کے متبنی حضرت زیدؓ کی بیوی تھیں، جب انھوں نے طلاق دیدی اور عدت کے بعد نبی ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا تو مشرکین نے بڑا طوفان مچایا کہ لوجی بہو سے نکاح کرلیا! اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ﴾ ان کو جواب دیا کہ تم کیا پروپیگنڈہ کر رہے ہو، حضور پاک ﷺ کا کوئی بچہ بالغ نہیں ہوا، رجل: عربی میں بالغ آدمی کو کہتے ہیں، بچہ بلوغ سے پہلے صَبِیٌّ کہلاتا ہے، حضور ﷺ کے نابالغ لڑکے تو ہوئے ہیں، مگر کوئی لڑکا رجلٌ نہیں ہوا، پھر بیٹے کی بہو کہاں سے آئی؟ اس ٹکڑے

---

(۱) حضرت عمرؓ ہمیشہ حضرت ابوبکرؓ سے دین میں آگے بڑھنا چاہتے تھے، مگر کبھی نہ بڑھ سکے۔ جب ابوبکرؓ نے عائشہؓ کا آپؐ سے نکاح کیا، اس زمانہ میں عمرؓ بھی اس کے خواہشمند تھے، مگر اس وقت ان کی کوئی لڑکی نہیں تھی، چنانچہ اس وقت سے ان کا دل ٹوٹا ہوا تھا۔ اب موقع آیا تو آپؐ نے حفصہ سے نکاح کر کے ان کی دلجوئی کی۔

میں یہی بات کہی گئی ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی دو خوبیاں

لیکن یہاں ذہنوں میں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب لوگوں کے بالغ لڑکے ہیں اور حضور ﷺ کا کوئی بالغ لڑکا نہیں ہوا تو یہ بات ایک اعتبار سے نقص ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی دو خوبیاں بیان کیں: ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ لکن استدراک کے لئے آتا ہے، یعنی پہلے کلام سے جو وہم پیدا ہوتا ہے اس کو لکن سے دفع کیا جاتا ہے، فرمایا: آپ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے سلسلہ کو پورا کرنے والے ہیں۔ یہ دو خوبیاں حضور اکرم ﷺ میں ہیں۔

رسول اللہ ہونے کی وضاحت

مکتبہ حجاز دیوبند

پہلی خوبی یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور رسول اپنی امت کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ جیسے استاذ اپنے شاگردوں کا روحانی باپ ہوتا ہے، پیر اپنے مریدوں کا روحانی باپ ہوتا ہے، اللہ کا رسول بھی اپنی امت کا روحانی باپ ہوتا ہے، کیونکہ اس کا درجہ استاذ اور پیر سے بڑھا ہوا ہے، پس قیامت تک جتنے مؤمنین ہونگے، نبی ﷺ سب کے روحانی باپ ہیں، پس اگر نبی ﷺ کے چند جسمانی بیٹے نہ ہوئے تو کیا فرق پڑتا ہے؟(۱)

خاتم النّبیین کی وضاحت

اور آپ کی دوسری خوبی یہ ہے کہ آپ تمام نبیوں کے خاتم ہیں، خاتم کے معنی ہیں: آخری سرا، ہر چیز جس سرے پر رک جاتی ہے وہ سرا خاتم ہے، جیسے مسجد میں روشنی بلب سے پھیل رہی ہے، اور بلب میں روشنی پاور ہاؤس سے آرہی ہے، پس پاور ہاؤس خاتم ہے، اسی طرح ہر

---

(۱) نسبی بیٹا ہونا بھی ایک کمال ہے اور روحانی بیٹے ہونا بھی۔ اور تمام کمالات ہر بندے کو ملنے ضروری نہیں، ہر کمال کی مالک ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اب رہی یہ بات کہ کس کو کونسا کمال دینا چاہئے؟ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت پر موقوف ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بالغ بیٹے نہیں دیئے: اس کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اور ان گنت روحانی اولاد عطا فرمائی اس کی حکمت ظاہر ہے۔

کمال کا ایک آخری سرا ہوتا ہے، اور نبوت انسانیت کے لئے بڑا کمال ہے، بلکہ اس سے بڑا کوئی کمال نہیں، اور انبیاء بے شمار ہوئے ہیں اور جو رسول ہیں وہ بھی نبی ہیں، پس ان سب کا آخری سرا کون ہے؟ ان کا آخری سرا سرکارِ مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

آپ ﷺ نبوت کے ساتھ بالذات اور دوسرے انبیاء بالعرض متصف ہیں:

اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جو نبوت ملی ہے وہ نبی پاک ﷺ کے طفیل میں ملی ہے، نبی ﷺ نبوت کے ساتھ متصف بالذات ہیں اور دوسرے انبیاء متصف بالعرض، جیسے سورج نکلتا ہے تو زمین کا ذرہ ذرہ روشن ہوجاتا ہے، سورج سے صحن میں روشنی آتی ہے، صحن سے کمرہ روشن ہوجاتا ہے، پس روشنی کے ساتھ سورج بالذات متصف ہے، اور صحن اور کمرہ بالعرض۔ صحن بلاواسطہ اور کمرہ بالواسطہ۔ اسی طرح تمام انبیائے کرام کو نبی ﷺ کے فیض سے نبوت ملی ہے، اصل نبی حضور ﷺ ہیں اور باقی تمام انبیاء آپ ﷺ کے فیض سے نبی بنے ہیں، سورۂ آلِ عمران (آیت ۸۱) میں ارشادِ پاک ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيِّيْنَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتٰبٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ﴾: اس آیت کریمہ میں یہ مضمون ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے اور ان کی پشت سے قیامت تک کی ساری اولاد نکالی گئی، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے دو عہد لئے۔ ایک: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے اقرار کیا کہ ہاں آپ ہی ہمارے رب ہیں، یہ عہد الست کہلاتا ہے۔ اور سورۂ اعراف (آیت ۱۷۲) میں اس کا ذکر ہے۔ اور دوسرا عہد نبیوں سے لیا گیا، اس آیت میں اسی دوسرے عہد کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دیکھو اگر میں تمہیں نبوت سے سرفراز کروں، آسمانی کتاب تم پر نازل کروں، حکمت عنایت کروں، پھر تمہارے زمانہ میں محمد ﷺ آجائیں تو تم سب ان پر ایمان لاؤ گے؟ اور ان کی مدد کرو گے؟ سب نبیوں نے جواب دیا: ہم اپنی نبوت چھوڑ دیں گے اور خاتم النّبیین محمد ﷺ پر ایمان لے آئیں گے۔ یہ اس آیت کا خلاصہ ہے اور اس کی تفصیل لمبی ہے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبوت سے درحقیقت حضور ﷺ سرفراز کئے گئے ہیں، اور آپ ﷺ کے فیض سے تمام انبیاء کو نبوت ملی

ہے، اور جب اصل اور عارض جمع ہو جائیں تو اصل کی چلتی ہے، عارض کی نہیں چلتی، اسی لئے نبی پاک ﷺ نے فرمایا: اگر موسیٰ علیہ السلام آج موجود ہوتے تو میری پیروی کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا، اسی طرح جو بھی نبی حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود ہوگا اس کے لئے آپؐ کی اتباع ضروری ہوگی۔

عیسیٰ علیہ السلام نبی ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے

چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام جو پہلے کے نبی ہیں، جب وہ قیامت سے پہلے آسمان سے اتریں گے تو اپنی نبوت پر عمل نہیں کریں گے، بلکہ نبی پاک ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے اور اسی کے مطابق مسلمانوں کی راہنمائی کریں گے۔

یہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان پر کیا گناہ کیا تھا جو ان کی نبوت ختم ہوگئی؟ وہ آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے نبی تھے، اور جب اتریں گے تو نبی نہیں ہونگے!

ایسا سوچنے والے غلطی پر ہیں، ان کی نبوت برقرار رہے گی، مگر اب وہ اپنی شریعت پر عمل نہیں کریں گے، اس کو ایک مثال سے سمجھیں: ہندوستان کا وزیر اعظم یہاں امریکہ میں آیا، جب تک وہ امریکہ میں رہے گا اپنے ملک کا وزیر اعظم ہوگا، مگر اس ملک میں اس کا کوئی قانون نہیں چلے گا، اس کو اس ملک کے قانون کی پیروی کرنی ہوگی، اگر وہ اس ملک کے قانون کے خلاف کار چلائے گا تو ماخوذ ہوگا۔ اس کی وزارت ختم نہیں ہوئی، وہ بدستور اپنے ملک کا وزیر اعظم ہے، مگر اس کو اتباع اس ملک کے قانون کی کرنی ہوگی۔ یہاں امریکہ میں وہ اپنے ملک کا قانون نہیں چلا سکتا۔

مکتبہ حجاز دیوبند

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیشک نبی ہونگے، ان کی نبوت برقرار ہوگی، مگر جب حضور ﷺ کے زمانہ میں تشریف لائیں گے تو آپؐ ہی کی شریعت پر خود بھی عمل کریں گے اور دوسروں کو بھی عمل کرائیں گے۔

نزولِ عیسیٰ کا ثبوت قرآنِ کریم سے

اور یہ بات قرآنِ کریم میں دو جگہ آئی ہے، ایک: سورۂ آل عمران میں، دوسری سورۂ

انعام کے آخر میں ——— فرشتے نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو خوشخبری دیتے ہوئے کہا تھا: ﴿يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ (آل عمران ۴۸ و ۴۹) اللہ تعالیٰ ان کو قرآن سکھائیں گے، حدیث سکھائیں گے، تورات سکھائیں گے اور انجیل سکھائیں گے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں رہے، قرآن نہیں اترا تھا، قرآن حضور ﷺ پر اترا ہے۔ اور حدیثیں حضور ﷺ کے ارشادات ہیں، وہ بھی وجود میں نہیں آئی تھیں، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث کب سکھائیں گے؟ اس میں صاف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آخری دور میں اترنا ہے، جب دنیا میں قرآن وحدیث کا وجود ہو جائے گا اس وقت اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سکھلائیں گے۔ پس پہلا اشارہ تو آیت پاک میں یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی نہیں دی گئی، جیسا کہ عیسائیوں کا اور یہودیوں کا عقیدہ ہے، ان کے خیال فاسد کو قرآن نے رد کیا ہے ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ (النساء آیت ۱۵۷) بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس اٹھالیا ہے، کیوں اٹھالیا ہے؟ ان کو آخری دور میں اتارنا ہے، اور ان کو قرآن وحدیث سکھانا ہے، اور دوسرا اشارہ یہ ہے کہ نزول کے بعد آپ شریعتِ محمدی پر عمل کریں گے، ورنہ قرآن وحدیث سکھانے کی کیا ضرورت تھی؟

انجیل: تورات کا ضمیمہ ہے

اور اس میں تیسرا اشارہ یہ ہے کہ انجیل مستقل کتاب نہیں، بلکہ تورات کا ضمیمہ رہے۔ چنانچہ عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ تورات بھی سکھائیں گے اور انجیل ان پر نازل فرمائیں گے، وہ اپنے زمانہ میں ان دونوں کتابوں سے راہنمائی فرمائیں گے۔ پھر وہ آسمان پر اٹھالئے جائیں گے پھر آخری زمانہ میں ان کو اتاریں گے، اور قرآن وحدیث سکھلائیں گے۔

قرآن وحدیث کی تقدیم اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہے

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب وحکمت (قرآن وحدیث) کی

تعلیم کو پہلے بیان کیا ہے جب کہ نفس الامر میں تورات وانجیل پہلے سکھلائی ہے اور قرآن وحدیث: قرب قیامت میں جب ان کا نزول ہوگا تب سکھلائیں گے، پس قرآن وحدیث کی تقدیم کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ان کو پہلے بیان کیا ہے، اور قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، ایک چیز نفس الامر میں بعد میں ہوتی ہے، مگر اس کو پہلے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اہمیت ظاہر ہو، جیسے اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ﴾ (آلِ عمران ۵۵) یاد کرو جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تمہیں موت دینے والا ہوں اور میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ اس آیت میں موت کا ذکر پہلے کیا ہے اور اٹھائے جانے کا ذکر بعد میں، حالانکہ وجود میں اس کے برعکس ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر پہلے اٹھایا ہے اور موت قربِ قیامت میں جب وہ اتریں گے تب آئے گی، مگر موت کا ذکر پہلے اس لئے کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو، پہلے سے بتا دیا کہ حضرت عیسیٰ بھی ایک انسان ہیں اور جیسے تمام انسانوں کو موت آنی ہے حضرت عیسیٰ کو بھی آنی ہے، لیکن فی الحال وہ آسمانوں پر اٹھائے جائیں گے، اگر پہلے سے یہ کہہ دیا جاتا کہ میں تمہیں اٹھانے والا ہوں تو ان کی امت کو غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غیر معمولی شخصیت ہیں، چنانچہ ان کو موت نہیں آئی، اس وہم کو ختم کرنے کے لئے اللہ جل شانہ نے موت کا ذکر پہلے کیا۔

اسی طرح یہاں بھی قرآن وحدیث کی تعلیم اگرچہ وجود میں بعد میں آئے گی مگر اس کو پہلے ذکر کیا۔ کیوں؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قربِ قیامت میں نزول واقعی ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث ضرور سکھلائیں گے، مگر جب تک ان کا نزول نہیں ہوتا اور ان کو اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث نہیں سکھلاتے، وہاں تک انکار کرنے والوں کے لئے انکار کا موقع تھا، اس لئے تاکید کے لئے کتاب وحکمت کو پہلے بیان کیا۔

خیر بات پھیلتی چلی گئی، اور کہیں سے کہیں نکل گئی، مجھے تو سمجھانا یہ تھا کہ تمام نبیوں کی نبوت سرکارِ مدینہ ﷺ کی نبوت کا فیض ہے، نبی ﷺ نبوت کے ساتھ متصف بالذات

ہیں، اور باقی تمام انبیاء متصف بالعرض، اور آپ خاتم النّبیین ہیں۔ نبوت کے سلسلہ کی آخری کڑی ہیں اور قیامت تک کے تمام لوگوں کے روحانی باپ ہیں، اور گذشتہ تمام امتوں کے روحانی دادا ہیں، آپؐ کا فیض نبیوں کو پہنچا، اور نبیوں کا فیض ان کی امتوں کو پہنچا، اس طرح آپؐ گذشتہ امتوں کے روحانی دادا ہوئے۔

یہاں کوئی سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ آنحضور ﷺ کو دونوں فضیلتوں سے سرفراز کر سکتے تھے، آپؐ کے روحانی بیٹے پوتے بھی ہوتے اور جسمانی بھی، اس میں کیا جرج تھا؟ دونوں فضیلتیں اکٹھا ہو جاتیں تو کیا نقصان تھا؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والے ہیں، ان کی حکمتیں ہم نہیں جان سکتے۔ یعنی ایسا کیوں کیا؟ ایک فضیلت دی، دوسری نہیں دی، اس میں کیا حکمت ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، وہی ہر چیز کا پورا علم رکھتے ہیں، ہم ہر بات نہیں جانتے۔

آپؐ خاتم رُتبی بھی ہیں اور زمانی بھی!

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ جب آپؐ نبوت کے ساتھ بالذات متصف ہیں اور دوسرے انبیاء بالعرض، تو آپؐ کے بعد بھی لوگ آپؐ کے فیض سے نبی ہو سکتے ہیں۔ ایسا خیال صحیح نہیں، قادیانیوں کو ایسا ہی دھوکہ ہوا ہے، کیونکہ آپؐ صرف خاتم رُتبی نہیں ہیں، بلکہ خاتم زمانی بھی ہیں۔ تمام نبیوں کے آخر میں مبعوث ہوئے ہیں۔ کیونکہ ستارے: سورج طلوع ہونے سے پہلے جگمگا سکتے ہیں، مگر جب سورج نکل آتا ہے تو ان کی ضیا پاشی ختم ہو جاتی ہے، اور نبی ﷺ کو قرآن میں ﴿سِرَاجًا مُنِيْرًا﴾ کہا گیا ہے، یعنی آپؐ آفتابِ نبوت ہیں، اس لئے اللہ نے دیگر انبیاء کو پہلے بھیجا، جب وہ اپنی تابانی دکھا چکے تو آفتابِ نبوت طلوع ہوا، اور اب وہ قیامت تک چمکتا رہے گا، اب سابقہ کوئی نبی تابع ہو کر تو آسکتا ہے، مگر نیا کوئی نبی نہیں آسکتا۔

خاتَم (بفتح التاء) اور خاتِم (بکسر التاء) کے ایک معنی ہیں

آیتِ کریمہ میں ﴿خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ﴾ تاء کے زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور زیر کے

ساتھ بھی، بکسر التاء کے معنی ہیں: ختم کرنے والا، پورا کرنے والا۔ اور بفتح التاء کے معروف معنی ہیں: مہر، انگوٹھی (پہلے مہر انگوٹھی میں بنتی تھی) اور مہر: دستاویز کے آخر میں لگائی جاتی ہے، جہاں مضمونِ خط پورا ہوجاتا ہے وہاں اعتبار پیدا کرنے کے لئے مہر لگائی جاتی ہے، نبی ﷺ کے والا ناموں پر بھی مہر خط کے آخر میں لگائی گئی تھی، پس مہر: خط کا مضمون ختم ہونے کی علامت ہے، اور تفسیر کا قاعدہ ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے، اور دو قراءتیں بمنزلہ دو آیتوں کے ہوتی ہیں، اس لئے دونوں لفظ ختم نبوت زمانی پر بھی دلالت کرتے ہیں اور رتبی پر بھی، یعنی آپؐ کا زمانہ تمام نبیوں کے بعد ہے، آپؐ کے بعد کسی قسم کا کوئی نیا نبی آنے والا نہیں، اور آپؐ کا مرتبہ نبیوں میں سب سے بڑھ کر ہے، آپؐ وصف نبوت کے ساتھ بالذات متصف ہیں اور دیگر انبیاء بالعرض! بلکہ حضرت نانوتوی قدس سرہ نے تو ختم نبوت مکانی بھی اس آیت سے ثابت کی ہے، جس کی تفصیل تحذیر الناس میں ہے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ، خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ، اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ (آل عمران ۵۹و۶۰)

بزرگو اور بھائیو! آج جو پارہ پڑھا گیا ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت طویل مضامین آئے ہیں، ان تمام مضامین کو اس مختصر وقت میں بیان کرنا مشکل ہے، اس لئے ان میں سے ایک حصہ آپ حضرات کے گوش گذار کرتا ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ایک مقصد نبی ﷺ کی خبر دینا ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ سے بالکل متصل زمانہ میں آئے ہیں، بیچ میں کسی نبی کا فاصلہ نہیں، اور ان سے پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام تشریف لائے ہیں۔ یہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے، اور دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام چھ سات مہینے بڑے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام چھوٹے، اور حضرت یحییٰ کی بعثت کا ایک مقصد حضرت عیسیٰ کی آمد کی اطلاع دینا تھا۔ وہ اعلان کرتے تھے کہ کلمۃ اللہ آرہے ہیں، روح اللہ آرہے ہیں، ان پر ایمان لانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ایک اہم مقصد فخر دو عالم ﷺ کا زمانہ قریب آنے کی اطلاع دینا تھا، لوگوں کو بتانا تھا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لانے والے ہیں، ان پر ایمان لانے کے لئے تیار ہو جاؤ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِيْ اسْمُهٗ أَحْمَدُ﴾ (الصّف ۶): میں ایک ایسے رسول کی خوشخبری سنا رہا ہوں جو میرے

مکتبہ حجاز دیوبند

بعد آئیں گے۔ میرے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد آئیں گے، جن کا نام پاک احمد ہوگا۔

احمد وصفی نام ہے اور محمد ذاتی نام

أَحْمَدُ: أکبر کے وزن پر ہے اور اسم تفضیل ہے اور اس کے معنی ہیں: سب سے زیادہ تعریف کرنے والا، اور یہ آنحضور ﷺ کا وصفی نام ہے، جو نام کسی خوبی کو ظاہر کرتا ہے، اس کو وصفی نام کہتے ہیں۔ اور ذاتی نام کو علم کہتے ہیں، جیسے ایک شخص کا نام عبدالرحیم ہے تو یہ علم (ذاتی نام) ہے اور وہ مفتی، حافظ، قاری بھی ہے تو یہ مفتی حافظ اور قاری وصفی نام ہیں، آنحضور ﷺ کا علم (خاص نام) محمدؐ ہے اور وصفی نام بہت ہیں، بعض حضرات نے ننانوے نام اکٹھا کئے ہیں، اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، ان وصفی ناموں میں ایک نام احمد بھی ہے، اس کے معنی ہیں: اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔

انجیل میں نبی ﷺ کا وصفی نام احمد ہے

انجیل میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی ہے اور جو سریانی زبان میں تھی، اس میں آنحضور ﷺ کا وصفی نام: پیروکلی طس (Peroclitus) آیا ہے جس کی عربی فارقلیط ہے، یہ سریانی زبان کا لفظ ہے، اس کا مفہوم وہی ہے جو احمد کا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔

ویدوں اور پرانوں میں آنحضور ﷺ کی بشارت

نبی ﷺ کی بشارت ویدوں میں بھی ہے، اور پرانوں میں بھی۔ ویدوں میں آپؐ کا نام: نراشنش آیا ہے، اور پرانوں میں کلکی اوتار۔ اور یہ کتنی پرانی کتابیں ہیں اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے، بعض کہتے ہیں: حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں کو جو کتابیں دی گئی تھیں وہ یہ ہیں، اللہ جانے حقیقت کیا ہے؟ ان کی تاریخ مجہول ہے۔ اور نراشنش جس کی وید میں بشارت دی گئی ہے، اس کے معنی ہیں: اللہ کی بے حد پرسنا (تعریف) کرنے والا۔ یعنی لفظ احمد کے جو معنی ہیں وہی اس لفظ کے بھی ہیں۔ اور پرانوں میں کلکی اوتار ہے، جس کے معنی ہیں: خاتم النّبیین ﷺ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ختم نبوت کا نمونہ تھی

غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی پاک ﷺ کی بشارت لے کر آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش میں دنیا والوں کو ایک معجزہ دکھایا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد سنتِ الٰہی یہ چلی آرہی تھی کہ مرد وزن کے ملنے سے انسان پیدا ہوتا تھا، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا، اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ کیوں دکھایا؟ کسی اور نبی کو بغیر باپ کے کیوں پیدا نہیں کیا؟ اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی پاک ﷺ سے بالکل متصل زمانے میں مبعوث ہوئے ہیں، ان کے اور نبی ﷺ کے درمیان کسی نبی کا فاصلہ نہیں، اور ان کی بعثت کا اہم ترین مقصد آپؐ کی آمد کی بشارت دینا تھا، اور آج تک نبوت کے جو مختلف سلسلے جاری تھے، اللہ تعالیٰ ان کو نبی آخر الزماں ﷺ کی ذات میں سمیٹنے والے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس نبی کو جو آنحضور ﷺ سے متصل تھے بغیر باپ کے پیدا کر کے دنیا والوں کو دکھایا کہ اللہ کی قدرت میں سب کچھ ہے۔ وہ نبوت کے تمام سلسلوں کو ایک ہستی سے سمیٹنے پر قادر ہیں، جو ہستی بغیر باپ کے صرف ماں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کر سکتی ہے، وہ ایک ذات میں نبوت کو کیوں نہیں سمیٹ سکتی؟ نبوت کے تمام سلسلوں کو ایک ذات میں سمیٹ دینا اتنا مستبعد نہیں جتنا بغیر باپ کے انسان کو پیدا کرنا مستبعد ہے۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عجیب پیدائش آنحضور ﷺ کے خاتم النّبیین ہونے کی دلیل ہے، بغیر باپ کے ان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ خاتم النّبیین ﷺ کی بشارت لے کر آئے تھے، اور خاتم النّبیین ﷺ کے زمانہ سے متصل زمانہ میں آئے تھے۔

عیسائیوں کو لفظ روح اللہ اور کلمۃ اللہ سے دھوکہ ہوا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں چند باتیں جمع ہو گئی تھیں، ان میں سے چار باتیں ایسی تھیں جو دوسرے انبیائے کرام میں نہیں تھیں، اس لئے ان کے ماننے والوں کو ان کے بارے میں غلط فہمی ہوئی: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھا، دوسری: انجیل میں ان کو ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہا گیا ہے، تیسری: ان کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ہے، چوتھی: ان کا

آسمان پر اٹھایا جانا ہے۔

پہلی بات: آج ہی یہ آیت پڑھی گئی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ (اللہ کا بول) ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی طرف ڈالا، اور وہ روح اللہ ہیں۔ انجیل میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہ القاب آئے ہیں اور جب وہ ''اللہ کی روح'' ہیں تو وہ یا تو خود خدا ہیں یا خدائی کا حصہ ہیں، یعنی اس میں شریک ہیں، چنانچہ اکثر عیسائیوں کا یہی عقیدہ ہے کہ وہ تہائی خدا ہیں۔

ہندوؤں کے عقیدۂ اوتار کی حقیقت

ہندوؤں کے یہاں اوتار کا عقیدہ ہے وہ کہتے ہیں: دنیا میں جب فساد بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کسی عورت کے پیٹ سے انسانی بھیس میں پیدا ہوتے ہیں، وہ انسان درحقیقت اللہ ہوتا ہے، وہ لوگ اس کو اوتار کہتے ہیں، وہ انسان بڑا ہو کر لوگوں کی اصلاح کرتا ہے، پھر وہ انسان مرجاتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی جگہ چلے جاتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ خدا ہیں، نہ خدا کا کوئی حصہ!

اسی طرح عیسائی بھی حضرت عیسیٰ کو خدا کہتے ہیں یا خدائی میں حصہ دار مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس نظریہ کو رد کیا ہے: ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ، قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ، وَأُمَّهٗ، وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا، وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَابَيْنَهُمَا. وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (المائدہ: ۱۷) بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم ہی ہیں۔ آپ کہئے: اگر ایسا ہے تو بتلاؤ: اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریم کو اور ان کی والدہ کو اور جتنے زمین میں ہیں ان سب کو ہلاک کرنا چاہیں تو کون ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ان کو بچا سکے؟ اور اللہ تعالیٰ ہی کی آسمانوں پر، زمین پر اور جتنی چیزیں ان میں ہیں ان پر حکومت ہے، وہ جو چاہیں پیدا کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

اس آیت میں صاف فرمادیا ہے کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مانتے ہیں وہ کافر ہیں۔ اور یہ بعض عیسائیوں کا عقیدہ تھا اور ہوسکتا ہے وہ آج بھی موجود ہوں اس لئے کہ

عیسائیوں میں اتنے فرقے ہیں کہ ہم کہاں تک ان کے احوال جانیں گے؟ لیکن عیسائیوں کی اکثریت اس کی قائل نہیں۔ اکثر عیسائی تین کے مجموعہ کو خدا کہتے ہیں، وہ ایک خدا کے تین حصے کرتے ہیں، اس نظریہ کی بھی قرآن نے تردید کی ہے، فرمایا: ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ (المائدہ:۷۳): وہ لوگ بھی کافر ہیں جنھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ تین میں سے ایک ہیں، جنھوں نے اللہ کو ⅓ مانا انھوں نے بھی اللہ کا انکار کردیا۔

دونوں عقیدے کفر ہیں، جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم ہیں، انھوں نے تو اللہ کو مانا ہی نہیں۔ اور جنھوں نے کہا کہ اللہ ⅓ ہیں، انھوں نے بھی اللہ کو نہیں مانا، پھر فرمایا: ﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾: جبکہ ایک معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ کامل ومکمل ہیں، ان کا کوئی حصہ دار نہیں، اور عیسائیوں میں جو یہ عقیدے پیدا ہوئے ہیں وہ لفظ کلمۃ اللہ اور لفظ روح اللہ سے پیدا ہوئے ہیں، یہیں سے ان کو دھوکہ ہوا ہے۔

روح اللہ کی حقیقت

آپ لوگ چونکہ عربی نہیں جانتے اس لئے ذرا تفصیل سے سمجھاؤں گا، روح اللہ میں روح کی اللہ کی طرف اضافت ہے، اور عربی میں اضافت مختلف مقاصد سے کی جاتی ہے، ان مقاصد میں سے ایک مقصد ''تشریف'' ہے، جیسے بیت اللہ میں اضافت تشریف کے لئے ہے، اللہ کے گھر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں رہتے ہیں، وہ مکانیت سے پاک ہیں، بلکہ اس گھر کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے یہ اضافت کی گئی ہے، جیسے ہم مسجدوں کو ''اللہ کا گھر'' کہتے ہیں، اس سے ہم ان جگہوں کا بابرکت اور معزز ہونا ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو جو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کا معزز ومحترم ہونا بیان کرنا مقصود ہے، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ نے اپنی روح کا کل یا بعض عیسیٰ کے جسم میں ڈالا۔

اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے بنایا

جیسے حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تو تمام مخلوقات کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، پس

سب سجدہ ریز ہو گئے، یہاں تک کہ ملائکہ بھی سجدہ ریز ہو گئے جو سب سے بڑی اور اشرف مخلوق تھے، مگر ابلیس لعین نے سجدہ نہیں کیا، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَامَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ، أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ؟﴾ (ص:۷۵): جس مخلوق کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، اس کے سامنے تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ کیا تو غرور میں آگیا یا تو بڑے درجہ والوں میں سے ہے؟ ارشادِ پاک: ’’جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا‘‘ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اوزار لے کر حضرت آدمؑ کو گھڑنے بیٹھے تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی خاص قدرت سے بنایا، معزز و محترم مخلوق بنایا، پھر تو نے سجدہ کیوں نہ کیا؟ یہاں بیدی میں اضافت تشریف کے لئے ہے، اسی طرح روح اللہ میں بھی اضافت تشریف کے لئے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا

اسی طرح حدیث میں ہے: إن الله خلق آدم على صورته (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۲۸) اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ بعض لوگ علی صورته کی ضمیر آدمؑ کی طرف لوٹاتے ہیں، کیونکہ اقرب وہی ہے، یعنی آدم کو آدم کی صورت پر پیدا کیا، یہ مہمل بات ہے، ہر مخلوق اسی کی صورت پر پیدا کی گئی ہے، بھینس بھینس کی صورت پر پیدا کی گئی ہے، بیل بیل کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے، پس اگر آدمؑ آدمؑ کی صورت پر پیدا کئے گئے تو یہ کونسی نئی بات ہوئی؟ بلکہ ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے، یعنی اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اور اضافت تشریف کے لئے ہے، یعنی نہایت شاندار صورت پر پیدا کیا، اپنی صورت پر پیدا کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جیسی ہماری صورت ہے ویسی ہی اللہ کی صورت ہے، بلکہ انسان کی عظمت، شرافت اور بزرگی ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور یہ عربی کا مشہور قاعدہ ہے کہ کبھی ایک چیز کی دوسری چیز کی طرف نسبت: عظمت، شرافت اور بزرگی ظاہر کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کی جو اللہ کی طرف اضافت ہے وہ عظمت و بزرگی ظاہر کرنے کے لئے ہے اور بس!

کلمۃ اللہ کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات انوکھے انداز پر پیدا کی ہے ﴿بَدِيْعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ وہ موجد ہیں آسمانوں اور زمین کے اور جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتے ہیں تو بس اس کو کہتے ہیں کہ ہوجا، پس وہ ہوجاتا ہے۔

تفسیر:

اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات انوکھے انداز پر پیدا فرمائی ہے۔ جب کبھی اللہ تعالیٰ کسی چیز کا فیصلہ فرماتے ہیں تو بس یہ کہتے ہیں کہ ہوجا، پس وہ ہوجاتی ہے، کسی مادّے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا حکم ہی سب کچھ ہوتا ہے، پس ساری کائنات اللہ کے کلمہ کن سے پیدا ہوئی ہے۔ سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام بھی اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں عیسیٰ علیہ السلام کی کچھ خصوصیت نہیں ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ، خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (آل عمران: ۵۹) عیسیٰ کی حالتِ عجیبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدمؑ کی حالتِ عجیبہ کی طرح ہے۔ ان کو مٹی سے بنایا پھر ان سے کہا: ہوجا پس وہ ہوگئے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود کا حکم دیا تو وہ موجود ہوگئے، پس ساری ہی کائنات کلمۃ اللہ سے پیدا ہوئی ہے اور ﴿كَلِمَتُهٗ أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ بغیر کسی مادّے کے محض اللہ کے حکم سے مریم رضی اللہ عنہا کے بطن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود ہوگیا، آدم علیہ السلام بھی اسی طرح کلمۂ کن سے پیدا ہوئے ہیں، پس کلمۃ اللہ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کچھ تخصیص نہیں، مگر ان دو لفظوں سے عیسائیوں کو دھوکہ ہوا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا مطلب

اور دوسری بات جس کی وجہ سے عیسائیوں کو غلط فہمی ہوئی، وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل میں ابن اللہ کہا گیا ہے، اور یہ لفظ اس وقت بھی بائبل میں موجود ہے، اس لفظ سے ان کو دھوکہ ہوا، انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دے دیا، حالانکہ یہود ونصاری خود کو بھی اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، قرآن میں ان کا قول ہے: ﴿نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهٗ﴾

(المائدہ آیت ۱۸): یہود ونصاری کہتے ہیں: ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، جب یہود ونصاری خود کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، اور بیٹا کہنے کی وجہ سے وہ اللہ کے حقیقی بیٹے نہیں بن گئے تو عیسیٰ حقیقی بیٹے کیسے ہو گئے؟ درحقیقت یہ پیار کا لفظ ہے، جیسے چھوٹے بچے سے کہتے ہیں: بیٹا! ذرا پانی لانا، پس اس کو بیٹا کہنے سے وہ حقیقی بیٹا نہیں ہو جاتا، اور یہ استعارہ ہر زبان میں رائج ہے۔ مگر عیسائیوں کو اس لفظ سے بھی دھوکہ ہوا۔

عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی دھوکہ کا سبب بنا

تیسری چیز جس سے عیسائیوں کو دھوکہ ہوا، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ہے، انھوں نے سوچا: بغیر باپ کے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ لامحالہ حضرت عیسیٰ کے باپ اللہ تعالیٰ ہیں، اور وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔

ایک لطیفہ: جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو انھوں نے سارے ملک کو عیسائی بنانے کا پلان بنایا، اس کے لئے انھوں نے انگلینڈ سے پادریوں کی ٹیم بلائی، اور ان کو سارے ہندوستان میں پھیلا دیا، پادری پولیس کے ساتھ شہر کی کسی بڑی مسجد میں کسی نماز کے وقت پہنچ جاتے تھے، جب نماز ختم ہوتی تو پولیس لوگوں کو زبردستی بٹھاتی کہ پادری صاحب کا بیان سن کر جاؤ، دہلی کی جامع مسجد کا واقعہ ہے: ایک پادری پولیس کے ساتھ آیا، نماز کے بعد پولیس نے سب لوگوں کو روک لیا، اور پادری نے ڈرامائی انداز میں تقریر شروع کی، مجمع میں سے دس پندرہ آدمیوں کو کھڑا کیا، ہر ایک سے اس کا اور اس کے باپ کا نام پوچھا، سب نے اپنا اور اپنے باپ کا نام بتایا، تب پادری نے کہا: ارے مسلمانو! تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں! تم میں سے کوئی بھی بغیر باپ کا نہیں، اور تم حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا رسول اور پیغمبر مانتے ہو، پھر کہتے ہو: ان کا کوئی باپ نہیں تھا! کیسی بھونڈی بات بکتے ہو! جاؤ اگلی نماز میں اپنے مولویوں سے پوچھ کر اس کا جواب لانا۔

مجمع میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا، اس نے کہا: پادری صاحب! آپ بتائیں: عیسیٰؑ کا باپ کون ہے؟ پادری نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ ہیں، اس شخص نے پوچھا: اللہ کے کتنے بیٹے ہیں؟ پادری نے جواب دیا: صرف عیسیٰؑ! اس شخص نے

پوچھا: اور کوئی بیٹا نہیں؟ پادری نے کہا: نہیں، پس اس شخص نے کہا: تیرے اللہ سے تو میں اچھا، میرے دس لڑکے ہیں! جب اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں تو پھر ان کا ایک ہی بیٹا کیوں؟ ان کے تو ان گنت بیٹے ہونے چاہئیں، جا اگلی نماز میں اس کا جواب لانا۔ پس پادری کی سٹی گم ہوگئی، اور وہ اگلی نماز میں آیا ہی نہیں۔

اگر بغیر کے باپ کے پیدا ہونا خدائی کی دلیل ہے تو آدمؑ اسکے زیادہ مستحق ہیں:

خیر بات یہ چل رہی تھی کہ عیسائیوں کو لفظ ابن اللہ سے بھی دھوکہ ہوا ہے، انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا سمجھ لیا، اور بیٹا باپ کی جائداد میں حصہ دار ہوتا ہے اور اللہ کی جائداد ان کی ''خدائی'' ہے، اس طرح حضرت عیسیٰؑ خدائی میں شریک ہوگئے۔

قرآنِ کریم نے نہایت سادہ انداز میں اس بات کو سمجھایا ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہونے سے خدا ہونا یا خدائی میں حصہ دار ہونا لازم نہیں آتا، حضرت آدم علیہ السلام ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے ہیں، مگر تم ان کو خدا نہیں مانتے، پس جب آدمؑ ماں باپ کے بغیر پیدا ہونے کے باوجود خدا نہیں ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کہاں سے ہوگئے؟ ارشادِ پاک ہے: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ﴾ حضرت عیسیٰؑ کا معاملہ اللہ کے یہاں آدمؑ جیسا ہے، ان کا معاملہ کیا ہے؟ ان کا پتلا مٹی سے تیار کیا اور حکم دیا ہو جا تو وہ ہوگئے، اور وہ مخلوق ہیں، خدا نہیں ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ (آل عمران ۶۰) اور یہ تیرے پروردگار کی طرف سے بالکل سچی بات ہے، اس میں ذرا شک نہیں، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، تجھے اس میں ذرا شک نہیں ہونا چاہئے، وہ بھی اللہ کے بندے اور رسول ہیں، اور بس!

ہر نوع کا پہلا جوڑا براہِ راست مٹی سے پیدا کیا گیا ہے

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ ہر نوع کا پہلا جوڑا بغیر کسی واسطہ کے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، کوئی بھی نوع ہو: گائے ہو، بھینس ہو، بکری ہو یا اونٹ ہو، ہر نوع کے پہلے دو فرد (نر و مادہ) براہ راست مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔ آدم وحوا علیہما السلام بھی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمین پر تین قسم کی مخلوقات ہیں: ایک: کیڑے مکوڑے: ان کی پیدائش براہِ راست مٹی سے ہوتی ہے۔ ان میں توالد وتناسل نہیں ہوتا۔ تمام حیوانات مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، اسی طرح کیڑے مکوڑے آج بھی مٹی سے پیدا ہوتے ہیں، پھر جب وہ مرجاتے ہیں تو دوسرے پیدا ہوجاتے ہیں۔ آج کچھ نہیں ہوتا، کل بارش ہوگئی اور پوری زمین کیڑوں سے بھرگئی، پھر ایک دن آتا ہے کہ سب مرجاتے ہیں۔ غرض مخلوق کی ایک قسم تو یہ ہے کہ جو سیدھے مٹی سے پیدا ہوتے ہیں، زمین میں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ تخلیق کی صلاحیت رکھی ہے، ہمارا جسم بھی چونکہ مٹی سے بنا ہے، اس لئے اس میں بھی یہ صلاحیت ہے۔ آدمی کے جسم میں زخم لگتا ہے تو وہاں کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں، پیٹ میں کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔

دوسری قسم کی مخلوق وہ ہے جو مٹی سے بھی پیدا ہوتی ہیں اور ان میں توالد وتناسل بھی ہوتا ہے، جیسے مچھلی براہ راست کیچ سے بھی پیدا ہوتی ہے اور اس میں توالد وتناسل بھی ہوتا ہے۔ ان میں نر ومادہ ہوتے ہیں، ان کے بچے بھی ہوتے ہیں اور براہِ راست مٹی سے بھی وہ پیدا ہوتی ہیں۔

تیسری قسم کی مخلوق وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے شروع میں مٹی سے بنایا، پھر ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہوا، اب دوبارہ وہ سیدھے مٹی سے پیدا نہیں ہوتے، پہلی گائے اور پہلا بیل براہ راست مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، پھر ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہوا، اسی طرح انسان کے پہلے دو فرد مٹی سے پیدا کئے گئے، پھر ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہوگیا، اب انسان سیدھے مٹی سے پیدا نہیں ہوتے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں: وہ مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، اور دادی حواء رضی اللہ عنہا کے بارے میں روح المعانی (۱۸۱:۴) کے حاشیہ میں امام باقر رحمہ اللہ (جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد ہیں) کی طرف منسوب کرکے یہ قول لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا بنانے کے بعد جو مٹی بچ گئی تھی، اس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت حواءؑ کو بنایا۔ **قیل: إنها خُلقت من فضل طينته، ونُسب للباقر اهـ منه** اور یہ جو مشہور ہے کہ حضرت حواء حضرت آدمؑ کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں: یہ اسرائیلی روایت ہے۔ اور آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو، کیونکہ عورتیں پسلی

سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلیوں میں سب سے ٹیڑھی پسلی اوپر کی ہے، یعنی اس نہایت کج پسلی سے عورتیں پیدا کی گئی ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۳۸) اس حدیث میں عورت کی تخلیق کا بیان نہیں ہے، بلکہ نسوانی فطرت میں نہایت کجی کی تمثیل ہے۔ اور یہ تصور کہ حضرت حواء حضرت آدمؑ کی بائیں جانب کی سب سے اوپر کی پسلی سے پیدا کی گئیں ہیں، یہ تصور بائبل (کتاب پیدائش باب ۲ آیات ۲۲-۲۴) کا ہے پھر وہاں سے اسلامی روایات میں آیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ بغیر ماں باپ کے کیوں نہیں پیدا کئے گئے

یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف بغیر باپ کے کیوں پیدا کئے گئے؟ ان کو بھی بغیر ماں باپ کے مٹی سے کیوں پیدا نہیں کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ انسان کے صرف پہلے دو فرد مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، پھر ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہوا ہے، اس کے بعد کوئی انسان براہِ راست مٹی سے پیدا نہیں ہوا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق اس طرح کیسے ہوتی؟

رہی چوتھی بات: یعنی ان کا آسمان پر اٹھایا جانا، جس سے عیسائیوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، اس کا جواب میں نے ایک دوسری تقریر میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اس لئے اس کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ اب آخری بات عرض کرتا ہوں۔

الوہیت اور احتیاج میں منافات ہے

کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی خدائی میں شریک گردانتے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کی نیک بندی تھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ، كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ (المائدہ ۷۵) ان کی والدہ صدیقہ تھیں، دونوں کھانا کھاتے تھے، اور جو کھانا کھاتا ہے وہ کھانے کا محتاج ہوتا ہے، پھر جو کھانا کھاتا ہے اس کو بیت الخلاء کی بھی حاجت ہوتی ہے، اور اللہ کا کلام چونکہ نہایت فصیح وبلیغ ہے اس لئے یہ بات صراحۃً نہیں کہی گئی، مگر مراد ہے۔ اور احتیاج خدائی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ پس ثابت ہوگیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف اللہ کے بندے اور اسکے رسول ہیں۔ اور انکی والدہ صرف اللہ کی نیک بندی ہیں۔ والحمد للہ رب العالمین۔

۱۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام میں پورے آجاؤ، شیطان کی پیروی مت کرو

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدہ آیت ۲) ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ، اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾ (البقرۃ آیت ۲۰۸)

بزرگو اور بھائیو! آج دنیا میں جو بھی مذاہب پائے جاتے ہیں، ان میں سے صرف ایک دین اپنی اُس حالت پر ہے، جو اللہ کے یہاں سے آیا ہے، باقی مذاہب یا تو اللہ کے یہاں سے آئے ہوئے دین کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، یا وہ لوگوں کے گھڑے ہوئے ادیان ہیں۔ جیسے اکبر بادشاہ نے ایک دین: دینِ الٰہی کے نام سے چلایا تھا۔ اکبر بادشاہ کے درباریوں نے اس کے دماغ میں ایک خیال ڈالا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی مدت ایک ہزار سال ہے، اور انھوں نے: ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ (حم السجدة: ۵) سے استدلال کیا تھا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ﴾: اللہ تعالیٰ انتظام کرتے ہیں معاملہ کا آسمان سے زمین تک۔ پھر اللہ کا وہ انتظام چڑھ جاتا ہے: ﴿ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ﴾ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے دنوں کی گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال ہے: ﴿فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ﴾

اس آیت میں یہ مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آسمان و زمین کے درمیان جو ”تکوینی انتظام“ ہے اس میں ہزار سال میں تبدیلی آتی ہے، ایک انتظام جو چل رہا ہے: چلتا رہتا ہے، پھر ہزار

سال کے بعد اس کی جگہ نیا انتظام آتا ہے، پھر اگلے ہزارے میں یہ انتظام بھی واپس چلا جاتا ہے اور تیسرا انتظام آتا ہے۔

اس کی مثال: حضور ﷺ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذَا الدِّيْنِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِأَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا أَمْرَ دِيْنِهَا: اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر سو سال کے سرے پر ایک ایسی شخصیت بھیجتے ہیں جو دین کی تجدید کرتی ہے۔ دین کی تجدید کو ایک مثال سے سمجھیں:

دین کی تجدید

ہمارا ایک محل ہے، سو سال ہوتے ہوتے مکڑیاں اس میں جالے تن دیتی ہیں، دیواروں کا رنگ روغن پھیکا پڑ جاتا ہے، پلاسٹر اکھڑنے لگتا ہے، فرش میں جگہ جگہ کھڈے پڑ جاتے ہیں۔ کتنا بھی شاندار محل ہو، سو سال ہوتے ہوتے اس کے ساتھ یہ صورت پیش آتی ہے۔ اسی طرح دین کے ساتھ بھی یہ صورت پیش آتی ہے، دین کے محل میں بھی مکڑیاں (شیطان اور اس کے بھائی بند) جالے (بدعات) تنتی ہیں، اور لوگ ان جالوں (بدعات) کو فانوس سمجھتے ہیں، دین کے محل کی دیوار کا پلاسٹر بھی اکھڑتا ہے، یعنی دین کی قدریں کمزور پڑتی ہیں، دین کے محل کے صحن میں جگہ جگہ کھڈے پڑتے ہیں، یعنی دین کی بعض اہم باتیں امت میں سے غائب ہو جاتی ہیں، جیسے بیوہ کے بارے میں اسلام کا حکم ہے کہ اس کا نکاح کر دیا جائے، مگر ہمارے بہت سے معاشروں میں شوہر کے مر جانے کے بعد عورت ایک یا دو بچوں کو لے کر زندگی بھر بیٹھی رہتی ہے اور نکاحِ بیوگان کو بڑا عیب سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ ہندوانہ تصور ہے جو ہمارے معاشرہ میں در آیا ہے، یہ محل کے فرش میں کھڈے پڑنا ہے۔ مجدد جب آتا ہے تو تمام جالوں پر جھاڑو پھیرتا ہے، سب کو ایک طرف کر دیتا ہے اور محل کو اصلی شکل میں لوٹاتا ہے، اور جو دیوار کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے، اس پر پینٹ کرتا ہے، کھڈوں کو بھرتا ہے اور اسلام کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرتا ہے۔

غرض دین کا محل بھی سو سال میں پھیکا پڑتا ہے اور صحن میں کھڈے پڑتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ ہر سو سال میں مجدد بھیجتے ہیں، جو دین کی تجدید کرتا ہے۔

اسی طرح کائناتی نظام بھی ہزار سال میں بدلتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ مضمون

ہے اور اکبر کے دربار کے گمراہ علماء نے اکبر کے دماغ میں یہ مطلب بٹھایا تھا کہ حضورؐ جو دین لائے ہیں وہ دین ایک ہزار سال تک کے لئے ہے، ایک ہزار سال پورے ہونے پر وہ دین اللہ کی طرف چڑھ جائے گا، پس اگلے ہزارے کے لئے نیا دین آپ تیار کریں، چنانچہ اس نے کچھ عیسائیوں سے لیا، کچھ یہودیوں سے لیا، کچھ ہندوؤں سے لیا، کچھ پارسیوں سے لیا اور بڑی مقدار اسلام سے لی اور مختلف مذاہب کو ملا کر چوں چوں کا مربہ تیار کیا، اور اس کا نام: دینِ الٰہی اور دین اکبری رکھا، مگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہزارے کے سرے پر مجدد الف ثانی کو بھیجا، انھوں نے اکبر کے دین کے ازالے کے لئے محنت کی، اکبر نے ان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ پھر اکبر کا زمانہ ختم ہو جانے کے بعد حضرت نے اس کے لڑکے جہانگیر پر محنت کی، اس کے زمانے میں تھوڑی بہت اصلاح ہوئی، پھر شاہجہاں کا زمانہ آیا تو وہ پکا اور صحیح مسلمان ہو گیا اور شاہجہاں کے بیٹے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ تو اولیاء میں سے تھے، دین کے بڑے مددگار تھے۔

الغرض: دینِ اکبری کے بارے میں ہم بالیقین جانتے ہیں کہ یہ انسانوں کا گھڑا ہوا دین تھا۔ ایسے ہی سکھوں کا دھرم ہے، اس کے بارے میں بھی ہم بالیقین جانتے ہیں کہ آج سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے گرونانک ہوئے ہیں، وہ شخصیت کیا تھی؟ اللہ جانے کیا تھی! وہ ہندوؤں کو آہستہ آہستہ اسلام سے قریب لا رہے تھے کہ درمیان میں ان کا انتقال ہو گیا، اور ان کے ماننے والے وہیں لٹک گئے اور سکھ دھرم وجود میں آ گیا۔

انبیاء کے طریقِ دعوت میں اور مصلحین کے طریقِ دعوت میں فرق:

نبی پہلے ہی دن ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ حق یہ ہے اور باطل یہ ہے، چاہے کوئی مانے یا نہ مانے، اور بعض مصلحین آدھے پونے کا سودا کرتے ہیں، بدعات میں موافقت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم آہستہ آہستہ لوگوں کو دین کی طرف لا رہے ہیں، پھر لوگ کبھی آ بھی جاتے ہیں اور اکثر نہیں آتے، اکثر بیچ میں لٹک جاتے ہیں۔

بہر حال بعض دھرم وہ ہیں جن کے بارے میں ہم بالیقین جانتے ہیں کہ وہ نازل شدہ نہیں ہیں، لوگوں کے گھڑے ہوئے ہیں اور بہت سے ادیان وہ ہیں جن کے بارے میں ہم

بالیقین جانتے ہیں کہ وہ نازل شدہ ہیں، اگرچہ آج ان کی شکلیں بگڑی ہوئی ہیں، جیسے یہودیت اور عیسائیت۔ اور بہت سے مذاہب وہ ہیں جن کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ جیسے ہندو دھرم، پارسیوں کا دھرم، بدھسٹوں کا دھرم۔ یہ مذاہب ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی دوٹوک بات نہیں کہی جاسکتی کہ یہ سماوی ادیان ہیں یا مصنوعی؟ بہرحال دنیا میں بے شمار مذاہب ہیں، ان میں سے صرف ایک مذہب ایسا ہے جو اپنی اصلی شکل پر ہے، جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے۔

اسلامی فرقے اور فرقۂ ناجیہ:

مسلمان کہلانے والوں میں بھی مذاہب ہیں، فرقے ہیں، گروہ بندیاں ہیں۔ اور تمام فرقوں کے جو خیالات ہیں وہ سب ''اسلام'' نہیں ہیں۔ حدیث میں ہے: یہود کے اکہتر (۷۱) فرقے ہوئے، جو سب گمراہ تھے، عیسائیوں کے بہتر (۷۲) فرقے ہوئے جو سب گمراہ تھے، اور میری امت کے تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے ان میں سے ایک فرقہ جنت میں جائے گا باقی جہنم میں جائیں گے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کے بہتر گمراہ فرقے بھی غلط ہیں، صحیح دین پر نہیں ہیں، صرف ایک جماعت حضورؐ کے لائے ہوئے صحیح دین پر ہے، اسی کے لئے جنت ہے اور یہی فرقۂ ناجیہ ہے۔

فرقۂ ناجیہ کی پہچان

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرقۂ ناجیہ کو ہم کیسے پہچانیں؟

جواب: ہمارے سامنے دھات کے بہت سے ٹکڑے ہیں، سونا کونسا ہے، چاندی کونسی ہے، تانبا کونسا ہے، پیتل کونسا ہے، اور سونے میں بھی کھرا کونسا ہے کھوٹا کونسا ہے، اس بارے میں کسوٹی سے فیصلہ کیا جاتا ہے، کسوٹی پر کسی بھی دھات کو ڈالا جائے تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ وہ سونا ہے یا چاندی یا کوئی اور دھات۔ اور سونا ہے تو کتنے کیرٹ کا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسوٹی دی ہے اور وہ کسوٹی ہے: قرآن وسنت۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تَرَکْتُ فِیْکُمْ أَمْرَیْنِ: میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں: لَنْ تَضِلُّوْا

مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: ہرگز گمراہ نہیں ہوؤ گے جب تک تم ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو گے: **كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ**: اللہ کی کتاب اور میرا طریقہ۔ پس کتاب وسنت ایک کسوٹی ہے، لہٰذا مسلمانوں کا کوئی فرقہ ہو اس کی باتیں قرآن وسنت سے ملائی جائیں، اگر قرآن وسنت کے مطابق ہیں تو وہ اللہ کے یہاں سے نازل شدہ دین ہے اور اگر قرآن وسنت اس کی موافقت نہیں کرتے تو وہ اللہ کا نازل کردہ دین نہیں ہے، وہ فرقے غلط فہمی کا شکار ہیں، جیسے ہمارے کچھ بھائیوں کو غلط فہمی ہے کہ کھلے سر نماز پڑھنا سنت ہے، حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں، وہ لوگ ایسی کوئی حدیث پیش کریں جس میں یہ ہو کہ کپڑا موجود تھا اور آپؐ نے کوئی فرض نماز کھلے سر پڑھی، ایسی حدیث کے بغیر سنت کہاں سے ثابت ہوگی؟ مگر وہ لوگ قیامت تک ایسی کوئی حدیث پیش نہیں کر سکتے۔

دین ہمیشہ ایک رہا ہے اور شریعتیں مختلف:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے حضور ﷺ تک جب بھی کوئی دین نازل کیا ہے تو دین اسلام ہی نازل کیا ہے، اس کے علاوہ کبھی کوئی اور دین نہیں آیا۔ البتہ شریعتیں نبیوں کی الگ الگ رہی ہیں، آدم علیہ السلام کے زمانہ کی شریعت اور تھی اور نوح علیہ السلام کے زمانہ کی شریعت اور، کیونکہ شریعت میں زمانہ کے احوال کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا، کیونکہ اس وقت بہن کے علاوہ عورتیں نہیں تھیں۔ پھر جب نسل انسانی آگے بڑھی اور عورتیں بہت ہو گئیں تو بہن سے اور قریبی رشتہ داروں سے نکاح حرام کر دیا گیا، اور دین: عقائد کا نام ہے، اور عقائد میں تبدیلی نہیں آتی، اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہیں، انبیاء اور آسمانی کتابیں برحق ہیں، فرشتے واقعی مخلوق ہیں: اس میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ اس لئے دین ہمیشہ ایک رہا ہے۔

غیر محرم قریبی رشتہ دار سے نکاح جائز ہے:

آپ کے ملک میں ایک نظریہ پایا جاتا ہے کہ اگر غیر محرم قریبی رشتے میں نکاح کیا جائے تو اولاد ڈیزیبل (معذور) پیدا ہوگی۔ یہ جینٹک (GENETIC) کا مسئلہ ہے، جینٹک

کے معنی ہیں: علم توالد وتناسل، یعنی اوپر سے نیچے اولاد میں کیا اثرات آتے ہیں۔ ڈاکٹری کا مذکورہ نظریہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر اس کی حد کہاں تک ہے؟ اس میں ڈاکٹروں کا خیال کچھ اور ہے اور اسلام کا نظریہ کچھ اور۔

رشتے کل چار ہیں اور ان رشتوں سے ساری دنیا ایک فیملی ہے:

۱- وہ لوگ جو آدمی سے پیدا ہوئے ہیں یعنی فروع حرام ہیں، جیسے بیٹا، بیٹی اور ان کی اولاد نیچے تک۔ اس رشتہ سے ساری انسانیت آدمؑ کی اولاد ہے، اور اس رشتہ سے نکاح حرام ہے، کیونکہ یہ قریبی رشتے ہیں، اور ان سے نکاح کی حرمت کی حکمت یہ ہے کہ ان رشتوں میں رغبت نہیں ہوتی، اور نکاح میں اگر رغبت نہ ہو تو نکاح بے فائدہ ہے۔

۲- وہ لوگ جن سے آدمی پیدا ہوا ہے یعنی اصول حرام ہیں، جیسے ماں، باپ پھر ان کے والدین اوپر تک۔ یہ بھی سب رشتے حرام ہیں، یہ بھی قریب ترین رشتے ہیں۔

۳- اصولِ قریب کی تمام فروع، یعنی ماں باپ کی ساری شاخیں حرام ہیں، جو ماں باپ دونوں سے نکلے ہیں وہ حقیقی بھائی بہن ہیں، اور اگر باپ کی دوسری بیوی سے اولاد ہے تو وہ علاتی بھائی بہن ہیں، اور اگر ماں کے دوسرے شوہر سے اولاد ہے تو وہ اخیافی بھائی بہن ہیں۔ یہ تینوں طرح کے بھائی بہن حرام ہیں اور ان کی اولاد بھی آخر تک حرام ہے۔

۴- اصلِ بعید کی صلبی فروع: دادا، دادی اور نانا، نانی کی پہلی شاخ حرام ہے، اور پہلی شاخ کی سب شاخیں حلال ہیں۔ دادا، دادی دونوں سے نکلنے والی پہلی شاخ حقیقی چچا اور حقیقی پھوپھی ہیں، صرف دادا سے نکلنے والے: علاتی چچا اور علاتی پھوپھی ہیں، اور صرف دادی سے نکلنے والے: اخیافی چچا اور اخیافی پھوپھی ہیں۔ اسی طرح نانا اور نانی کا حال ہے۔ دونوں سے نکلنے والے: حقیقی ماموں اور حقیقی خالہ ہیں، اور صرف نانا سے نکلنے والے: علاتی ماموں اور علاتی خالہ ہیں، اور صرف نانی سے نکلنے والے: اخیافی ماموں اور اخیافی خالہ ہیں۔ یہ سب رشتے حرام ہیں، مگر ان کی جو اولاد ہے وہ جائز ہے۔ اسی طرح پردادا پردادی اور پرنانا، پرنانی کا معاملہ ہے، ان کی جو پہلی شاخ ہے وہ حرام ہے، اور پہلی شاخ کی تمام شاخیں جائز ہیں۔ اسی طرح آدمؑ تک جتنے دادے، دادیاں اور نانے، نانیاں ہیں ان کی

پہلی شاخ حرام ہے اور شاخ در شاخ حلال ہیں۔

دلیل نقلی:

۱- حضور ﷺ سے خطاب ہے: ﴿وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ، وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ﴾ (الاحزاب: ۵۰) یعنی آپؐ کی چچا کی لڑکیاں، آپؐ کی پھوپھی کی لڑکیاں، آپؐ کے ماموں کی لڑکیاں اور آپؐ کی خالہ کی لڑکیاں آپ کے لئے حلال ہیں۔

۲- حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور آپؐ کے نکاح میں تھیں۔

دلیل عقلی:

چچا، ماموں، خالہ اور پھوپھی کی اولاد کو قریبی رشتہ دار قرار دے کر نکاح حرام کریں گے تو پھر نکاح کس سے کریں گے؟ ساری دنیا انہی چار رشتوں کا مجموعہ ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں اسلام اور غیر مسلم اطبائے زمانہ کا اختلاف ہے۔ اسلام تمام اولاد کو جائز قرار دیتا ہے۔ اور اطبائے زمانہ پہلی اصل بعید (دادا، دادی اور نانا، نانی) کو اصلِ قریب (ماں باپ) کے حکم میں رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی اولاد سے بھی نکاح کیا جائے گا تو اولاد معذور ہو سکتی ہے۔ اسلام اس کا قائل نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اصلِ قریب (ماں باپ) کا پھوپھی یا خالہ زاد بھائی: بھائی ہے، چچا یا ماموں نہیں ہے، جیسے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی والدہ اور حضرت زکریا علیہ السلام کی اہلیہ دونوں بہنیں تھیں، پس حضرت زکریا علیہ السلام کی اہلیہ: حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی خالہ ہوئیں۔ اور حضرت زکریا کے صاحبزادے حضرت یحییٰ: حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی ہوئے، یعنی حضرت مریم اور حضرت یحییٰ دونوں خالہ زاد بھائی بہن ہیں، پھر حضرت مریم کے صاحبزادے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام میں رشتہ کیا ہے؟ ہندوانہ خیال میں ماموں بھانجے ہیں، جو غلط ہے۔ معراج میں جب حضور ﷺ تیسرے آسمان پر پہنچے ہیں تو وہاں آپؐ کی حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات ہوئی ہے۔ اور

حدیث میں ہے: ابنا الخالة یعنی خالہ کے دو لڑکوں سے ملاقات ہوئی، پس حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام اسلامی تصور سے خالہ زاد بھائی ہوئے، ماموں بھانجے نہیں ہوئے۔ اسلام میں آدمؑ تک ہر دادا، دادی اور نانا، نانی کی جو پہلی نسل ہے وہ ہمارے لئے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ ہے، پھر اس پہلی نسل کی جو اولاد ہے وہ سب پھوپھی زاد، چچا زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد ہیں۔ اب جب آدمؑ تک سبھی چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ ہیں اور حرام ہیں، کیونکہ وہ قریبی رشتہ دار ہیں، تو اگر چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بھی حرام ہونگے تو نکاح کس سے کریں گے؟ جب حرمت چلے گی تو رُکے گی نہیں، آخر تک جائے گی، جیسے اصول میں آخر تک گئی ہے، فروع میں آخر تک گئی ہے، اور جیسے اصلِ قریب کی فروع بھائی بہن کی اولاد میں آخر تک گئی ہے۔ اور اگر حرمت کو ایک دو نسل پر روکیں گے تو روکنے کی دلیل کیا ہوگی؟ اور اصلِ بعید کی پہلی فروع کے ساتھ خاص کریں گے تو خاص کرنے کی دلیل کیا ہوگی؟ پس اسلامی تصور عقل کے مطابق بھی ہے اور اس کی دلیل بھی ہے۔ اور غیر مسلم اطباء جو کہتے ہیں ان کی بات نہ تو عقل کے مطابق ہے اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے۔

بہر حال یہ نظریہ کہ قریب میں شادی نہیں ہونی چاہئے: صحیح ہے۔ مگر یہ کہ قریب کہاں تک ہے؟ اور دور کون ہے؟ اس میں اسلام اور اہل زمانہ مختلف ہیں۔

غرض حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں اگر قریب میں شادی نہیں ہوگی تو دور کی عورتیں کہاں سے لائیں گے؟ اس وقت بہن کے علاوہ کوئی عورت نہیں تھی، پھر جب عورتیں بہت ہوگئیں تو نوح علیہ السلام کی شریعت میں قریبی عورتوں سے نکاح حرام کیا گیا، اور دور کی عورتوں سے نکاح جائز رکھا گیا۔ اس طرح کے احکام میں اختلاف سے شریعتیں مختلف ہوجاتی ہیں، لیکن دین تمام نبیوں کا ایک ہے: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الإِسْلَامِ﴾: اللہ کے یہاں سے جو بھی دین آیا ہے وہ اسلام ہے، اور اسی دین کو لے کر واپس جانا ہے، قبر میں پہنچتے ہی دوسرا سوال یہ ہوگا کہ مَادِيْنُكَ ؟ مَاشَرِيْعَتُكَ؟ نہیں پوچھا جائے گا ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِيْ الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾: جو اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہتا ہے یعنی اختیار کرتا ہے: وہ دین اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، دنیا میں چاہے وہ

پھولے اور خود کو کامیاب سمجھے، مگر آخرت میں وہ ناکام رہنے والوں میں سے ہوگا۔

یہ دین جس کا نزول آدم علیہ السلام کے زمانہ سے شروع ہوا، یہ دین کامل ہوا خاتم النّبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر تیئیس سال کے عرصہ میں، اور آخر میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾: آج کامل کر دیا میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو ﴿وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ اور پوری کر دی میں نے تم پر اپنی نعمت۔ یہ نعمت بھی دین اسلام ہے، آیت کے دوسرے ٹکڑے میں کوئی نئی بات نہیں ہے ﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ پھر وہی مضمون تیسرے طریقہ پر بیان کیا ہے کہ پسند کرلیا میں نے تمہارے فائدے کے لئے دین اسلام کو۔ دنیا میں جب تک جیو دین اسلام پر رہو، مرنے کے بعد قبر میں بھی یہی دین اسلام کام آئے گا، قیامت کے دن بھی یہی دین اسلام کام آئے گا اور جنت میں جانے کے لئے بھی یہی دین اسلام ضروری ہے۔ میں نے تمہارے لئے ہر زندگی میں دین اسلام کو پسند کرلیا ہے۔

یہ آیت دو عیدوں کے موقعہ پر نازل ہوئی ہے:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایک یہودی نے کہا: تمہارے قرآن میں ایک آیت ہے، اگر وہ آیت ہماری تورات میں نازل ہوتی تو جس دن وہ آیت نازل ہوتی ہم اس دن میں فنکشن منایا کرتے، تقریب مناتے۔ حضرت نے پوچھا: وہ کونسی آیت ہے؟ اس نے یہی آیت پڑھی: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ الآية: حضرت عمرؓ نے کہا: یہ آیت اس دن نازل ہوئی ہے جب ہماری دو عیدیں اکٹھا تھیں۔ وہ دو عیدیں کیا تھیں؟ یوم عرفہ اور جمعہ کا دن۔ جب نبی پاک ﷺ ۱۰ ہجری میں حج کے لئے تشریف لے گئے اور عرفہ کے میدان میں وقوف کئے ہوئے تھے تو وہ اتفاق سے جمعہ کا دن تھا اور یہ آیت نازل ہوئی، پس اسلام میں عرفہ کا دن خود ایک عید ہے اور جمعہ کا دن دوسری عید ہے۔ اور دونوں عیدیں اکٹھا تھیں اس دن یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

عید کا تصور

میرے بھائیو! مسلمانوں میں اور غیر مسلموں میں عید کا تصور مختلف ہے، اسلام میں عید

کا تصور ہے: عبادت کرنا اور غیروں میں عید کا تصور ہے: اچھلنا کودنا۔ اب مسلمانوں میں بھی یہ تصور آ گیا ہے کہ آج عید ہے اور نوجوان لڑکے لڑکیاں اچھے اچھے کپڑے پہن کر مٹر گشتی کرتے ہیں، پارک میں جاتے ہیں، ساحل پر جاتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ اسلام میں عید کا یہ تصور نہیں، اسلام میں عید: عبادت کا نام ہے، عید کے دن اٹھو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ کر دوگانۂ شکر ادا کرو۔

اور عرفہ کا دن عبادت کا دن ہے، وہ ہمارے لئے عید کا دن اور خوشی کا دن ہے اور جمعہ بھی عبادت کا دن ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: یہ آیت جس دن نازل ہوئی ہے اس دن دو عیدیں اکٹھا تھیں، لہٰذا ہمیں اس آیت کے نزول کے وقت کو مستقل عید بنانے کی ضرورت نہیں، وہ عید کے دن ہی اتری ہے۔ اور ہماری یہ دونوں عیدیں آج تک مسلسل جاری ہیں۔

مجھے اس واقعہ سے یہ سمجھانا ہے کہ اس آیت کی کتنی اہمیت ہے، یہودی بھی کہہ رہا ہے کہ اگر یہ آیت ہماری تورات میں اترتی تو ہم اس دن فنکشن مناتے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ دین خاتم النّبیین ﷺ پر اتارا، پھر تصورات بگڑتے چلے گئے، امت محمدیہ میں بھی بہتر گمراہ فرقے وجود میں آئے، اور خرابی عقائد و اعمال دونوں میں آئی، مثلاً قرامطہ (باطنیہ) فرقہ کہتا ہے کہ نماز جس کو مسلمان خاص طریقہ پر پڑھتے ہیں یہ اسلام میں نہیں ہے، نماز: دھیان گیان کا نام ہے، آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ، اللہ کا تصور کرلو: نماز ہوگئی، اور پاکستان میں ایک فرقہ نکلا ہے، وہ کہتا ہے: قرآن میں پانچ نمازیں نہیں ہیں۔ صرف دو نمازیں ہیں: ﴿وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ﴾: صبح و شام اللہ کی پاکی بیان کرو، یہی دو نمازیں ہیں۔ پانچ نمازیں مولویوں نے گھڑی ہیں۔ یہ شریعت کو بگاڑنا ہے، اور اسی طرح اسلامی تصور میں بھی بگاڑ آیا، فرشتوں کے تصور میں بھی بگاڑ آیا، نبیوں کا کیا مقام و مرتبہ ہے اس میں بھی بگاڑ آیا، اللہ کی صفات میں بحثیں شروع ہوئیں اور اس میں بھی بگاڑ آیا۔ اس لئے میرے بھائیو! جو دین اسلام ہے وہ قرآن وحدیث میں ہے، اس دین کے مطابق اگر ہم رہے تو اللہ کی یہ نعمت ہم دست رہے گی، اور اگر ہم نے اس کا خیال نہیں رکھا تو پھر ہمارے پاس نام کا اسلام رہ جائے گا۔

خلاصہ کلام: اس آیت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو دین

اسلام دیا ہے اس کی قدر پہچانو، یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے جو اللہ نے کمپلیٹ کردی ہے، دین اسلام جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے برابر نازل ہوتا رہا ہے وہ تمہیں پورا پورا دیدیا گیا ہے اور تمہارے جینے اور مرنے کے لئے اسی دین اسلام کو پسند کرلیا ہے۔

اسلام میں پورے آجاؤ:

دوسری آیت میں ہم سے کہا گیا ہے: ﴿یٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا﴾: اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً﴾: تم دین اسلام میں پورے آجاؤ۔ جب اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہو تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اسی کے ہوکر رہو، ایک پیر اسلام میں اور ایک پیر اسلام سے باہر مت رکھو۔ مثلاً: آدمی کا جی چاہا جمعہ کے دن نماز پڑھنے کو تو پڑھ لی اور نوکری نے تقاضا کیا کہ چھ دن ظہر نہیں پڑھنی تو نہیں پڑھی، یہ اللہ کا بندہ کہاں ہوا، یہ تو نوکری کا بندہ ہوگیا۔ یا جی چاہا ختنہ کرانے کو تو ختنہ کرالی، اور اللہ کے حکم کی تعمیل کی اور جی چاہا ڈاڑھی منڈانے کو منڈالی یہ اللہ کا حکم کہاں ہوا؟ یہی ایک قدم اسلام میں اور ایک قدم باہر رکھنا ہے، یہ کوئی ایمان واسلام کا تقاضہ نہیں، یا ایک ہندو مسلمان ہوا وہ مسلمان ہونے کے بعد بھی گوشت نہیں کھاتا یا گائے کا گوشت نہیں کھاتا پس وہ اسلام میں پورا نہیں آیا، اس کی کو مسلمان ہونے کے بعد بھی دوسری طرف لگی ہوئی ہے۔

صرف خود کو دین دار بنالینا کافی نہیں

ہم اپنی دنیا میں مگن ہیں، اور ہم میں جو دین دار ہیں وہ دین پر شاداں فرحاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین دار بنایا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿یٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَیْتُمْ﴾: اے ایمان والو! اگر تم راہ یاب ہوگئے تو جو کھڈے میں گرے: گرے، تمہارا کیا بگڑتا ہے؟ مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگ اس آیت کو غلط سمجھتے ہیں، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم دین دار ہوگئے تو ہماری دنیاؤ آخرت کامیاب ہوگئی۔ حالانکہ خدا کی قسم! میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر تم ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑو گے تو اللہ تعالیٰ عذاب میں سب کو شامل کرلیں گے۔ اس لئے علماء

کرام فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت کا نمبر دین کی صحیح تبلیغ کے بعد ہے یعنی آدمی اپنی ذمہ داری پوری کرلے، تبلیغ کا حق ادا کردے پھر بھی کوئی نہ مانے تو اب ہماری ذمہ داری نہیں کہ زبردستی اس کو دین پر لے آئیں، لیکن اگر ہم دین پر ہیں اور اس پر خوش ہیں، مگر بے دینوں اور بددینوں کی ہمیں کوئی فکر نہیں تو ہم عذاب سے بچ نہیں سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾: اے ایمان والو! خود کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم سے بچاؤ۔ خود دین پر عمل کرکے اور بیوی بچوں کو بے دین چھوڑ کر دنیاؤ آخرت میں کامیابی نہیں مل سکتی، دنیا میں بھی اس کا وبال بھگتنا پڑے گا اور آخرت میں بھی بیوی بچوں کے سلسلہ میں مواخذہ ہوگا۔

میرے بھائیو! آپ کو ایسے مسلمان ہر جگہ ملیں گے جو دین سے دور ہیں، ان کو دین کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، کیونکہ کوئی دین کی بات بتانے والا ان تک پہنچا ہی نہیں، صورت حال سینکڑوں سال سے بگڑتی چلی آرہی ہے، آج ستر فیصد مسلمان دین سے بے خبر ہیں۔ یہ ستر فیصد کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ہم پر ہے! اگر ہم نے دین انہیں پہنچایا پھر بھی وہ دین کی طرف نہ آئیں تو اب ہماری ذمہ داری نہیں۔

غرض: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ اس آیت کو غلط سمجھتے ہیں کہ ہم دین پر آگئے، اب دوسرے جو چاہیں کریں ہمارا کچھ نہیں بگڑتا، یہ مطلب صحیح نہیں۔

لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کا مطلب

اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: جب تم ایمان لے آئے تو دین اسلام میں پورے پورے آجاؤ۔ لفظ اسلام کے معنی ہیں: سرافگندگی، سر ڈال دینا۔ ہالی بیل لے کر جب ہل جوتنے کے لئے جاتا ہے تو ایک بیل کو دائیں طرف گھماتا ہے اور ایک کو بائیں طرف، اس کے بعد وہ جُوا اٹھاتا ہے۔ اب اگر شاندار بیل ہوتے ہیں تو فوراً سر ڈال کر جُوا اپنی گردن پر لے لیتے ہیں۔ یہ ہے اسلام: یہ ہے سرافگندگی۔ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ﴾: امانت کو یعنی ذمہ داری کو انسان نے اٹھالیا۔ انسان کو جُوا دکھایا اس نے اپنی گردن پر اسے لے

لیا۔ **لا إله إلا الله، محمد رسول الله** کا یہی مطلب ہے۔ **لا إله إلا الله**: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس میں دو باتیں ہیں: ایک: اللہ کو معبود ماننا، دوسری: اللہ کے سوا سے معبودیت کی نفی کرنا۔ جب یہ بات کسی نے مان لی تو اب خود بخود یہ بات لازم آئی کہ وہی معبود ہیں اور ہم عابد ہیں، وہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ ہمیں بندگی کیسے کرنی ہے؟ یہ بات اگر انسانوں کی مرضی پر چھوڑ دی جائے تو کام نہیں چلے گا اس لئے اگلا جملہ بڑھایا: **محمد رسول الله**: حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے پیغامبر ہیں۔ وہ کیا پیغام لائے ہیں؟ انسان اللہ کی بندگی کیسے کریں؟ یہ بات اللہ نے حضور ﷺ کے ذریعہ ہمیں بتائی ہے، پس حضور نے اللہ کی بندگی کی جو جو شکلیں بتائی ہیں ان سب کو ماننا، ان سب پر چلنا اور ان سب کی تعمیل کرنا یہی اللہ کی بندگی ہے۔

لوگوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ نماز پڑھنے ہی کا نام بندگی ہے، ایسا نہیں ہے۔ بندگی: معبود کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہے، انھوں نے کہا: پانچ وقت کی نماز اس طرح پڑھو: پڑھی، یہ بندگی ہے، انھوں نے کہا: ہر سال مال میں سے اتنا حصہ غریبوں کو پہنچاؤ: پہنچایا: یہ بندگی ہے، انھوں نے کہا: سال میں ایک مہینہ کے روزے رکھو: رکھے: یہ بندگی ہے، انھوں نے حکم دیا کہ زندگی میں ایک مرتبہ میرے گھر آؤ اور اس طریقہ سے زیارت کرو: گئے اور زیارت کی: یہ بندگی ہے، انھوں نے حکم دیا کہ جب دوکان کھولو تو یوں بیچو، یوں مت بیچو، کرایہ پر دو تو اس طرح دو، اس طرح مت دو، زمین کسی کو بٹائی پر دو تو اس طرح دو، اس طرح مت دو، کمائی کے حلال ذریعے یہ ہیں اور حرام ذریعے یہ ہیں، یہ سب معاملات اللہ کے حکم کے مطابق کرنا اس کا نام ''بندگی'' ہے، اللہ پر ایمان لانے والوں کے اخلاق ایسے ہونے چاہئیں، یہی اسلامی اخلاق اختیار کرنا بندگی ہے اور ان اخلاق کی اضداد کو اختیار کرنا اللہ کی نافرمانی ہے۔ صرف نماز میں بندگی منحصر نہیں۔ سارا دین جو حضور ﷺ نے ہمیں پہنچایا ہے اس پر عمل پیرا ہونا: بندگی ہے اور اس دین کے احکام میں سے یہ بھی ہے: **بلغوا عني ولو آية**: پہنچاؤ میری طرف سے اگرچہ ایک آیت ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں: تبلیغ کرنا مولویوں کا کام ہے: یہ غلط ہے۔ بخاری کی مذکورہ حدیث کہہ رہی ہے کہ اگر کسی کو دین کی ایک بات یا ایک حکم معلوم ہے تو وہ بھی آگے پہنچائے،

ہاں جسے معلوم نہ ہو وہ خاموش رہے، اس کو علماء (جاننے والوں) کے حوالے کر دے۔

حدیثِ جبرئیل علیہ السلام:

ایک حدیث ہے اور وہ بہت مشہور حدیث ہے، اس کو بار بار سننی چاہئے، اس میں دین کا پورا خلاصہ اور نچوڑ آ گیا ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ صحابہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک مجلس میں ایک نوجوان آیا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال کالے تھے، کپڑے نہایت اجلے اور سفید تھے، وہ مجمع کو چیرتے ہوئے حضور ﷺ کے قریب آ کر بیٹھ گئے: اور اپنے گھٹنے آپؐ کے گھٹنوں سے لگا دیئے۔ تمام صحابہ حیرت میں تھے کہ یہ کون ہے؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر سے نہا دھو کر کپڑے بدل کر آیا ہے یعنی مدینہ کا باشندہ ہے، اور مجمع میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہیں تھا، اس سے معلوم ہوا کہ باہر کا آدمی ہے۔

اس نے پہلا سوال کیا: ما الإیمان؟ ایمان کیا ہے؟ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: سات باتیں ماننے کا نام ایمان ہے: ۱- اللہ کو ماننا۔ ۲- اللہ کے فرشتوں کو ماننا۔ ۳- اللہ کی کتابوں کو ماننا۔ ۴- اللہ کے رسولوں کو ماننا۔ ۵- آخری دن (قیامت کے دن) کو ماننا ۶- مرنے کے بعد زندہ ہونے کو ماننا۔ ۷- بھلی بری تقدیر کو ماننا۔ ان میں سے چھ کو تو آپ لوگ سمجھے ہوئے ہیں، البتہ تقدیر کا مطلب لوگ اچھی طرح نہیں جانتے، اس لئے اس کو مختصراً عرض کرتا ہوں:

بھلی بری تقدیر کا مطلب:

تقدیر کے معنی ہیں: پلاننگ، اندازہ ٹھہرانا۔ جیسے آپ کوئی بلڈنگ بنائیں تو پہلے آرٹی کیٹ سے نقشہ بنواتے ہیں، پھر اس کے مطابق بلڈنگ کھڑی کرتے ہیں، اسی طرح ازل میں جب کوئی چیز نہیں تھی: اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی جس کو وہ آگے پیدا کرنے والے ہیں: پلاننگ کی ہے، یہ دنیا پلاننگ کے بغیر پیدا نہیں کی ہے، اسی کا نام تقدیر ہے۔

اُس تقدیر میں یہ ہے کہ گھی انسان کے لئے مفید ہے، اور زہر جاں ستاں! یہی بھلی بری تقدیر ہے، چنانچہ سارے انسان اللہ کی اس تقدیر کو مانتے ہیں، انسان پیسے خرچ کر کے کریم لاتا ہے اور زہر سے ہزاروں کوس دور بھاگتا ہے، اسی طرح عقائد و اعمال میں بھی بھلی بری

تقدیر ہے۔ توحید (اللہ کو ایک ماننا) انسان کے لئے مفید ہے، اور شرک تباہ کن ہے۔ نماز پڑھے گا تو جنت میں جائے گا اور زنا کرے گا تو جہنم رسید ہوگا، صدقہ جنت میں لے جائے گا، چوری جہنم میں پہنچائے گی۔ یہ بھلی بری تقدیر ہے، اور جیسے زہر اور گھی میں اللہ کی تقدیر کا لحاظ کرتے ہوئے ہم زندگی گذارتے ہیں، ان عقائد و اعمال میں بھی اللہ کی تقدیر کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

انسان کائناتی چیزوں کی حد تک اللہ کی تقدیر کی پوری پابندی کرتا ہے، اگر تجربہ سے معلوم ہو جائے کہ یہ چیز مضر ہے تو کبھی اس کے قریب نہیں جاتا، اور اگر تجربہ سے معلوم ہو جائے کہ یہ چیز مفید ہے تو اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے، مگر لوگ ایمان و کفر میں اس کا لحاظ نہیں کرتے، حسنات و سیئات میں بھی اس کا لحاظ نہیں کرتے، حالانکہ ایمان جنت میں لے جانے والا عمل ہے اور کفر جہنم میں لے جانے والا، جو جنت میں جائے گا وہ ایمان کی وجہ سے جائے گا اور جو جہنم میں جائے گا وہ کفر کی وجہ سے جائے گا۔ یہی حال اعمالِ حسنہ اور سیئہ کا ہے۔ یہی انسان کے لئے بھلی بری تقدیر ہے۔

تقدیر مفصل ہے، مجمل نہیں:

اور عالم کے لئے اللہ تعالیٰ کی پلاننگ تفصیل کے ساتھ ہے، محض اجمالی نہیں، جیسے انگریزوں نے ایک دفعہ ایک آنریری مجسٹریٹ ایک جاہل بدھو کو اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے بنا دیا، وہ ہفتہ میں ایک دن کچہری کرتا تھا۔ مقدمات کی ساری فائلیں لاکر پیش کاران کے سامنے رکھ دیتا تھا، مجسٹریٹ ایک فائل اٹھاتا اور دائیں طرف رکھتا اور کہتا: منجور (منظور) دوسری بائیں طرف رکھتا، اور کہتا: نامنجور (نامنظور) اس طرح سب مقدمات کو نمٹا دیتا، آدھے منجور ہو جاتے اور آدھے نامنجور۔ اللہ کی تقدیر ایسی اندھا دھند نہیں ہے کہ یہ جنت میں اور یہ جہنم میں، بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ ہے۔

ایک صحابی نے حضور ﷺ سے پوچھا: أَرَأَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيْهَا، وَدَوَاءً نَتَدَاوَى بِهٖ وَتُقَاةً نَتَّقِيْهَا: هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدْرِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ یا رسول اللہ! بتائیں! یہ جو ہم جھاڑ پھونک کرتے ہیں، اور جو ہم دوائیں کرتے ہیں، اور جو ہم پرہیز کرتے ہیں، یہ چیزیں اللہ کی تقدیر کو ٹلا سکتی

ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: هِيَ مِنْ قَدْرِ اللّٰهِ: یہ چیزیں اللہ کی تقدیر میں شامل ہیں۔

(مشکوٰۃ شریف حدیث ۹۷)

اسی طرح اللہ کی تقدیر میں ہے کہ انسان اپنے جزوی اختیار سے کفر کرے گا، گناہ کرے گا اور توبہ نہیں کرے گا، اور اسی پر اس کی موت آئے گی، اس لئے وہ جہنم میں جائے گا۔ دوسرا بندہ اپنے جزوی اختیار سے ایمان لائے گا، صالح زندگی اختیار کرے گا اور اس طرح زندگی گذارتے گذارتے مرجائے گا اس لئے جنت میں جائے گا۔ یہ پورا سلسلہ اللہ کی تقدیر میں شامل ہے، اور اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے کہ یہ لوگ جنت میں جائیں گے اور یہ لوگ جہنم میں جائیں گے، مگر یہ تقدیر کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ شمولِ علم کا مسئلہ ہے، اور دونوں مسئلوں کو گڈ مڈ کرنے سے اشکالات پیدا ہوتے ہیں، اللہ نے ازل میں طے کیا ہے کہ ایمان واعمال صالحہ انسانوں کے لئے مفید ہیں، وہ جنت میں لے جائیں گے، اور کفر اور اعمالِ سیۂ انسانوں کے لئے مضر ہیں۔ رہی یہ بات کہ کون اپنے جزوی اختیار سے کونسا عمل کرے گا اور کہاں پہنچے گا: یہ بات بھی اللہ تعالیٰ ازل سے جانتے ہیں، کیونکہ وہ غیب وشہادت کے جاننے والے ہیں، مگر یہ شمولِ علم کا مسئلہ ہے، تقدیر کا مسئلہ نہیں ہے۔

غرض: نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ سات باتیں دل سے قبول کرنے کا نام ایمان ہے۔

پھر انھوں نے پوچھا: ما الإسلام؟ اسلام کیا ہے؟ یہی آج کی تقریر کا موضوع ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: پانچ کام کرنے کا نام اسلام ہے:

۱- شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ: یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ گواہی دینا کہ آقائے دوجہاں تاجدار مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے پیغامبر ہیں، ان دو باتوں کو ماننا ایمان ہے، اور ان کی گواہی دینا اسلام ہے۔

گواہی کہاں دی جاتی ہے؟

جب مقدمہ کورٹ میں جاتا ہے اور کوئی آدمی دعوی کرتا ہے کہ یہ گھر میرا ہے، اور دوسرا انکار کرتا ہے تو جج مدعی سے کہتا ہے: گواہ لاؤ، گواہ اس مدعا علیہ کے خلاف گواہی دیتا ہے جو دعوی کا انکار کرتا ہے، اگر وہ انکار نہ کرے تو گواہی کی کوئی ضرورت نہیں۔ معلوم ہوا کہ گواہی

منکر کے سامنے دی جاتی ہے۔

میرے بھائیو! دنیا میں جو لوگ یہ دو عقیدے نہیں مانتے ان کے سامنے جا کر گواہی دینا: یہ اسلام کا پہلا کام ہے۔ پھر کورٹ میں جب گواہی دیتے ہیں تو گواہوں کا کام فیصلہ کرنا نہیں ہوتا، ان کا کام صرف گواہی دینا ہوتا ہے، فیصلہ جج کرتا ہے۔ یہاں بھی قیامت کے دن جب کورٹ قائم ہوگی اس وقت اللہ تعالیٰ فیصلہ کریں گے: ﴿اللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾: اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائیں گے (الحج آیت ۹۶) پس فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں، ہمارا کام: جو لوگ یہ دو عقیدے نہیں مانتے ان کے سامنے گواہی دینا ہے۔

امت کا حال یہ ہے کہ مسلمان ہی کلمہ سے محروم ہو گئے ہیں، ہم ان تک بھی کلمہ نہیں پہنچا سکے، جو لوگ ان دو عقیدوں کا انکار کرتے ہیں ان تک ہم کلمہ کیا پہنچائیں گے؟! ہم اذان وغیرہ میں شہادتین پکارتے ہیں، مگر ان کو سمجھتا کون ہے؟ جبکہ اس امت کا فریضہ ہے کہ ہر وہ انسان جو یہ دو عقیدے نہیں مانتا اس کے سامنے ان عقیدوں کی گواہی دی جائے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

گواہی کس طرح دینی چاہئے؟

ہماری دوکان میں ایک غیر مسلم ملازم ہے، یا ہم ٹرین میں سفر کر رہے ہیں، ساتھ میں غیر مسلم بیٹھا ہوا ہے، جہاز میں سفر کر رہے ہیں، ساتھ میں غیر مسلم بیٹھا ہوا ہے۔ آپ اس سے پوچھیں: آپ جانتے ہیں: میرا مذہب کیا ہے؟ وہ کہے گا: ہاں جانتا ہوں: آپ مسلمان ہیں۔ یا کہے گا: نہیں جانتا: پس آپ کہیں: میں مسلمان ہوں، پھر آپ پوچھیں: کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ اسلام کس کو کہتے ہیں؟ وہ کہے گا: میں نہیں جانتا۔ پس آپ کہیں: میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ یہ ہے کہ معبود صرف اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور میں اسی کی بندگی کرتا ہوں، کسی اور کے سامنے سر نیاز خم نہیں کرتا۔ اور مکہ میں آج سے چودہ سو سال پہلے ایک شخصیت پیدا ہوئی تھی، جس کا نامِ پاک محمد ﷺ تھا، ان کو میں آخری پیغامبر مانتا ہوں، وہ جو اللہ کے یہاں سے پیغام لائے ہیں اس پر میں چلتا ہوں۔ بس اتنی بات آپ نے اس کے سامنے رکھ دی تو آپ نے گواہی دے دی۔ اب اگر وہ سمجھ دار ہے، اللہ نے اس کے

نصیب میں خیر رکھی ہے تو اس کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے عقیدوں کا ہمارے عقیدوں سے موازنہ کرے گا اور اللہ چاہیں گے تو وہ اور سوچے گا، مطالعہ کرے گا اور اگر نہیں کرے گا تو ہم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ گواہی دینا بس اتنا ہی ہے، مگر ہماری کوتاہی یہ ہے کہ بیس سال سے ایک ہندو ہماری فرم میں ملازم ہے، مگر کبھی ہم نے اس کو سمجھایا نہیں کہ اسلام کے بنیادی عقیدے یہ ہیں۔

غرض: اسلام کا پہلا عمل توحیدِ باری اور رسالتِ محمدی کی گواہی دینا ہے اور گواہی ماننے والے (مسلمان) کے سامنے نہیں دی جاتی، انکار کرنے والے (غیر مسلم) کے سامنے دی جاتی ہے۔ دوسرا عمل: نمازوں کا اہتمام کرنا ہے، تیسرا عمل: زکات ادا کرنا ہے، چوتھا عمل: رمضان کے روزے رکھنا ہے، پانچواں عمل: زندگی میں ایک مرتبہ اللہ کے گھر کی زیارت کرنا (حج کرنا) ہے، اگر ہمارے اندر مالی وسعت ہے۔ ان پانچ چیزوں کا نام ''اسلام'' ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام ہیں، لیکن نجات کا مدار انہی پانچ اعمال پر ہے، جو یہ پانچ کام کرے گا وہ اسلام میں پورا آ گیا، اور اگر نماز پڑھتا ہے مگر زکوٰۃ نہیں دیتا، یا نماز پڑھتا ہے مگر روزے نہیں رکھتا یا روزے رکھتا ہے، مگر نماز نہیں پڑھتا، سب کچھ کرتا ہے اور اللہ نے گنجائش دے رکھی ہے مگر حج کے لئے نہیں جاتا، حج کے لئے ہر سال جاتا ہے مگر نماز نہیں پڑھتا تو وہ اسلام میں ایک قدم آیا دوسرا قدم باہر ہی رہا، پورا اسلام میں نہیں آیا۔

انسان کا کمال کیا ہے؟

کبھی گناہ نہ کرنا یہ فرشتوں کی شان ہے، اور گناہ کر کے اس پر اڑ جانا، توبہ نہ کرنا یہ شیطان کی شان ہے، اور انسان کا کمال یہ ہے کہ اول تو گناہ کرے نہیں اور اگر ہو جائے تو فوراً توبہ کرے۔ آدم علیہ السلام نے گناہ نہیں کیا تھا، لغزش ہوگئی تھی، مگر پھر بھی فوراً ندامت کے آنسو بہائے اور اتنے بہائے کہ اللہ کی طرف سے مغفرت استقبال کے لئے آئی، اللہ تعالیٰ نے خود کلمات بھیجے کہ ان کے ذریعہ توبہ کرو ہم قبول کر لیں گے: ﴿فَتَلَقّٰی آدَمُ مِنْ رَبِّهٖ کَلِمَاتٍ، فَتَابَ عَلَیْهِ﴾: پھر آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات حاصل کئے، پس اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ ان کی طرف توجہ فرمائی (البقرۃ آیت ۳۷)

بہرحال قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اللہ نے، اس کے رسولوں نے، اس کے نیک بندوں نے اللہ کی جو باتیں بتائی ہیں ان کو سنو، ان پر عمل کرو، اور اسلام کا جو امتیاز ہے اس کو باقی رکھو، جیسے سکھوں کے مذہب کا امتیاز ڈاڑھی اور پگڑی ہے، دنیا میں کہیں چلے جائیں، ان کی ڈاڑھی اور پگڑی کو کوئی نہیں چھو نہیں سکتا، اور اسلام کا امتیاز بھی ڈاڑھی ہے، مگر مسلمانوں نے اپنا امتیاز کھو دیا۔ شیطان نے اس کو پٹی پڑھائی کہ ڈاڑھی کے بغیر تیری ملازمت باقی نہیں رہے گی۔ ارے بھائی! ان سکھوں کی ملازمت باقی رہتی ہے، تیری کیوں ختم ہو جائے گی؟ اسی طرح کچھ لوگ نوکری کرتے ہیں اور نماز نہیں پڑھتے، کہتے ہیں: مالک اجازت نہیں دیتا۔ مالک کو کیا پریشانی ہے؟ کمی ہمارے اندر ہے، مسلمان نوکری کے ٹائم میں نماز پڑھنا چاہتا ہے اور نماز میں جو وقت خرچ ہوتا ہے اس کی بھی تنخواہ چاہتا ہے۔ ارے بھائی! تو نے اپنی عبادت کی ہے، پھر تنخواہ کس بات کی؟ تجھے چاہئے کہ اتنا اور ٹائم کرے یا تنخواہ کٹوائے، پھر دیکھ کونسا مالک نماز پڑھنے سے روکتا ہے؟ ہاں ہو سکتا ہے: کوئی مالک کمینہ ہو، جواب بھی نماز کی اجازت نہ دے تو ملازمت چھوڑ دے، ملکِ خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست! اللہ کا ملک تنگ نہیں اور ہمارے پیر میں لنگ نہیں، کسی اور جگہ نوکری مل جائے گی۔

خلاصۂ کلام:

پس میرے بھائیو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کی پیروی مت کرو، شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ اللہ کے رسول نے جو دین پہنچایا ہے اس کو سیکھو، سمجھو اور تمام مسلمانوں تک پہنچاؤ، مقامی طور پر دعوت کی محنت کرو، وقت نکالو، اپنے اندر ذوق وشوق پیدا کرنے کے لئے جماعتوں میں نکلو، دوسرے مسلمانوں تک دین پہنچانے کے لئے گھر سے نکلو اور جب بھی موقعہ ملے تمام انسانوں کے سامنے توحید باری اور رسالت محمدی کی گواہی دو، یہی کامیابی کی راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مضمون کو سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين

۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دنیا کی زندگی کس مقصد کے لئے ہے؟

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَإِنَّا لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا﴾ (الکہف: ۷و۸) ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک: ۲)

تین زندگیاں

۱-اس دنیا میں آنے سے پہلے عالم ارواح کی ایک زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے قیامت تک آنے والی تمام اولاد اس طور پر نکالی کہ اللہ نے اپنی قدرت کا ہاتھ حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں پیٹھ پر پھیرا تو تمام نیک اولاد نکل آئی، پھر بائیں پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو تمام بد اولاد نکل آئی، پھر اللہ نے تجلی فرمائی اور سب کو اپنی پہچان کروائی، پھر پوچھا: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؟ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے بیک زبان کہا: بَلٰی ! کیوں نہیں! آپ کے علاوہ ہمارا کوئی معبود نہیں، پھر بخاری کی حدیث (نمبر ۳۳۳۶) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پیدا ہونے والی تمام روحوں کو عالم ارواح میں ایک خاص ترتیب سے گروپ بنا کر رکھ دیا جیسے آرمی (فوج) میں گروپ اور رجمنٹ (۱) ہوتے ہیں، پھر جب کسی روح کے دنیا میں آنے کا وقت آتا ہے تو ماں کے پیٹ میں پہلے باڈی

---

(۱) رجمنٹ: پیدل سپاہیوں کا دستہ، پلٹن، رجمنٹ میں عام طور پر آٹھ سو سے ایک ہزار تک سپاہی ہوتے ہیں۔

(جسم) بنتی ہے، جب باڈی مکمل ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو حکم دیتے ہیں، وہ عالم ارواح سے اُس روح کو — جس کے لئے یہ باڈی تیار ہوئی ہے — لاکر پھونک دیتا ہے، پس بچہ ماں کے پیٹ میں زندہ ہوکر ہلنے لگتا ہے۔ ہماری ایک زندگی تو یہ ہے، عہدِ الست والی، اس میں ہم جب پیدا ہوگئے: ہوگئے، پھر مرے نہیں۔

۲- اور ایک زندگی قیامت سے شروع ہوکر ابد تک ہے۔ جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو تمام چیزیں فنا ہوجائیں گی اور حیوانات مرجائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ خاص بارش برسائیں گے اس سے ہمارا وہ بدن جو مٹی میں گل سڑ چکا ہوگا: دوبارہ بنے گا اور اس طرح زمین سے نکلے گا جس طرح گھاس نکلتی ہے، پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو ہماری وہ روحیں جو عالم برزخ میں ہونگی واپس اپنے اجسام میں داخل ہوجائیں گی۔ اس طرح مرنے کے بعد دوسری زندگی شروع ہوگی، پھر قیامت کے دن میں حساب ہوگا، حساب کتاب کے بعد دونوں دنیاؤں کے درمیان پل رکھا جائے گا جس کو پل صراط کہتے ہیں، صراط کے معنی پل کے ہیں اور تمام مکلّف مخلوقات اِس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل ہوجائے گی، جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور جہنمی جہنم میں، پھر جنت اور جہنم کی زندگی تا ابد ہے۔

۳- عالم ارواح اور عالم آخرت کے درمیان اس دنیا کی زندگی ہے، اس زندگی میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی ہے۔ اور یہ جینا مرنا روح کا نہیں ہے، روح تو جب سے پیدا ہوئی ہے: ہوئی ہے، وہ مرتی نہیں، وہ فنا نہیں ہوتی، مرتا ہمارا جسم ہے، فنا وہی ہوتا ہے۔ جب جسم مرجاتا ہے تو روح آگے چلی جاتی ہے اور جسم چارپائی پر پڑا رہتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں بندے کا ''انتقال'' ہوگیا، فلاں ''گذر'' گیا۔ اور یہ جسم عربی میں لاشیئ کہلاتا ہے اور اردو میں: لاش، یعنی یہ کوئی چیز نہیں۔ معلوم ہوا کہ پیدا بھی جسم ہوتا ہے اور مرتا بھی جسم ہے، رہی روح تو وہ پیدا ہونے کے بعد کبھی نہیں مرتی۔ شاعر کہتا ہے:

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن (۱) سے
کہ روح مرتی نہیں مرگِ بدن سے

---

(۱) بوالحسن یعنی حضرت امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ: اشاعرہ کے امام۔

دنیوی زندگی کیوں ہے؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالم ارواح کی زندگی کیوں ہے؟ اس کی تفصیل کا وقت نہیں (۱) اور آخرت کی تا ابد زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کی تفصیل کا بھی وقت نہیں (۲) البتہ درمیان میں اِس دنیا کی زندگی ہے، یہ کیوں ہے؟ یہ کس مقصد کے لئے ہے؟ یہ ہماری آج کی تقریر کا موضوع ہے:

قرآنِ کریم میں ایک آیت سورۂ کہف میں ہے اور اُسی مضمون کی دوسری آیت سورۂ ملک میں ہے۔ ان دونوں آیتوں کا ترجمہ اور ہلکا سا مطلب سمجھ لیں: سورۂ ملک میں ہے: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ﴾: اللہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے مرنا اور جینا پیدا کیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے موت کا حیات سے پہلے ذکر کیا ہے، حالانکہ ترتیب میں حیات پہلے ہے موت بعد میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو جب کسی چیز پر زور دینا ہوتا ہے تو اس کو پہلے بیان کرتا ہے، میں اس کی کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں:

قرض پر وصیت کی تقدیم کی وجہ

پہلی مثال: مرنے والے کے ترکہ میں سے پہلے اس کا کفن دفن ہوگا، کفن دفن کے بعد اگر ترکہ بچا تو پورے ترکہ سے اس کے قرضے ادا کئے جائیں گے، پھر اگر کچھ بچا تو تہائی مال سے اس کی وصیت نافذ کی جائے گی اور باقی دو تہائی ورثاء کا حق ہے۔

ترتیب اسی طرح ہے مگر قرآن نے سورۂ نساء کے دوسرے رکوع میں چار جگہ وصیت کو قرض پر مقدم کیا ہے حالانکہ ترتیب میں قرض وصیت سے پہلے ہے ﴿مِنْ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ یُّوْصِیْ بِھَا أَوْدَیْنٍ﴾ یہاں وصیت کو قرض پر مقدم کرنے کی وجہ یہ بیان کی گئی

---

(۱) عالم ارواح کی زندگی سبق پڑھنے کے لئے تھی، توحید کا سبق اُس عالم میں پڑھا کر انسان کو اِس عالم میں پیدا (ظاہر) کیا گیا ہے۔

(۲) آخرت کی زندگی عمل کا بدلہ پانے کے لئے ہے، اِس عالم میں جو اچھا برا کیا ہے، اس کی جزاء وسزا آخرت میں ملے گی۔

مکتبہ حجاز دیوبند

ہے کہ قرض والے تو فوراً مطالبہ کرتے ہیں، اگر کسی کے مرنے کے بعد ایک ہفتہ ٹھہر جائیں تو بڑی بات ہے۔ اور وصیت والوں میں سے کون مانگنے آتا ہے؟ آدمی نے وصیت کی کہ میرے مال میں سے اتنا غریبوں کو دیا جائے یا کسی مدرسہ میں دیا جائے تو کون غریب مانگنے آتا ہے؟ کون مدرسہ والا مانگنے آتا ہے؟ اور قرض والے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وصیت پر زور دینے کے لئے اس کو چار جگہ قرض پر مقدم کیا تا کہ لوگ وصیت کو معمولی نہ سمجھیں، وہ جان لیں کہ یہ لازمی حق ہے اگر اس کو ادا نہیں کیا تو اللہ کے یہاں پکڑ ہوگی۔

عیسیٰؑ کی وفات کا پہلے تذکرہ کرنے کی وجہ

دوسری مثال: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ، روح اور جسم کے ساتھ آسمان پر اٹھایا ہے، پھر قیامت کے قریب زمین پر اُسی حیات کے ساتھ اتریں گے پھر شادی کریں گے اولاد ہوگی، حکومت چلائیں گے، قرآن وحدیث کے مطابق اس امت کی راہ نمائی فرمائیں گے اور چالیس سال حیات رہ کر وفات پائیں گے۔ مگر سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يَاعِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾: اور یاد کرو وہ وقت جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تمہیں موت دینے والا ہوں اور میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور کافروں کی شرارتوں سے تمہیں بچانے والا ہوں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی وفات بعد میں ہے اور رفع آسمانی پہلے ہے، مگر آیت میں ترتیب برعکس ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی موت پر زور دینا چاہتے ہیں کیونکہ رفع سماوی سے لوگوں کو غلط فہمی ہوسکتی تھی، بلکہ عیسائیوں کو غلط فہمی ہوئی بھی، انھوں نے خیال کیا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انسان تھے تو مرے کیوں نہیں؟ وہ زندہ آسمان پر کیسے چلے گئے؟ معلوم ہوا کہ وہ اللہ ہیں یا اللہ کا کوئی حصہ ہیں۔ اس لئے آیت میں متوفيك پہلے لایا گیا ہے، اور پہلے ہی بتا دیا ہے کہ ان کو بھی موت آنی ہے۔

جسم اور روح کے ساتھ آسمان پر جانا خدا ہونے کی دلیل نہیں

حضرت آدم علیہ السلام اور دادی حواء رضی اللہ عنہا اسی زمین پر پیدا کئے گئے ہیں اور اسی زمین پر ساری مخلوقات نے ان کو سجدہ کیا ہے، پھر حضرت آدمؑ اور دادی حواءؑ یہاں سے روح وجسم کے ساتھ آسمانوں کے پار جنت میں لے جائے گئے ہیں، پس کیا جنت میں جانے سے وہ خدا ہوگئے؟ نہیں! وہ جنت سے واپس زمین پر آئے تھے اور وقت مقررہ پر ان کو موت آئی تھی، اسی طرح نبی کریم ﷺ معراج میں جسم اور روح کے ساتھ آسمانوں میں گئے ہیں، تو کیا حضور آسمانوں میں جانے سے خدا بن گئے؟ نہیں! حضور واپس زمین پر تشریف لائے اور وقت مقررہ پر حضور کو بھی موت آئی۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے جانے کی وجہ سے خدا کیسے بن سکتے ہیں؟ ان کو بھی زمین پر واپس آنا ہے اور وقت مقررہ پر ان کو بھی موت آنی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی موت پر زور دیتے ہوئے متوفیك کا تذکرہ پہلے کیا تاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو۔

بہر حال یہ دو مثالیں ہیں جن کی مدد سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی چیز ترتیب میں بعد میں ہو اور قرآن کو اس پر زور دینا ہو تو قرآن اس کو پہلے ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ زور دینے ہی کے لئے ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ﴾ میں موت کو حیات سے پہلے ذکر کیا ہے، کیونکہ موت کے آنے کو اگرچہ سبھی مانتے ہیں، مگر عملی طور پر انسان اس کو بھولے رہتا ہے۔

دنیا جہنم بھرنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی ہے

آگے ارشاد ہے: ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً﴾ اس حصہ میں اللہ تعالیٰ نے موت وحیات (دنیوی زندگی) کے پیدا کرنے کا مقصد بیان کیا ہے کہ یہ دنیا کی زندگی جس میں موت وحیات ہے اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ جانچیں کہ تم میں سے شاندار عمل کون کرتا ہے، مدرسہ، اسکول، یونیورسٹی اور ہر تعلیمی ادارے کے قائم کرنے کا مقصد یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کون پہلی پوزیشن حاصل کرتا ہے، کوئی تعلیمی ادارہ طلبہ کو فیل کرنے کے لئے قائم نہیں کیا

جاتا، مگر قدرتی بات ہے کہ ہر ادارے میں کچھ ناہنجار طلبہ ہوتے ہیں جو محنت نہ کرنے کے نتیجہ میں فیل ہوجاتے ہیں، مگر کوئی ادارہ فیل کرنے کے لئے قائم نہیں کیا جاتا، اللہ تعالیٰ نے بھی یہ دنیا کی زندگی یہ دیکھنے کے لئے بنائی ہے کہ انسانوں میں شاندار عمل کون کرتا ہے؟ لیکن ناہنجار انسانوں کی دنیا میں کمی نہیں، وہ اپنے پیروں پر کلہاڑی ضرور ماریں گے اور جہنم کو بھریں گے۔ یہ ان کا اپنا عمل ہے، اللہ نے یہ دنیا ایسے لوگوں سے جہنم بھرنے کے لئے پیدا نہیں کی۔

زمین اتنی خوبصورت کیوں بنائی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی اتنی پرکشش اور دلچسپ بنائی ہے کہ آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے، آنکھیں جواب دیدیتی ہیں، کانوں سے سنتا نہیں، منہ میں دانت نہیں، ٹانگوں میں طاقت نہیں، مگر بوڑھا دنیا چھوڑنے کو تیار نہیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں: ﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَاعَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا﴾: اس زمین کی ساری چیزوں کو ہم نے زمین کی رونق بنایا ہے۔ ﴿لِنَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً﴾ تاکہ ہم جانچیں کہ اس زمین پر تم میں سے کون سب سے زیادہ شاندار عمل کرتا ہے۔

اس زمین میں جو کچھ ہے وہ سب انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے اور انسان کے پیدا ہونے سے بہت پہلے بنایا گیا ہے۔ یہ چاند، سورج، تارے، ہوا، دریا، درخت، حیوانات، چرندے، پرندے، درندے یہ سب انسان کے لئے ہیں اور انسان کے وجود میں آنے سے بہت پہلے بنائے گئے ہیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ مائدہ کے پانچویں رکوع میں یہ واقعہ آیا ہے کہ آدم علیہ السلام کے دو لڑکوں میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا، چونکہ ابھی تک کوئی مرا نہیں تھا، یہ پہلا انسان تھا جو مرا، پس زندہ بھائی سوچنے لگا کہ مردہ بھائی کا کیا کیا جائے؟ قرآن میں ہے کہ اللہ نے دو کوّے بھیجے، وہ آئے، لڑے، ایک نے دوسرے کو مار ڈالا، پھر قاتل کوّے نے پیروں سے زمین میں کھڈا بنایا اور مرے ہوئے کوّے کو اس میں ڈالا، اور مٹی ڈال کر دبا دیا اور اڑ گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کے اس بیٹے کو سکھایا کہ اس طرح اپنے بھائی کو

مٹی میں دفن کر۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ انسان سے پہلے کوّے پیدا ہو چکے تھے، اور کوّے ہی نہیں ساری مخلوقات پہلے پیدا کر دی گئی تھیں تا کہ انسان ان سے اپنی ضرورت پوری کرے۔ جیسے لڑکے کی شادی کرنی ہوتی ہے تو چھ مہینے پہلے سے گھر کا ساز وسامان تیار کیا جاتا ہے، ارادہ کرتے ہی دلہن کو گھر میں نہیں لے آیا جاتا، پہلے گھر کو سجایا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی ارادہ کرتے ہی فوراً انسان کو زمین پر نہیں بسا دیا، بلکہ پہلے زمین کو ساز وسامان سے زرق برق بنایا، پھر دنیا میں انسان کو پیدا کیا تا کہ اللہ تعالیٰ جانچیں کہ لوگوں میں سے شاندار عمل کر کے اللہ کے یہاں کون پہنچتا ہے۔ اور یہ زرق برق زمین ہمیشہ اسی طرح رہنے والی نہیں، ایک وقت آئے گا کہ زمین اجڑ جائے گی: ﴿وَإِنَّا لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا﴾ لہٰذا اس دنیا کے پیچھے اتنا مت پڑو کہ اپنی آخرت خراب کر لو، اپنی آخرت کو بناؤ اور اسی کے بقدر دنیا کے ساتھ دلچسپی رکھو۔ آگے قرآنِ کریم نے سات بزرگوں کا واقعہ ذکر کیا ہے، یعنی اصحابِ کہف کا واقعہ۔ وہ سات نوجوان تھے، اللہ نے ان کو ایمان کی توفیق دی، وہ دعوت لے کر بادشاہ کے دربار میں پہنچے، بادشاہ نے دعوت قبول نہیں کی اور حالات سے ان کو اندازہ ہوا کہ اب بادشاہ ہم کو قتل کر دے گا، پس انھوں نے دنیا کو لات ماری اور پہاڑوں میں نکل گئے، کیونکہ ملکِ خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ نیست! اللہ کا ملک تنگ نہیں، اور فقیر کا پاؤں لنگڑا نہیں۔ چنانچہ شہر سے باہر ایک غار میں انھوں نے پناہ لی اور سستانے کے لئے لیٹے تو سو گئے، تین سو سال کے بعد ان کی آنکھ کھلی، ایک آدمی کو کھانا لانے کے لئے بازار بھیجا۔ جب اس نے تین سو سال پہلے کی کرنسی دیکھی تو دوکاندار کو شک ہوا کہ شاید اس کے ہاتھ خزانہ لگا ہے، بات بڑھی اور بادشاہ تک پہنچی۔ لوگ تین سو سال میں مسلمان ہو چکے تھے، بادشاہ بھی مسلمان تھا، اور شاہی خزانہ میں ایک تختی رکھی تھی جس میں ان سات اللہ کے نیک بندوں کے نام لکھے تھے۔ اُس تختی سے ملان کیا تو یہ وہی حضرات نکلے۔ یہ واقعہ دنیا کی رونق اور اس کی تباہی کے بعد بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا فی نفسہ مطلوب نہیں، انسان کا عمل اس دنیا میں آخرت کو پیش نظر رکھ کر ہونا چاہئے، پس جہاں حلال وحرام میں تعارض ہو وہاں حلال کو ترجیح دے، جہاں جائز اور ناجائز ہو وہاں

جائز کو اختیار کرے، چاہے گھاٹا ہو۔

خلاصۂ کلام: آج کل ہر جگہ فتنے ہی فتنے ہیں اور حرام سے بچنا بہت مشکل ہو رہا ہے، اور لوگوں میں پیسوں کی محبت اور خواہش اتنی ہے کہ ناجائز اور حرام سے آدمی بچنا چاہتا بھی نہیں، لہٰذا میرے بھائیو! اس مضمون کو یاد رکھو کہ ہم اس دنیا میں عمل دیکھنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور اس دنیا کو ہمیشہ نہیں رہنا، اگر دنیا اور آخرت میں تعارض ہو جائے تو آدمی کو اصحابِ کہف کی لائن اختیار کرنی چاہئے، اسی وجہ سے سورۂ کہف کے پہلے اور آخری رکوع کے بارے میں حدیثوں میں آیا ہے کہ اگر اسے پڑھتے رہو گے تو دجال کے فتنوں سے محفوظ رہو گے، دجالی فتنوں سے محفوظ رہنے کی بات اس وجہ سے کہی گئی ہے کہ ان دو رکوع میں یہی حقیقت سمجھائی گئی کہ یہ دنیا تو اس لئے ہے کہ اس سے آدمی اپنی آخرت بنائے، اور بہتر سے بہتر عمل کرے، اور جب دنیا وآخرت میں ٹکراؤ ہو تو آدمی آخرت کو ترجیح دے، اور دنیا کو پس پشت ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ اس مضمون کو یاد رکھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔ **وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین۔**

◆

۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قیامت کے دن ذرّہ ذرّہ کا حساب ہوگا

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا، وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾

انسان کی تین زندگیاں

بزرگو اور بھائیو! انسان کی زندگیاں تین ہیں: اس دنیا میں آنے سے پہلے کی زندگی: پڑھنے کی زندگی ہے، پھر یہ دنیا کی دوسری زندگی ہے، یہ پڑھے ہوئے پر عمل کرنے کی زندگی ہے، پھر ایک زندگی پھل کھانے کے لئے آگے آرہی ہے۔ ہماری پہلی جو زندگی تھی اس میں صرف ہماری روحیں تھیں، جسم نہیں تھے۔

روح کیا چیز ہے؟

جسم کے ساتھ اپنے وجود کو تو ہم سمجھتے ہیں، لیکن جسم کے بغیر صرف روح جو اصل انسان ہے وہ کیا چیز ہے؟ یہ اُن تین سوالوں میں سے ایک سوال ہے جو مکہ کے مشرکین نے مدینہ کے یہودیوں سے مشورہ کر کے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ یہ سچے نبی ہیں یا جھوٹے؟ مکہ سے باقاعدہ مدینہ آدمی بھیجے گئے تھے، وہاں یہودی آباد تھے، وفد نے اُن سے کہا کہ تمہیں اللہ کی کتابوں کا بہت زیادہ علم ہے۔

تورات جیسی بھی تھی اس کا علم یہودیوں کو عیسائیوں سے زیادہ تھا، اور آج بھی یہودی عیسائیوں سے زیادہ ان کتابوں کا علم رکھتے ہیں۔ عیسائی تو اپنی کتابوں کا بھی علم نہیں رکھتے،

لیکن یہودیوں میں آج بھی بڑے بڑے اپنے مذہب کے جاننے والے ہیں، اور اپنا مذہب ہی نہیں، اسلام کے بھی جاننے والے ہیں، یورپ اور امریکہ کی تمام یونیورسٹیوں میں جو اسلامک اسٹڈیز ہیں ان میں ننانوے فیصد یہودی پروفیسر ہیں، اور وہ مستشرقین جنھوں نے اسلام پر اعتراضات کئے ہیں: وہ سب یہودی تھے، عیسائی تو شاید و باید ہی ملے گا، ظاہر سی بات ہے کہ کسی مذہب کے خلاف اس وقت تک نہیں لکھا جا سکتا جب تک اس مذہب سے پوری واقفیت نہ ہو۔

علاوہ ازیں: ایک یہودی ہے جس کا نام ہے: ونسنک (Wensinch) اس نے حدیثوں کا ایک انڈیکس **المُعْجَمُ الْمُفَهْرَس لألفاظ الحديث الشريف** تیار کیا ہے، یہ حدیث کی چودہ کتابوں کا انڈیکس ہے۔ آج کوئی دار العلوم ایسا نہیں جہاں اس کتاب سے استفادہ نہ کیا جا رہا ہو، اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے مسند احمد چودہ مرتبہ پڑھی ہے، آج دنیا میں کوئی شیخ الحدیث بھی ایسا ملنا مشکل ہے جو یہ کہے کہ میں نے مسند احمد پوری ایک مرتبہ پڑھی ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

بہر حال یہودی بڑے بڑے عالم ہوتے رہے ہیں، چنانچہ مکہ کا وفد یہودیوں کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ تم لوگ بڑے عالم ہو، ہمارے یہاں ایک نبی ظاہر ہوئے ہیں جو نبوت کا دعوی کرتے ہیں، ہم ان کو جانچنا چاہتے ہیں، تم ہمیں کچھ سوالات دو۔

یہودیوں نے تین سوال دیئے:

ایک: وہ چند نوجوان جو بادشاہ کے ڈر سے پہاڑوں میں نکل گئے تھے اور ایک غار میں جا کر سو گئے تھے اور کئی سال تک سوتے رہے تھے، وہ کون تھے؟ ان کا کیا واقعہ ہے؟ کیوں بھاگے تھے؟ کہاں چھپے تھے؟ کتنے دن سوئے تھے؟ —— قرآن میں جب سے یہ واقعہ نازل ہوا ہے: عام ہو گیا ہے، لیکن سوال کے وقت یہودیوں کے علاوہ اس واقعہ کو کوئی نہیں جانتا تھا۔

دوسرا سوال: ایک بادشاہ گذرا ہے جو مشرق میں جہاں تک آبادی تھی وہاں تک گیا تھا، اور مغرب میں بھی جہاں تک آبادی تھی وہاں تک گیا تھا: یہ بادشاہ کون تھا؟

تیسرا سوال: جسم کے بغیر روح کیا چیز ہے؟

اوران یہودیوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر وہ سچے نبی ہیں تو ان تین سوالوں میں سے دو کے جواب دیں گے، ایک کا جواب نہیں دیں گے۔ چنانچہ اس وفد نے واپس آکر حضور اکرم ﷺ سے یہ تین سوال کئے، نبی کریم ﷺ نے ان سے کہا: میں کل تمہیں ان کا جواب دوں گا، یہ خیال کرتے ہوئے کہ جب یہ سوال انھوں نے مجھ سے پوچھے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ مجھ پر بھیج دیں گے۔ اور آپؐ ان شاء اللہ کہنا بھول گئے، پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ پندرہ دن تک حضرت جبرئیل علیہ السلام نہیں آئے، ان پندرہ دنوں میں مکہ میں بہت شور مچا، حضور پر پھبتیاں کسی گئیں، شانِ اقدس میں گستاخیاں کی گئیں، آپؐ کو بڑا صدمہ ہوا۔ پندرہ دن بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، تینوں سوالات کے جوابات لائے اور تاخیر کی وجہ بھی لائے: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا، اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ﴾ الآیۃ (الکہف: ۲۳و۲۴) چنانچہ سورۂ کہف کے شروع میں غاروالوں کا واقعہ دوڈھائی رکوع میں بیان کیا، اوراسی سورت کے ختم پر ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا، اور روح کے بارے میں جواب اس سے پہلے والی سورت (بنی اسرائیل) میں آیا ہے۔

فرمایا: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ لوگ آپؐ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ صرف انسان کی روح نہیں، کسی بھی حیوان کی روح، اور وہ بھی جسم کے بغیر: ﴿قُلِ: الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ آپؐ جواب دیں: روح: میرے پروردگار کے حکم سے ایک چیز ہے۔ اور قرآن میں جگہ جگہ اللہ کی شان یہ بیان کی گئی ہے: ﴿وَاِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ اللہ کی قدرت یہ ہے کہ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہتے ہیں ہوجا: پس وہ ہوجاتا ہے، بلکہ اللہ کو ’’ہوجا‘‘ بھی نہیں کہنا پڑتا، اللہ کے ارادے ہی سے وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔ یہ جو اللہ کے ’’ہوجا‘‘ کہنے سے کوئی چیز وجود میں آتی ہے اس کا نام روح ہے۔

اور کوئی کہے کہ ذرا کھول کر سمجھاؤ؟ تو فرمایا: ﴿وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾: اور نہیں دیئے گئے تم علم میں سے مگر تھوڑا سا، یعنی اس سے زیادہ تمہیں روح کی حقیقت سمجھانا مشکل ہے، کیونکہ ہر مسئلہ کو سمجھنے کے لئے علم کا ایک مستویٰ (Level) چاہئے، اگر وہ مستویٰ ہے تو وہ مسئلہ اسے سمجھایا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔ جیسے حساب کے بڑے باریک مسئلے ہیں اور پروفیسر

کالج میں طلبہ کو یہ مسئلے سمجھا بھی دیتے ہیں، مگر کندۂ ناتراش کو وہ مسائل سمجھانا مشکل ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ پروفیسر مسئلہ سمجھانے کے قابل نہیں! سمجھانے کے قابل ہے اور کلاس میں وہ سمجھاتا بھی ہے، مگر اس کندۂ ناتراش کو نہیں سمجھا سکتا، اس کے پاس علم کا وہ مستویٰ نہیں جو مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ سائنس (علوم طبیعیات) کی تعلیم طلبہ کو کھول کھول کر سمجھائی جاتی ہے لیکن ایک ہل چلانے والے کو آپ وہ باتیں سمجھانا چاہیں تو کیسے سمجھا دیں گے؟ اور کیسے وہ سمجھ سکتا ہے؟ غرض کوئی بھی مسئلہ ہو اس کو سمجھنے کے لئے علم کی ایک سطح چاہئے۔

اس کی مثال: کسی بھی چیز کو دیکھنے کے لئے آنکھ میں قدرت چاہئے، اگر قدرت ہے تو آپ دیکھ سکتے ہیں، نہیں ہے تو نہیں دیکھ سکتے، یہ پنکھے چل رہے ہیں اور میری آنکھ ان کو دیکھ رہی ہے، کیونکہ میری آنکھ میں ان کو دیکھنے کی طاقت ہے، مگر اس ہال میں ہوا بھری ہوئی ہے اور ہوا مرئی ہے، وہ دِکھنے والی چیز ہے، لیکن وہ مجھے نظر نہیں آتی، کیونکہ میری آنکھ میں اس کو دیکھنے کی طاقت نہیں۔ اور جیسے جنات: ہم کو نظر نہیں آتے، کیونکہ جنات ہم سے لطیف ہیں اور جنات سے لطیف زمینی فرشتے ہیں۔ انسان، جنات اور زمینی فرشتے: سب آگ، پانی، ہوا اور مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، پھر انسان میں مٹی غالب ہے، اور مٹی کثیف ہے، اس لئے انسان بھی کثیف ہے۔ اور جنات میں آگ غالب ہے اور آگ مٹی سے لطیف ہے، اس لئے جنات ہم سے لطیف ہیں، اور زمینی فرشتے ان چاروں عناصر کی بھاپ سے بنے ہیں اور بھاپ آگ سے لطیف ہے، اس لئے زمینی فرشتے اور بھی لطیف ہیں، اسی وجہ سے ہمیں نہ جنات نظر آتے ہیں نہ فرشتے۔ اور جنات کو ہم نظر آتے ہیں مگر فرشتے نظر نہیں آتے اور زمینی فرشتوں کو جنات اور انسان دونوں نظر آتے ہیں۔ بہر حال جو کثیف ہے اسے لطیف نظر نہیں آئے گا اور جو لطیف ہے اسے کثیف نظر آئے گا۔

روح ایک لطیف چیز ہے، جب وہ جسم کے ساتھ ملتی ہے تو کثیف ہو جاتی ہے چنانچہ اب آپ کو بکری نظر آئے گی، گھوڑا نظر آئے گا، چوہا نظر آئے گا، لیکن جب وہ جسم سے الگ ہوگی تو لطیف ہو جائے گی اور نظر نہیں آئے گی، لیکن روح کو ہم نظر آئیں گے کیونکہ ہم کثیف ہیں۔

بہر حال دیکھنے کے لئے آنکھ میں طاقت چاہئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور

مکتبہ حجاز دیوبند

پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تو ان کا اشتیاق اتنا بڑھا کہ درخواست کر بیٹھے: ﴿رَبِّ أَرِنِيْ أَنْظُرْ إِلَيْكَ﴾: پروردگار ایک جلوہ دکھا دیجئے۔ اللہ کی طرف سے جواب ملا: ﴿لَنْ تَرَانِيْ﴾: تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ نہیں کہا کہ میں نہیں دکھ سکتا۔ اللہ مرئی ہیں دکھ سکتے ہیں اور جنت میں جنتی دنیا کے ہفتہ کی مقدار میں اللہ کا دیدار کریں گے۔ معلوم ہوا کہ اللہ دکھ سکتے ہیں مگر اس دنیا میں ہماری آنکھوں میں اللہ کو دیکھنے کی طاقت نہیں، پس جیسے کسی چیز کو دیکھنے کے لئے آنکھ میں طاقت چاہئے، اسی طرح کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے بھی علم کا ایک مستویٰ چاہئے، اگر وہ مستویٰ حاصل ہے تو مسئلہ سمجھ سکتے ہیں ورنہ نہیں، پس قرآن نے مجمل جواب دیا کہ آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ایک چیز ہے، اس سے زیادہ تم نہیں سمجھ سکتے۔

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ہمارا وجود تین جہانوں میں ہے۔ ایک جہان وہ ہے جس میں آدمؑ کی پیٹھ سے تمام انسانوں کی ارواح نکالی گئیں تھیں، اس جہان کا نام عہد الست ہے، اس کو عالم ارواح بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ جہان پڑھنے کے لئے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کر کے ان کو اپنا دیدار کرایا اور اپنے آپ کو دکھا کر اپنی پہچان کرائی، پھر اللہ نے پوچھا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟﴾ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ سب نے بیک زبان جواب دیا: ﴿بَلٰى!﴾ کیوں نہیں، بیشک آپ ہی ہمارے پروردگار ہیں کیونکہ جو چیز آنکھوں سے دیکھی تھی اس کا انکار کیسے کرتے!

پھر اُس جہان سے ہم اِس جہان میں آئے، اور وہ پروردگار جس کی ربوبیت کا ہم اقرار کر کے آئے ہیں اس کی مرضی کے مطابق ہمیں اِس دنیا میں زندگی گذارنی ہے۔ اور اِس جہان میں اللہ تعالیٰ اپنی تجلی فرمائیں اور سب کو اپنی پہچان کرائیں یہ بات ممکن نہیں، یہاں انسان سر کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا، اور عہدِ الست میں جو اللہ کو دیکھا تھا وہ روح کی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور روح کی آنکھیں آج بھی اللہ کی معرفت حاصل کر سکتی ہیں، اللہ کے نیک بندے آج بھی اللہ کو پہچانتے ہیں اور ایسا پہچانتے ہیں جیسا مشاہدہ سے پہچانا جاتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پہچانتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کو اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جیسے ایک فرماں بردار اور اطاعت شعار بیٹا جس نے اپنے باپ کو جان لیا ہے اور

پہچان لیا ہے، وہ ہمیشہ اپنے باپ کی مرضی کے مطابق زندگی گذارتا ہے، اس کی حرکات وسکنات ایسی ہوتی ہیں جن سے باپ خوش ہوجاتا ہے، ایسی نہیں ہوتی جن سے باپ ناراض ہوجائے، پس جب اللہ کو ہم پہچان چکے اور پہچان کر ہم اس دنیا میں آئے تو ہمیں وہ کام کرنے چاہئیں جن سے مولیٰ خوش ہو، ہمیں کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہئے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کن کاموں سے راضی ہوتے ہیں اور کن کاموں سے ناراض ہوتے ہیں یہ سب باتیں اللہ نے اپنے نبیوں اور کتابوں کے ذریعہ انسانوں کو بتادی ہیں، کوئی چیز چھپا کر نہیں رکھی۔

پھر ایک وقت آئے گا کہ ہماری یہ دنیا کی زندگی ختم ہوجائے گی، آگے اگلی زندگی آرہی ہے اور وہ زندگی بہت لمبی ہے اور بہت طاقت ور ہے۔ اِس وقت ہماری جو باڈی ہے یہ باڈی ہماری اگلی زندگی میں کام نہیں آسکتی، چنانچہ اِس باڈی کو ختم کردیا جائے گا، تحلیل کردیا جائے گا، زمین کے حوالہ کردیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ﴾ ہم نے زمین سے تمہیں پیدا کیا: ﴿وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ﴾ اور اسی زمین میں ہم تمہیں واپس کردیں گے: ﴿وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى﴾ پھر ایک مرتبہ اور ہم تمہیں مٹی سے نکالیں گے۔ جیسا پہلی مرتبہ مٹی سے پیدا کیا ہے دوسری مرتبہ بھی اِس مٹی سے پیدا کریں گے۔

البتہ پہلی مرتبہ پیدا کرنے کی شکلیں اور ہیں اور دوسری مرتبہ کی شکلیں اور ہیں۔ پہلی مرتبہ کی شکل یہ ہے کہ زمین سے کھانے پینے کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، انسان انہیں کھاتا ہے، ان سے خون بنتا ہے، خون سے مادّہ بنتا ہے، پھر دو مادّے رحم مادر میں پہنچ کر ملتے ہیں، اس سے انسان کی باڈی بنتی ہے، پھر اس میں روح ڈالی جاتی ہے، پھر ایک وقت تک رحم مادر میں رہ کر انسان دنیا میں آتا ہے، مگر قیامت کے دن جب دوبارہ جسم بنے گا تو اس طرح نہیں بنے گا۔ قرآنِ کریم نے جگہ جگہ دوسری مرتبہ جسم بننے کا طریقہ بتایا ہے کہ جیسے اُجڑی ہوئی اور مردہ زمین ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ بارش برساتے ہیں اور آناً فاناً گھاس اگ آتی ہے اور سارا جنگل گھاس سے بھر جاتا ہے۔ اسی طرح اجسام دوبارہ بنیں گے۔ بس اتنا ہی ہم سمجھ سکتے ہیں اس سے زیادہ تفصیل جب ہم پیدا ہوں گے: سمجھ میں آئے گی۔

اور طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قیامت کے دن ہر جسم تینتیس (۳۳) ہاتھ لمبا ہوگا، اور جب اتنا لمبا ہوگا تو موٹا بھی اسی کے بقدر ہوگا اور قُویٰ بھی اسی کے بقدر طاقت ور ہونگے۔

پھر تیسری زندگی شروع ہوگی، یہ نتیجہ حاصل کرنے کی زندگی ہے۔ میں نے جو آیت خطبہ میں پڑھی ہے اس میں اسی رزلٹ کا بیان ہے: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾: ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازوئیں رکھیں گے اور ہر عمل خواہ اچھا ہو یا برا: تولا جائے گا ﴿فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا﴾ پس کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ رہا گناہ معاف کردینا تو وہ ظلم نہیں ہے، وہ کرم ہے، احسان ہے، اور وہ ہوگا۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بے شمار بندوں کے گناہ معاف کردیں گے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾: اللہ تعالیٰ ایک گناہ (شرک) تو ہرگز معاف نہیں کریں گے اور اس کے علاوہ جتنے گناہ ہیں وہ جس کے لئے منظور ہوگا اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے۔ مگر ہر گناہ گار کے گناہ معاف نہیں ہونگے، اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں گے معاف کریں گے۔

یہاں بعض لوگ کہتے ہیں: ہم گناہ نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ کس کو بخشیں گے؟ ہم گناہ کریں گے تبھی اللہ کی صفتِ غفاریت ظاہر ہوگی، یہ بے وقوفی کی بات ہے۔ جب شہر میں کوئی وبا آتی ہے تو سارے انسان وبا کے شکار نہیں ہوجاتے، کچھ ہوتے ہیں اور بہت سوں کو کچھ نہیں ہوتا، پس کیا یہ وبا ان کے حق میں نہیں آئی؟ ان کے حق میں بھی وبا آئی ہے، پھر اس نے ان پر اثر کیوں نہیں ڈالا؟ اس لئے کہ ان کے جسم میں دفاع کی طاقت ہے، اس نے وبا کو دفع کردیا اور جس میں دفاع کی طاقت کمزور ہے وہ وبا کی زد میں آگیا۔ یہ قدرت کا نظام ہے، جیسے دس بوریاں ہیں اور وہ گیہوں سے بھری ہوئی ہیں، ان سب کو اوپر تلے رکھو، کوئی بوری دبے گی نہیں، سب سے نیچے جو بوری ہے اور اس کے اوپر نو بوریاں ہیں وہ بھی دبتی نہیں، کیونکہ وہ بوری بھری ہوئی ہے، اندر مدافعت کی طاقت ہے۔ اور اگر بوری آدھی بھری ہوئی ہو اور اُسے اِن دس بوریوں کے بیچ میں رکھ دیا جائے تو فوراً دب جائے گی، کیونکہ اندر

مدافعت کی طاقت نہیں۔ اسی طرح اگر ہمارے اندر قوتِ مدافعت ہے تو باہر کی وبا اثر انداز نہیں ہوتی، اور اگر مدافعت کی طاقت کمزور ہے تو وبا اثر انداز ہو جاتی ہے۔ پس کیا اس اعتماد پر کوئی زہر کھاتا ہے کہ میرے اندر جو قوتِ مدافعت ہے وہ زہر کے اثر کو دفع کر دے گی؟ کوئی نہیں کھاتا، ہر آدمی یہ سوچتا ہے کہ معلوم نہیں میری یہ قوت مدافعت کام کرے یا نہیں؟ اگر نہ کیا تو میں مر جاؤنگا، پس جب قوتِ مدافعت پر بھروسہ کر کے کوئی زہر نہیں کھاتا تو اللہ کی رحمت پر بھروسہ کر کے گناہ کیوں کرتے ہو؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں گے گناہ معاف کریں گے اور جن کے لئے اللہ تعالیٰ چاہیں گے ان میں تمہارا نام بھی ہوگا اس کی کیا گارنٹی ہے؟ کسی کے پاس نہیں ہے، پھر کس برتے پر گناہ کرتے ہو۔

بہر حال اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بے شمار بندوں کو معاف فرمائیں گے اور یہ ظلم نہیں ہوگا۔ پھر ظلم کیا ہے؟ ظلم دو چیزوں کا نام ہے: ایک: نیکی کا اجر نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ ظلم نہیں ہوگا، کوئی نیک کام کرے اور اللہ تعالیٰ اس پر اجر نہ دیں ایسا نہیں ہوگا، ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَايُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾: اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ دوسری چیز: ناکردہ گناہ کی سزا دینا ظلم ہے، گناہ کیا نہیں اور مرغا بنا دیا، اس کا بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گذر نہیں، ان کے یہاں انصاف کی ترازو رکھی جائے گی اور پورے انصاف سے اجر ملے گا اور کسی بے گناہ کی گردن نہیں ناپی جائے گی۔ اور ایک نیکی کا اجر دُوگنا، سہ گنا بلکہ دس گنا دینا یہ بھی ظلم نہیں، یہ کرم و احسان ہے اور اللہ تعالیٰ کا آخرت میں بے شمار کرم و احسان ہوگا۔

﴿وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا﴾: اور اگر کسی کا اچھا برا عمل رائے کے دانے کے برابر ہوگا تو اس کو بھی ہم لا کر ترازو میں رکھیں گے۔ سورۂ زلزال میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ﴾: جس نے ذرہ بھر کوئی نیک عمل کیا: وہ قیامت کے دن اس کو دیکھ لے گا۔ ذرہ کیا چیز ہے؟ روشن دان سے کمرہ میں دھوپ آرہی ہو اور آپ قالین پر ہاتھ ماریں تو آپ کو دھوپ میں باریک گرد اڑتی نظر آئے گی، وہ گرد سایہ میں نظر نہیں آتی، دھوپ ہی میں نظر آتی ہے، یہی ذرے ہیں۔ پس آیتِ کریمہ کا

مطلب یہ ہے کہ اتنا چھوٹا عمل بھی اگر کسی نے کیا ہے تو وہ اس کو دیکھ لے گا۔ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهٗ﴾ اور اگر کسی نے ذرّہ بھر بُرا عمل کیا ہے تو وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

ان آیات کا سبق یہ ہے کہ ہر نیکی کا کام کرو چاہے وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ یہ چھوٹے عمل بھی نجات کا سبب بن سکتے ہیں، حدیث میں ہے کہ ایک راستہ میں کانٹے دار ٹہنی تھی —— کسی نے کاٹ کے ڈالی ہوگی یا درخت ہی ایسا ہوگا —— ایک بندہ نے وہ ٹہنی وہاں سے دور کردی، تو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جزائے خیر دی اور اتنے عمل پر اس کی بخشش کردی۔ اور دوسری طرف ہر برائی کو برائی سمجھو اور ہر برائی سے بچو چاہے وہ چھوٹی ہو۔ گھاس کے ڈھیر کو پھونکنے کے لئے ایک چنگاری کافی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بلی کو باندھ دیا تھا —— پریشان کرتی ہوگی —— وہ بلی بیچاری بھوکی پیاسی مرگئی، اللہ تعالیٰ نے صرف اس گناہ کی وجہ سے اس عورت کو جہنم میں ڈال دیا۔ بہرحال رائے کے دانے کے برابر بھی اگر اچھا برا عمل ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کو حاضر کریں گے اور اس کا بدلہ دیں گے۔

اتنا چھوٹا عمل کیسے حاضر کیا جائے گا؟ فرمایا: ﴿وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾: اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں! یعنی حساب کون لے رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ لے رہے ہیں، یہ تمام ذرات اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، پھر ان ذروں کو میزانِ عمل میں لے لانا اللہ تعالیٰ کے لئے کیا مشکل ہے؟

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ قیامت کے دن ذرّہ ذرّہ کا حساب ہوگا، پس عمل کی یہ زندگی غفلت میں نہ گذاری جائے، ہر نیکی کی جائے، چھوٹی نیکی کو بھی چھوٹا نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ قطرہ قطرہ مل کر دریا ہوجاتا ہے، اور ہر گناہ سے کنارہ کش رہا جائے، معمولی گناہ کو بھی معمولی نہ سمجھا جائے، معلوم نہیں کونسی چنگاری لاوا پھونک دے، اللہ تعالیٰ اس مضمون کو سمجھنے کی اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

وماذٰلك على الله بعزيز! والحمد لله رب العالمين.

◆ ◆ ◆

مکتبہ حجاز دیوبند

۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا، فَأَحْيَاكُمْ، ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ، ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ، ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ آیت پہلے پارے کے تیسرے رکوع کی ہے، پہلے اس کا ترجمہ اور مطلب سمجھ لیں: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾: تم اللہ کا انکار کیسے کرتے ہو؟ دنیا میں انکار کرنے والے دو قسم کے ہیں: ایک: وہ لوگ ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، مگر عبادت صرف اللہ کی نہیں کرتے، دوسروں کی بھی کرتے ہیں، یہ مشرک کہلاتے ہیں۔ مشرک یعنی عبادت میں دوسروں کو اللہ کا ساجھی بنانے والا۔ دوم: وہ لوگ ہیں جو اللہ کو مانتے ہی نہیں یعنی کافر ہیں، کافر کے معنی ہیں: انکار کرنے والا۔ آج بھی دنیا میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو کہتے ہیں: اس یونیورسل (عالَم، جہاں) کے پیچھے کوئی مائنڈ (دماغ، قوت) نہیں، دنیا آٹومیٹک چل رہی ہے۔ جس رکوع کی یہ آیت ہے اس کے شروع میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو، دوسروں کو عبادت میں شریک مت کرو، پھر رکوع کے ختم پر یہ آیت ہے: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا﴾ اللہ کا تم کیسے انکار کرو گے جبکہ تم نیست تھے، کچھ بھی نہیں تھے ﴿فَأَحْيَاكُمْ﴾ پس اللہ نے تمہیں زندگی بخشی ﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ پھر اللہ تمہیں موت دیں گے ﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ پھر اللہ تمہیں زندہ کریں گے ﴿ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ پھر تمہیں اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اس آیت میں زندگی کے مراحل کا تذکرہ ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہم اس دنیا میں نئے پیدا ہوئے ہیں یعنی عدم سے وجود میں آئے ہیں، حالانکہ پیدا: فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: ظاہر ہونا۔ پردے کے پیچھے کوئی چیز ہو اور پردہ ہٹا دیا جائے تو اس کو ظاہر ہونا کہتے ہیں۔ عدم سے وجود میں آنا: پیدا ہونے کے معنی نہیں ہیں۔ جب بھی کوئی بچہ دنیا میں آتا ہے تو ہم کہتے ہیں: بچہ پیدا ہوا یعنی عدم سے وجود میں آیا، حالانکہ وہ عدم سے وجود میں آج نہیں آیا، وہ تو چار مہینے پہلے ماں کے پیٹ میں وجود میں آچکا ہے اور آج جو دنیا میں آیا ہے تو یہ عدم سے وجود میں آنا نہیں ہے، بلکہ ظاہر ہونا ہے، بلکہ ماں کے پیٹ میں بھی انسان عدم سے وجود میں نہیں آیا، انسان اس سے بہت پہلے عالم ارواح میں عدم سے وجود میں آچکا ہے۔ لہٰذا مراحل حیات کو سمجھو!

مکتبہ حجاز دیوبند

مراحلِ حیات:

اس آیت سے دو آیتوں کے بعد پورے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری زمین سے مٹھی بھری، اس کا گارا بنایا، پھر پتلا بنایا، اور دھوپ میں رکھ دیا جب وہ بجنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونکی۔ پھر حدیث اور قرآن دونوں میں یہ مضمون ہے کہ حضرت آدم کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی دائیں پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو ان کی قیامت تک کی تمام نیک اولاد نکل آئی، پھر بائیں پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو ان کی قیامت تک کی بری اولاد نکل آئی۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہی ساری روحیں دھڑ دھڑ نکلی ہونگی۔ ایسا نہیں ہوا تھا، سورۂ اعراف میں یہ مضمون ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِىْٓ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ (اعراف: ۱۷۲): یاد کرو جب لیا تیرے پروردگار نے آدم کی اولاد کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو۔ آیت میں آدم کے بیٹوں کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو لینے کا تذکرہ ہے، یہ آدھا مضمون ہے جو قرآن میں ہے، باقی آدھا مضمون حدیث میں ہے۔ آیت کو جب حدیث سے ملائیں گے تو مضمون مکمل ہوگا۔

روحوں کے نکلنے کی صورت کیا ہوئی؟

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ہاتھ پھیرا تو حضرت آدم علیہ السلام کی جو صلبی اولاد تھی وہ ان کی پیٹھ سے نکل آئی، پھر اس اولاد کی پیٹھ سے ان کی صلبی اولاد نکلی، پھر ان کی پیٹھ سے ان کی اولاد نکلی۔ جس طرح دنیا میں انسان پیدا ہو چکے ہیں، پیدا ہو رہے ہیں اور پیدا ہونگے اسی ترتیب سے ساری روحیں وجود میں آ گئیں، حدیث میں ہے کہ اس وقت انسان **كَأَمْثَالِ الذُّر**: بھوری چیونٹیوں کی طرح تھے، جو بہت چھوٹی ہوتی ہے اور بہت زور سے کاٹتی ہے۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ یہ انسانوں کی روحیں تھیں اور چیونٹی جیسی شکل ان کا مثالی بدن تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے سامنے تجلی فرمائی، اپنا دیدار کرایا، اپنی پہچان کرائی، پھر جب انسانوں نے اللہ کو پہچان لیا تو ان کا امتحان لیا اور پرچے میں صرف ایک سوال آیا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾: کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: ﴿بَلٰى!﴾ کیوں نہیں! یعنی اگر آپ ہمارے پروردگار نہیں تو پھر اور کون ہمارا پروردگار ہے، سب نے یہی جواب دیا کیونکہ اللہ نے ان کو اپنا دیدار کرایا تھا، اب کوئی کیسے انکار کرتا؟

مکتبہ حجاز دیوبند

اخذ میثاق کے بعد روحوں کا مستقر:

اس کے بعد کیا ہوا؟ بخاری میں حدیث ہے: **الْأَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ، فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ، وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ**: پھر اللہ نے ان روحوں کو عالم ارواح میں گروپ بنا کر رکھ دیا، جیسے فوج کے گروپ ہوتے ہیں، ایسے ہی وہاں گروپ بنا کر ساری روحیں رکھ دی گئیں۔ الأرواح جنود مجندة کا یہی مطلب ہے۔ پھر وہاں جن روحوں میں تعارف ہو گیا، جان پہچان ہو گئی، ان میں اس دنیا میں آنے کے بعد ائتلاف ہوتا ہے، میل ملاپ ہوتا ہے، اور اگر عالم ارواح میں اوپرا پن رہا تو اس دنیا میں آنے کے بعد ان کے درمیان اختلاف ہوتا ہے، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ماں کے دو بیٹے ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں۔ اور ایک ایران کا دوسرا توران کا: سر راہ ملتے ہیں اور ایسے دوست بن جاتے ہیں جیسے نسلوں سے ایک خاندان کے ہوں۔ مجھے اس حدیث سے یہ سمجھانا ہے کہ جب عہدِ الست میں امتحان

ہو گیا، اور سب نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرلیا تو پھر روحوں کو پیٹھوں میں واپس نہیں کیا گیا بلکہ ان کو عالم ارواح میں خاص ترتیب سے رکھ دیا گیا۔

آدم علیہ السلام کی جنت میں کوئی اولاد نہیں ہوئی

پھر آدم علیہ السلام اور دادی حواء رضی اللہ عنہا جب تک جنت میں رہے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کتنے دن رہے؟ اللہ جانیں! ہزار سال بھی ہو سکتے ہیں، دس ہزار سال بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم کتنے سال رہے؟ لیکن اتنی بات ہم جانتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کو جب جنت میں داخل کیا گیا تو ان سے فرمایا گیا تھا کہ فلاں درخت کے قریب مت جانا ﴿لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ ورنہ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گے ﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ کسی خاص درخت سے روک دیا گیا تھا۔ وہ کونسا درخت تھا؟ اللہ جانے کونسا تھا! ہمیں اس کی تعیین کر کے کیا کرنا ہے؟ پھر قرآن میں ہے: ﴿فَنَسِيَ اٰدَمُ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾: حضرت آدمؑ اللہ کے اس حکم کو بھول گئے۔ آدمی دو دن میں بات نہیں بھول جایا کرتا، پھر اللہ کی بات اور بندہ بھول جائے اور بندہ بھی اللہ کا نبی! عرصۂ دراز گذرے گا تبھی بھولے گا۔ پس اس آیت میں اشارہ ہے کہ ایک لمبے وقت تک دادا، دادی جنت میں رہے، لیکن جب تک جنت میں رہے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اور اِن کی ساری اولاد کا اس زمین سے پیدا کیا جانا مقدر تھا، اللہ نے طے کر دیا تھا، پھر جنت میں اولاد کیسے ہوتی؟

حضرت آدمؑ کیا چیز بھولے تھے؟

حضرت آدم علیہ السلام یہ نہیں بھولے تھے کہ اللہ نے مجھے اس درخت کے کھانے سے منع کیا ہے، بلکہ یہ بھولے تھے کہ اگر درخت کے قریب جاؤ گے تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ابلیس نے آدمؑ سے کہا تھا: ﴿هَلْ اَدُلُّكُمَا عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ اے آدم! اللہ نے تمہیں فلاں درخت کے قریب جانے سے جو منع کیا ہے: جانتے ہو کیوں منع کیا ہے؟ آدمؑ نے کہا: مجھے جاننے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ نے

کہا ہے کہ قریب مت جاؤ، میں نہیں جاتا۔ ابلیس نے کہا: سنو! تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے تمہاری پیدائش سے پہلے فرشتوں کے سامنے یہ بات ظاہر کی تھی کہ مجھے زمین میں خلیفہ بنانا ہے، وہ خلیفہ تم ہی بنائے گئے ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ چند دن کے بعد تمہیں جنت سے زمین میں بھیج دیں گے۔ لیکن یہ درخت ایسا ہے کہ اگر تم اسے کھالو تو ہمیشہ جنت میں رہو گے، یہ "امر" درخت ہے۔ اس کو کھا کر تم اللہ کی بارگاہ سے کبھی دور نہیں ہوؤ گے، اس وجہ سے اللہ نے اس درخت کے قریب جانے سے منع کیا ہے، کمبخت نے الٹی پٹی پڑھائی، وہ درخت "امر" نہیں تھا، "مر" تھا۔ آدمؑ دھوکہ کھا گئے اور ان سے لغزش ہوگئی ﴿نَسِیَ آدَمُ﴾ میں جو بھولنے کی بات ہے وہ یہی ہے۔ ابلیس کے پٹی پڑھانے سے وہ "دور کرنے والے" درخت کو "قریب کرنے والا" درخت سمجھ بیٹھے۔

انبیاء سے گناہ نہیں ہوتا، زلّت ہوتی ہے:

بزرگو اور بھائیو! یہاں یہ اہم مضمون بھی سمجھ لیں کہ انبیاء سے کوئی گناہ نہیں ہوسکتا، نہ چھوٹا نہ بڑا، نہ نبوت سے پہلے نہ نبوت کے بعد۔ انبیاء معصوم ہوتے ہیں، معصوم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہیں اس وجہ سے ان سے کوئی معصیت سرزد نہیں ہوسکتی، البتہ زلت ہوسکتی ہے۔ **معصیة:** کے معنی ہیں: نافرمانی، بڑے کے فرمان کے خلاف چلنا۔ انبیاء ایسا نہیں کرسکتے، کیونکہ اگر وہی اللہ کے فرمان کے خلاف چلیں گے تو پھر کون اللہ کے فرمان پر چلے گا؟ اور **زَلَّة:** کے معنی ہیں: پھسلنا، آدمی پھسلن کی جگہ پر چل رہا ہو، اور بڑی احتیاط سے چل رہا ہو، پھر بھی پھسل جاتا ہے، اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ معصیت میں گناہ کے ارادے سے آدمی گناہ کرتا ہے، جان بوجھ کر گناہ کرتا ہے اور زلت میں گناہ کا ارادہ نہیں ہوتا اور گناہ ہوجاتا ہے۔

بالفاظ دیگر: زلّت میں نیت اچھی ہوتی ہے، مگر بعد میں پتہ چلتا ہے کہ گناہ ہوگیا، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسفؑ کو ابا سے حفاظت کا وعدہ کرکے لے گئے، کنویں میں ڈالا اور ابا سے کہہ دیا کہ بھیڑیا کھا گیا۔ وہ دس بھائی تھے ان میں سب سے بڑے یہودا تھے، ان کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ وہ بعد میں نبی ہوئے ہیں، پس سوال یہ ہے کہ جو

آگے چل کر نبی بنا اس نے ایسا گناہ کیسے کیا؟ ایک تو بھائی کو کنویں میں ڈالا، پھر آکر جھوٹ بولا، ایسا آدمی نبی کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب قرآنِ کریم میں ہے۔ بھائیوں کی میٹنگ ہوئی تھی کہ یوسف کا کانٹا بیچ میں سے نکالنا چاہئے، کیونکہ ابا کی پوری توجہ یوسف کی طرف ہے، ہماری طرف ابا دیکھتے ہی نہیں —— اور ابا نبی ہیں، نبی کی توجہ جدھر ہوگی آئندہ اُسے نبوت ملے گی —— چنانچہ میٹنگ میں یہ بات آئی: ﴿اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ أَوِ اطْرَحُوْهُ أَرْضًا یَّخْلُ لَکُمْ وَجْهُ أَبِیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صالِحِیْنَ﴾ ایک نے کہا: یوسف کو مار ڈالو۔ یہودا نے کہا: مارومت، اُسے کہیں دور ملک میں بھیج دو، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ﴿یَخْلُ لَکُمْ وَجْهُ أَبِیْکُمْ﴾ تمہارے ابا کی پوری توجہ تمہاری طرف ہوجائے گی، نبوت جو اللہ کی رحمت ہے وہ تمہیں مل جائے گی۔ اور یہ جو یوسف کو دور ملک میں بھیجنے کا گناہ ہوگا تو توبہ تلا کر کے اللہ سے معافی مانگ لیں گے، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے ﴿وَتَکُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صَالِحِیْنَ﴾ یہاں نیت یہ تھی کہ یوسف کا کانٹا بیچ میں سے نکلے گا تو ابا جو پیغمبر ہیں ان کی توجہ ہماری طرف ہوجائے گی اور پھر اللہ کی رحمت اور نبوت کے ہم حقدار ہوجائیں گے، اسی کو زلّت کہتے ہیں، ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام سے جو عمل ہوا یہ زلّت تھی، کیونکہ ان کی نیت اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کی اور ہمیشہ جنت میں رہنے کی تھی اور اس میں کوئی برائی نہیں۔

﴿وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ کا مطلب

اور اگر کوئی کہے کہ قرآن میں ﴿وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ ہے یعنی آدمؑ نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی، حکم عدولی کی، پس وہ گمراہ ہوگئے۔

جواب: میرے بھائیو! اس آیت کو سمجھنے کے لئے پہلے لوگوں کے حالات سمجھو!

دنیا کا دستور ہے کہ چھوٹے بڑوں کے ساتھ القاب برتتے ہیں اور بڑے کی غلطی نہیں پکڑتے، مشہور مقولہ ہے: خطائے بزرگاں گرفتن خطا است: بڑوں کی غلطی پکڑنا غلطی ہے۔ اور بڑا چھوٹے کے ساتھ القاب نہیں برتتا، اور اگر چھوٹا بڑے کے سامنے کوئی غلطی کرتا ہے تو وہ اس کو بہت پھٹکارتا ہے، پھر اس کو گلے بھی لگالیتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام بندے ہیں، چھوٹے ہیں، اللہ: اللہ ہیں، آدمؑ کی معمولی کوتاہی

پر بھی اللہ نے ان کو سخت پھٹکارا اور فرمایا ﴿وَعَصٰی آدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی﴾ پھر اللہ نے ان کو برگزیدہ بھی بنالیا ﴿ثُمَّ اجْتَبَاہُ رَبُّہٗ﴾ اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ سے بڑے ہیں اور بے حد بڑے ہیں، پس وہ جو چاہیں کہیں ان کو حق ہے، مگر مجھے یا آپ کو اس کا حق نہیں کہ ہم یہ بات کہیں۔ جیسے ایک باپ ہے، اس کا بیٹا شیخ الحدیث ہے، وہ نام لے کر پکارتا ہے، اور کہتا ہے: او احمد یہاں آ! تو کیا شیخ الحدیث کے شاگردوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی یہی کہیں؟ وہ کبھی ایسا نہیں کہیں گے، وہ احترام والقاب کے ساتھ نام لیں گے۔ اور اگر شیخ الحدیث باپ کے سامنے غلطی کرے تو وہ اس کو پھٹکارے گا لیکن اس کے شاگرد اس کی غلطی نہیں پکڑیں گے، وہ پکڑیں گے تو یہ شاگردوں کی غلطی ہوگی۔

زمین پر اترنے کے بعد آدمؑ کی اولاد ہوئی:

بہرحال آدمؑ زمین پر اتارے گئے اور اتر کر جب زمین کی پیداوار کھائی تو بدن میں خون بنا، خون مادّہ بنا، پھر دو مادے رحم مادر میں اکٹھا ہوئے، دونوں سے انسان کا جسم ماں کے پیٹ میں بننا شروع ہوا، پھر پانچ مہینوں میں انسان کی باڈی مکمل ہوئی۔ قرآن میں جو کہا گیا ہے کہ ہر انسان مٹی سے بنا ہے اس کی حقیقت یہی ہے، یہ نہیں ہے کہ ہر انسان گارے سے بنا ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ ماں کے پیٹ میں جب انسان کی باڈی مکمل ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو حکم دیتے ہیں، فرشتہ عالم ارواح سے جس روح کے لئے یہ باڈی بنی ہے: وہ روح لاکر اس باڈی میں پھونک دیتا ہے، چنانچہ عورت رات کو سوتی ہے: پیٹ میں کوئی حرکت نہیں ہوتی، مگر جب صبح اٹھتی ہے تو بچے کو ہلتا ہوا پاتی ہے۔ یوں انسان عالم ارواح سے عالم اجساد میں آجاتا ہے۔

مگر ابھی بچہ دنیا کی آب وہوا برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوا، اس لئے چار مہینے ماں کے پیٹ میں رکھا جاتا ہے، پس یہ چار مہینے دو دنیاؤں کے درمیان کا مرحلہ ہے، دونوں کے درمیان کی آڑ ہے، کیونکہ جب بھی ایک دنیا سے دوسری دنیا میں جانا ہوگا تو بیچ میں ایک آڑ ہوگی، پس یہ چار مہینے عالم ارواح اور عالم اجساد کے درمیان کا برزخ ہے۔ اور اس برزخ کا رخ عالم اجساد کی طرف ہے، عالم ارواح کی طرف نہیں، یعنی اس برزخ کا قُرب عالم اجساد

سے ہے، عالم ارواح سے نہیں۔ اسی لئے ماں کا حیض بچہ کی غذا بنتا ہے۔ خیر بچہ دنیا میں آ گیا اور یہ جو دنیا میں آتا ہے: وہ پیدا ہوتا ہے، ظاہر ہوتا ہے، عدم سے وجود میں نہیں آتا وہ تو عالم ارواح میں بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔

عہدِ الست کی دلیل کیا ہے؟ کسی کو اس عہد کی باتیں یاد نہیں!

یہاں اگر کوئی سوال کرے کہ ہمیں تو وہ روحوں والی دنیا اور اس میں پیش آنے والے واقعات یاد نہیں۔ پس اس کا جواب یہ ہے کہ یاد نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ واقعہ پیش نہیں آیا، پیدا ہونے کے بعد چار پانچ سال تک کے احوال کس کو یاد ہیں؟ ماں کے پیٹ سے نکلنا کسی کو یاد نہیں، حالانکہ ہم سب نکلے ہیں، پھر نکلنے کے بعد دو سال تک دودھ پیا ہے، کسی کو دودھ پینا یاد نہیں، ہم دوسرے بچوں کو پیدا ہوتا ہوا اور دودھ پیتا ہوا دیکھتے ہیں اس لئے اپنے بارے میں بھی اس کا یقین کرتے ہیں۔ اگر کسی نے یہ بات نہ دیکھی ہو تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس مرحلہ سے گذرا ہوں۔ پس جب ہم اس دنیا کے احوال نہیں جانتے تو دوسری دنیا کے احوال ہم کو کہاں سے یاد رہیں گے۔

دوسری مثال: ہم مدرسوں میں پڑھے ہوئے ہیں، میں نے چالیس پینتالیس سال پہلے پڑھا ہے، آج مجھے یہ تو یاد ہے کہ کونسی کتاب کس سے پڑھی ہے، لیکن کس دن کونسا سبق پڑھا تھا: میں نہیں بتا سکتا اور کس سبق میں استاذ نے کیا بتایا تھا: وہ بھی میں نہیں بتا سکتا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ شرح جامی حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جموی قدس سرہ سے پڑھی تھی، اس سے آگے کچھ نہیں جانتا، مگر ہر آدمی جانتا ہے کہ میں نے مدرسہ میں پڑھا ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ ہمارے اندر استعداد موجود ہے، اگر ہم پڑھے ہوئے نہ ہوتے تو آج ہمارے اندر استعداد موجود نہ ہوتی۔ یہ استعداد دلیل ہے کہ ہم پڑھے ہوئے ہیں، چاہے ہمیں تفصیلات یاد نہ ہوں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں جو اپنا دیدار کرایا ہے اور اپنی پہچان کرائی ہے اس کی استعداد ہر انسان میں موجود ہے، ہر انسان کے دل میں اللہ کی یاد بسی ہوئی ہے، جو مانے اس کے دل میں بھی اور جو نہ مانے اس کے دل میں بھی، قرآن کہتا ہے: جو لوگ اللہ کو نہیں مانتے جب وہ سمندر میں سفر کرتے ہیں اور موجوں میں گھرتے ہیں تو کس کی طرف

متوجہ ہوتے ہیں؟ کس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ اللہ کی یاد ہر دل میں موجود ہے اور آڑے وقت میں اللہ کی یاد: ضمیر کی آواز ہے۔ بہر حال عالم ارواح میں یہ سارے واقعات ہوئے ہیں اور یاد ہونا ضروری نہیں، ہاں علامت پائی جانی چاہئے۔ اور علامت موجود ہے، استعداد موجود ہے، اور جیسے پڑھنے کی استعداد دلیل ہے کہ ہم نے پڑھا ہے، ایسے ہی اللہ کی معرفت جو ہر دل میں بسی ہوئی ہے دلیل ہے کہ کبھی ہم نے اللہ کو پہچانا ہے۔

اصحابِ فترت اور شواہق جبال کے رہنے والوں کا حکم

ایک نبی کی تعلیمات ختم ہوگئیں، نیا نبی ابھی آیا نہیں۔ بیچ کے لوگوں کا آخرت میں کیا ہوگا؟ یہ اصحابِ فترت کہلاتے ہیں۔ ایسے ہی پہاڑوں کی چوٹیوں پر جو لوگ رہتے ہیں وہ متمدن دنیا سے کٹے ہوئے ہیں: وہ نہ یہاں آئے نہ یہاں کے لوگ وہاں گئے۔ آج بھی دنیا میں ایسی جگہیں ہیں جہاں کے رہنے والوں کا دوسری دنیا سے کوئی رابطہ نہیں، وہ لوگ کوئی مذہب نہیں جانتے، ان کا آخرت میں کیا حال ہوگا؟ یہ شواہق جبال کے رہنے والے کہلاتے ہیں۔

امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ توحید وکفر پر مدار ہوگا، اگر وہ اللہ کو پہچانتا تھا تو وہ ناجی ہوگا، جنت میں جائے گا اور اگر وہ اللہ کو نہیں پہچانتا تھا یا پہچانتا تو تھا مگر غیر اللہ کو پوجتا تھا تو وہ دوزخ میں جائے گا اور باقی مسائل: نماز روزہ وغیرہ پر گرفت نہیں ہوگی، کیونکہ ان کا علم آدمی کی فطرت میں نہیں ہے اور اللہ کی پہچان فطری ہے۔

تاریخ میں فترت کے زمانہ کے بہت سے لوگوں کے احوال آئے ہیں۔ عمرو بن نُفیل ایک شخص گذرے ہیں، بھلے آدمی تھے، ایک مرتبہ حضور ﷺ نبوت سے پہلے ان کے یہاں کسی ضرورت سے گئے، انھوں نے کھانا پیش کیا، حضورؐ نے انکار کردیا۔ عمرو بن نفیل نے کہا: دیکھو! میں بتوں کے نام پر جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان کو نہیں کھاتا، یہ میں نے اللہ کے نام پر ذبح کیا ہے۔ یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی معرفت انسان کی فطرت میں ہے، آدمی توجہ کرے تو اللہ کو پہچان سکتا ہے۔

بہر حال ایک دنیا سے دوسری دنیا میں جب بھی منتقل ہوں گے تو بیچ میں حد فاصل ہو گی، حد فاصل کے بغیر کود کر دوسری دنیا میں نہیں پہنچ سکتے، مرنے کے بعد جو قبر کی زندگی ہے

یہ اِس جہاں اور اُس جہاں کے درمیان حد فاصل ہے، اور یہ برزخ اِس دنیا کا حصہ ہے، کیونکہ قبر سے قیامت کے دن لوٹ کر ہمیں اِسی دنیا میں آنا ہے، عربی میں اس کو معاد کہتے ہیں یعنی واپس آنا، ہم جو آگے بڑھ گئے ہیں اور عالم قبر میں پہنچ گئے ہیں وہاں سے ہمیں اسی دنیا میں واپس لایا جائے گا، قیامت اسی دنیا میں قائم ہوگی، وہ اسی دنیا کا آخری دن ہوگی اور وہ پچاس ہزار سال کا دن ہوگا ﴿تَعْرُجُ الْمَلاَئِكَةُ وَالرُّوْحُ إِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج:۴) یہ جو پچاس ہزار سال کا دن ہے، وہی الیوم الآخر (آخری دن) ہے اور یہی قیامت کا دن ہے، پھر اس دنیا سے تمام لوگ آخرت میں منتقل ہوجائیں گے اور آخرت ہمیشہ رہے گی۔

غرض: اس دنیا میں چونکہ سب کو واپس آنا ہے، اس لئے عالم قبر ہماری اسی دنیا کا ضمیمہ ہے، جیسے ماں کے پیٹ کی زندگی عالم ارواح اور عالم اجساد کے درمیان کی حد فاصل ہے، اور وہ زندگی ہمارے اس عالم کا حصہ ہے، کیونکہ بچے کو وہاں سے اس دنیا میں آنا ہے۔

البتہ آدمی عالم قبر میں پہنچ کر آخرت سے بہت قریب ہوجاتا ہے، صرف ایک مہین (باریک) پردہ بیچ میں رہ جاتا ہے اور آخرت کے احکام قبر میں جھلکنے لگتے ہیں۔ حدیث میں اس کو یوں سمجھایا ہے کہ قبر میں جب سوال جواب ہوجاتے ہیں تو نیک بندے کے لئے جنت کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے، وہاں سے بھینی بھینی ہوائیں آنی شروع ہوتی ہیں، اور برے بندے کے لئے جہنم کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے، ادھر سے شرارے آنے لگتے ہیں اور ایک ایک شرارہ اونٹ جتنا بڑا ہوتا ہے۔ یہی آخرت کے احکام کا جھلکنا ہے۔

بہرحال: قیامت کے دن اسی دنیا کی طرف لوٹنا ہے، پھر حساب کتاب ہوکر دو دنیاؤں کے درمیان پل صراط رکھا جائے گا، جس سے گذر کر جہنمی جہنم میں جائیں گے اور جنتی جنت میں۔ پھر جب وہ آخری دن پورا ہوگا تو یہ دنیا ختم ہوجائے گی، اور نئی دنیا شروع ہوگی، جو ہمیشہ چلتی رہے گی۔

حساب کتاب اس دنیا میں ہوگا:

انسان نے اچھے برے عمل یہاں کئے ہیں اس لئے اس کے فیصلے بھی اسی زمین پر

ہونگے، قصۂ زمیں برسرِ زمیں! ایک آدمی کہتا ہے: میں نے بہت ساری نمازیں پڑھی ہیں اور جھوٹ کہتا ہے، پس اس سے پوچھا جائے گا: بتا زمین کے کس حصہ پر نمازیں پڑھی ہیں؟ زمیں اس کی گواہی دے گی: اگر پڑھیں ہیں، ورنہ زمین تکذیب کرے گی۔ حدیث میں ہے: جہاں آدمی نے نماز پڑھی ہے: وہ زمین قیامت کے دن گواہی دے گی۔

اسی لئے مسئلہ ہے کہ جماعت ختم ہونے کے بعد جہاں فرض پڑھے ہیں وہیں نفلیں نہ پڑھے بلکہ جگہ بدل کر پڑھے تاکہ گواہ زیادہ ہوں۔

اس پر طالب علم کہتا ہے: پھر تو دو نفلیں یہاں اور دو وہاں پڑھنی چاہئیں اور اسی طرح پوری مسجد میں گھوم گھوم کر نفلیں پڑھنی چاہئیں، تاکہ گواہ زیادہ سے زیادہ ہوں!

اس کا جواب یہ ہے کہ جگہ بدلنے کی یہی ایک حکمت نہیں ہے ایک دوسری حکمت بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جہاں فرض پڑھے ہیں اگر سب لوگ وہیں سنتیں پڑھیں گے تو آنے والے کو دھوکہ ہوگا وہ سمجھے گا کہ جماعت ہو رہی ہے اور وہ اقتداء کر لے گا۔ اور جب لوگ بکھر جائیں گے تو آنے والا فوراً سمجھ جائے گا کہ جماعت ختم ہو چکی ہے۔ یہ حکمت نفلوں میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ اس میں آنے والے کو دھوکہ نہیں ہوتا، اس لئے نفلوں میں بار بار جگہ بدلنے کی ضرورت نہیں۔

غرض زمین کے خطوں کی گواہی دینے کی بات احادیث میں آئی ہے، اب اگر یہ حساب کتاب دوسری دنیا میں ہوگا تو گواہ یہاں رہ جائیں گے اور حساب کتاب وہاں ہوگا، پس وہاں گواہوں کے بغیر فیصلے کیسے کئے جائیں گے؟ اس لئے حساب کتاب اسی دنیا میں ہوگا تاکہ اس دنیا کے اعمال کا فیصلہ اسی دنیا میں ہو۔

مضمون یہ چل رہا تھا کہ ماں کے پیٹ کی زندگی اس دنیا کا حصہ ہے، کیونکہ بچہ کو یہاں آنا ہے اور قبر کی زندگی بھی اسی دنیا کا حصہ ہے، کیونکہ قبر سے پھر واپس یہیں آنا ہے، البتہ قبر میں پہنچ کر آدمی آخرت سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ دنیا و آخرت کے درمیان ایک مہین پردہ رہ جاتا ہے، اور آخرت کے احکام جھلکنے لگتے ہیں، اگر جہنم کے احکام جھلکیں تو یہ قبر کا عذاب ہے اور جنت کے احکام جھلکیں تو یہ قبر کی راحتیں ہیں۔

قبر میں جزاوسزا روح اور جسم دونوں کو ہوتی ہے

عذابِ قبر روح کو بھی ہوتا ہے اور جسم کے اجزاء کو بھی۔ یہ معاملہ چونکہ دوسری دنیا کا ہے اس لئے وہاں کے معاملات ہم آنکھوں سے نہیں دکھا سکتے، ذہن سے قریب کر سکتے ہیں، اگر سمجھنے والا ہو تو سمجھ سکتا ہے۔

ٹیلی فون تین ہیں: لوکل، نیشنل اور انٹرنیشنل۔ گھر میں جو ٹیلی فون رکھا ہوا ہے اگر یہ لوکل ہے تو شہر کے ہر ٹیلی فون سے اس کا تعلق ہے، اور اگر یہ نیشنل ہے تو ملک کے ہر ٹیلی فون سے اس کا تعلق ہے، اور اگر انٹرنیشنل ہے تو پوری دنیا کے ہر ٹیلی فون سے اس کا تعلق ہے، مگر یہ تعلق تقدیری ہے یعنی مان لیا گیا ہے۔ پھر جب کسی نے کوئی خاص نمبر ڈائل کیا اور کسی شہر کے کسی خاص گھر میں گھنٹی بجنے لگی تو اُس ٹیلی فون سے تحقیقی تعلق قائم ہو گیا۔ پہلے تقدیری اور حکمی تعلق تھا اب جب گھنٹی بجی تو تحقیقی تعلق ہوا۔ اور اگر ٹیلی فون لوکل ہے اور کوئی ملک سے باہر ٹیلی فون کرنا چاہے تو فوراً آواز آئے گی: اس ٹیلی فون پر یہ سہولت موجود نہیں!

اب سنیں! قیامت کے دن جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سارے انسان ختم ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ بارش برسائیں گے اس سے انسانوں کے نئے اجسام اگیں گے اور یہ نئے اجسام پہلے والے اجسام کی مٹی ہی سے بنیں گے، اس میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ حدیث میں ہے کہ ختنہ کرتے وقت جو زائد چمڑی کاٹ کر پھینک دی جاتی ہے وہ بھی اُس جسم میں شامل ہوگی، پھر جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا اور روحیں اڑائی جائیں گی تو روحیں جو بھی جسم خالی ملے گا اس میں داخل نہیں ہونگی، بلکہ ہر روح اپنے ہی جسم میں جائے گی۔ یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ روح اپنے جسم کو پہچانتی کیسے ہے؟ اس کا جسم سے کوئی نہ کوئی تعلق ہونا چاہئے، جبھی ہر روح اپنے جسم میں جائے گی۔ جیسے انٹرنیشنل ٹیلی فون کا تمام ٹیلی فونوں سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے، جبھی خاص نمبر ڈائل کرنے سے خاص جگہ گھنٹی بجتی ہے۔ اور اگر ٹیلی فون لوکل ہے تو نہیں بجتی، کیونکہ اس نمبر سے اس کا تعلق نہیں، اسی طرح ہر روح عالم برزخ میں اپنی جگہ پر ہے اور جسم قبرستان میں ہے، مگر اُس روح اور اِس جسم کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق قائم ہے، جبھی ہر روح اپنے ہی جسم میں جائے گی،

دوسرے جسم میں نہیں جائے گی۔

اور جب روح کا بدن کے ساتھ تعلق ہے تو پھر یہ مضمون سمجھنے میں کیا دشواری ہے کہ قبر میں جزاؤ سزا صرف روح کو نہیں ہوتی، روح کے ساتھ بدن کے اجزاء بھی شامل ہوتے ہیں۔ بس ہم اتنا ہی ذہن کے قریب کر سکتے ہیں، اب اگر آپ کہیں کہ ہمیں آنکھوں سے دکھاؤ تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں، کیونکہ یہ مسئلہ اِس دنیا کا نہیں ہے اُس دنیا کا ہے، نیز موجودہ زمانے کا بھی نہیں ہے، آئندہ زمانے کا ہے۔

خلاصۂ کلام: میں نے خطبہ میں جو آیت پڑھی تھی اس میں کافروں سے خطاب ہے: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ تم اللہ کا انکار کیسے کرتے ہو؟ ﴿وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا﴾ جبکہ تم نیست تھے ﴿فَأَحْيَاكُمْ﴾ پھر تمہیں اللہ نے وجود بخشا ﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ پھر اللہ تعالیٰ تمہیں موت دیں گے۔ کافران تینوں چیزوں کو مانتا ہے وہ نیست سے ہست ہونے کو بھی مانتا ہے، اپنے وجود کو بھی مانتا ہے، اور پھر معدوم (موت) ہوجانے کو بھی مانتا ہے ﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ پھر وہ تمہیں زندہ کریں گے اور تمہیں اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ کافروں کو یہی بات سنانی ہے کہ جب تم یہ تین حقیقتیں مانتے ہو، نیست سے ہست ہونے کو مانتے ہو، وجود کو مانتے ہو، موت کو مانتے ہو، تو پھر جو تمہیں ایک مرتبہ عدم سے وجود میں لا چکا وہ تمہیں دوبارہ عدم سے وجود میں کیوں نہیں لاسکتا۔ پہلی حیات تمہارے سامنے ہے، پس جیسے تم پہلے مرے ہوئے تھے ایسے ہی اِس وجود کے بعد تمہیں پھر مردہ ہوجانا ہے۔ پھر مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے، مگر تم اس دوسری حیات کو نہیں مانتے، عجیب بات ہے! آج ماننے کا وقت ہے، اِس حقیقت کو بھی مان لو، کل جب وقت ہاتھ سے نکل جائے گا تو خواہی نخواہی اُس دوسری حیات کو بھی ماننا پڑے گا، مگر اس وقت ماننے سے کیا فائدہ ہوگا؟ ایمان وعمل کا وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ والحمد للہ رب العالمین!

۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخرت کی نعمتیں دنیا کی چیزوں سے بدرجہا بہتر ہیں

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا، وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ○ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ، لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ○ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْأَسْحَارِ ○﴾ (آل عمران ۱۴-۱۷)

ترجمہ: خوش نما بنائی گئی لوگوں کے لئے مرغوب چیزوں کی محبت، یعنی عورتیں، بیٹے، سونے اور چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نمبری گھوڑے، مویشی، اور کھیتی۔ یہ سب دنیا کی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں، اور انجام کی خوبی اللہ ہی کے پاس ہے ○ آپؐ پوچھیں: کیا میں تمہیں وہ چیزیں بتلاؤں جو ان چیزوں سے بہ درجہا بہتر ہیں؟ ان لوگوں کے لئے جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور صاف ستھری بیویاں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان بندوں کو خوب دیکھتے ہیں ○ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، پس آپ ہمارے گناہ بخش دیں، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیں ○ وہ صبر شعار، راست باز، اطاعت کرنے والے، مال خرچ کرنے والے، اور آخررات میں گناہوں

کی معافی مانگنے والے ہیں○

دینی مجلس میں بیٹھنے کا ادب

یہ بیچ میں جو خلا ہے وہ نہیں رہنا چاہئے، سمٹ جانا چاہئے، اس سے برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اور یہ میرے جوان بھائی جو دیواروں سے لگے بیٹھے ہیں: کیا وہ مجھ سے زیادہ بوڑھے ہیں جو دیواروں سے لگے بیٹھے ہیں؟! ٹھیک ہے کوئی بوڑھا آدمی ہے اسے اجازت ہے، لیکن جو جوان ہیں وہ کیوں اس طرح بیٹھے ہیں؟ ان حضرات کو چاہئے کہ آگے تشریف لے آئیں۔ یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں دین کی بات سننے کا، دین کی بات رغبت سے سننی چاہئے، ہر چیز کا ایک ادب ہوتا ہے ادب کا لحاظ کیا جائے تبھی وہ چیز حاصل ہوتی ہے۔ دین کی بات اگر رغبت سے نہیں سنی جائے گی تو فائدہ کیسے ہوگا؟

لوگوں کے لئے دنیا کی چیزیں مرغوب بنائی گئی ہیں

میرے بھائیو! یہ قرآنِ کریم کی چند آیات ہیں جو آج نماز میں پڑھی گئی ہیں اور بالکل آخری رکعت میں پڑھی گئی ہیں۔ ان آیاتِ پاک میں اللہ جل شانہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ لوگوں کے لئے مزین کی گئی ہے، خوشنما بنائی گئی ہے، مرغوب چیزوں کی محبت! دل پسند چیزوں کی محبت! وہ دل پسند چیزیں کیا ہیں؟ عورتیں، بیٹے! اولاد نہیں، بلکہ بیٹے، ڈھیر لگا ہوا مال: سونے میں سے اور چاندی میں سے، نمبری گھوڑے، پہلے جو شاندار گھوڑے ہوتے تھے ان پر نمبر لگاتے تھے۔ اب کھیل ہوتے ہیں، کھلاڑی پر نمبر لگاتے ہیں، یہ سولہ نمبر کا، یہ سترہ نمبر کا، یہ اٹھارہ نمبر کا۔ پرانے زمانے میں گھوڑوں پر نمبر لگتے تھے، اب انسانوں پر لگنے لگے، یہ اس زمانہ کے گھوڑے ہیں! اب گھوڑوں کی سواری نہیں رہی، ان کی جگہ کاریں آگئیں ہیں، کاروں میں بھی اعلیٰ درجہ کی کاریں ہوتی ہیں، معلوم نہیں ان کے کیا کیا نام ہیں؟ اور مویشی یعنی اونٹ، بکریاں، گائیں بھینسیں، یہ سب مویشی ہیں، اونٹ والوں کو اونٹ پسند ہیں، گائے بھینس والوں کو گائیں بھینسیں پسند ہیں، بکری والوں کو بکریاں پسند ہیں، جو لوگ جو مویشی پالتے ہیں، ان کے لئے وہ مویشی مزین کئے گئے ہیں، اور کھیتی: جو کسان ہیں ان کے لئے

کھیتی مزین کی گئی ہے، یہ چند مثالیں ہیں، یہ سب تفسیر ہے حب الشہوات کی۔

لوگوں کے لئے دنیا کی چیزیں مرغوب کیوں بنائی گئی ہیں؟

ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ اس میں مصلحت کیا ہے؟ اللہ کے ہر کام میں حکمت و مصلحت ہوتی ہے، وہ حکمت و مصلحت یہ ہے کہ اگر ان چیزوں کی محبت نہ ہوتی تو دنیا میں رہنے کے لئے کون تیار ہوتا؟ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی شاندار اور بھلی بنائی ہے، اور مزین کرکے دکھائی ہے کہ کوئی یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ غور کرو: ایک طرف زندگی میں کیا کیا الجھنیں ہیں، پریشانیاں، مصیبتیں، آفتیں اور بلائیں ہیں، ان کی ایک فہرست بناؤ اور دوسری طرف اپنی پسندیدہ چیزوں کی فہرست بناؤ، تم دیکھو گے کہ انسان کی مرغوبات غالب رہتی ہیں، اس کی پریشانیوں پر۔ چنانچہ آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے، آنکھیں کام نہیں کرتیں، کانوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے، ٹانگوں نے جواب دے دیا ہے، پھر بھی آدمی مرنے کے لئے تیار نہیں، کچھ بھی ہو رہنا دنیا ہی میں ہے، آخر کیوں؟ اللہ نے دنیا مرغوب بنائی ہے، اس کی ہر چیز مزین کی ہے، اس لئے دنیا بھلی معلوم ہوتی ہے، اور آدمی کو وہ پریشانیوں سے زیادہ محبوب اور مرغوب نظر آتی ہے، اسی کو ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ انسان جب بوڑھا ہوجاتا ہے تو اس میں دو چیزیں جوان ہوجاتی ہیں: ایک زندگی کی محبت، دوسری مال کی محبت(۱) جوں جوں آدمی بوڑھا ہوتا جاتا ہے: یہ محبتیں جوان ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جب یہ محبتیں جوان ہونگی تو دنیا کون چھوڑنا چاہے گا؟

دنیا کی چیزیں چندروزہ استعمال کے لئے ہیں!

مگر یہ ہری بھری دنیا، یہ دل پسند چیزیں جن کی محبت آدمی کے دل کو گھیرے ہوئے ہے: دنیا کی زندگی کا استعمالی سامان ہیں۔ عربی میں ''متاع'' ایسی چیز کو کہتے ہیں جسے چند روز استعمال کرکے پھینک دیا جائے جیسے عورتیں چولھے پر دیگچی پکڑنے کے لئے ایک کپڑا (صافی) رکھتی ہیں، جو ہفتے میں میلا، چکنا اور کالا ہوجاتا ہے تو اُسے پھینک دیتی ہیں، اور دوسرا

---

(۱) يَهْرَمُ ابنُ آدمَ وَيَشِبُّ منه اثنان: الحرصُ على المال، والحرصُ على العمر (متفق علیہ مشکوۃ حدیث ۵۲۷۰)

کپڑا لاکر چولھے پر رکھ لیتی ہیں، یہ متاع ہے۔ یہ چند دن استعمال کی چیز ہے، یہ تو پرانی مثال ہے، نئی مثال نیپکین (Napkin) ہے، یعنی دست پاک، اس کاغذ کو ڈبّے سے نکالتے ہیں، ہاتھ منہ یا ناک صاف کر کے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ جتنی حیثیت اس دست پاک کی ہے اتنی ہی حیثیت اس پوری دنیا کی ہے، اس کو تھوڑی دیر کے لئے استعمال کرنا ہے، پھر وہ ہاتھ سے نکل جانے والی ہے۔ اور اچھا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، یعنی دنیا کا یہ مال سامان آخرت کے مقصد سے استعمال کیا جائے تو ہی وہ کارآمد ہوگا، دنیا کے فوائد وقتی ہیں، دیرپا فائدہ آخرت کا ہے۔ انسان زندگی بھر ہائے مال! ہائے مال! یہ میرا مال! یہ میرا مال! کرتا رہتا ہے، حالانکہ اس کے مال صرف تین ہیں: جو کھالیا اور ختم کر دیا، جو پہن لیا اور پرانا کر دیا، جو خیرات کیا اور اللہ کے یہاں جمع کر لیا، یہی تین مال: اس کے مال ہیں، باقی سب دوسروں کے لئے چھوڑ کر چل دینا ہے، پیچھے ورثاء استعمال کرتے ہیں، کتّے بلیوں کی نذر ہو جاتا ہے، یا تتر بتر ہو جاتا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں: اہل تعلق، میت کا مال (چارپائی وغیرہ) اور اس کا عمل، پھر دو چیزیں واپس آجاتی ہیں، صرف اس کا اچھا برا عمل اس کے ساتھ رہ جاتا ہے۔

میرے بھائیو! جو آگے بھیج دیا ہے: اگر برا عمل بھیجا ہے تو اللہ کی پناہ! اور اگر اچھا عمل بھیجا ہے، خواہ کسی لائن کا اچھا عمل ہو، وہی اچھا مآلِ کار ہے، وہ چند دن کا استعمال کا سامان نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ کے لئے استعمال کا سامان ہے۔

اعمالِ صالحہ کا اجر دنیا میں کیوں نہیں ملتا؟

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اعمال کا اجر اس دنیا میں نہیں رکھا، آخرت میں رکھا ہے، اس دنیا میں اعمال کا اجر اگر دیا جائے گا تو مؤمن گھاٹے میں رہے گا۔ غور کرو! ایک آدمی نے پندرہ سال کی عمر میں نماز پڑھنی شروع کی، اس کی نماز کا بدلہ اگر اسی دنیا میں دے دیا جائے تو وہ کتنے دن ثواب استعمال کرے گا؟ ساٹھ سال، ستر سال، اسی سال، نوے سال، سو سال، پھر تو مرے گا؟ پس اس نے پچاسی سال اپنی نماز کے ثواب سے فائدہ اٹھایا۔ اور جو نماز اس نے

مکتبہ حجاز دیوبند

مرنے سے ایک دن پہلے پڑھی ہے: اس کے ثواب سے تو ایک ہی دن فائدہ اٹھائے گا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اعمال کا اجر اس دنیا میں نہیں رکھا، سارا اجر آخرت میں رکھا ہے، تاکہ آخرت میں جب وہ اجر ملے تو اسے تا ابد استعمال کرے، اب وہ اجر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اور یہ مضمون اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف (آیت ۵۷) میں بیان کیا ہے: ﴿وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾: اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہے ایمان داروں اور تقوی شعاروں کے لئے۔

سوال: اگر اعمالِ صالحہ کا کچھ ثواب: دنیا میں بھی دیا جائے اور باقی آخرت میں دیا جائے تو کیا حرج ہے؟

جواب: ایسا بچند وجوہ نہیں کیا جاسکتا:

ایک: مزدوری کام پورا کرنے کے بعد ملتی ہے، عمل کے درمیان نہیں ملتی۔

دوم: اعتبار خاتمہ کا ہے، اور ابھی بندے کو معلوم نہیں کہ اس کا خاتمہ کس حال پر ہوگا؟ اور اگر اللہ کے علم کے مطابق معاملہ کیا جائے تو راز طشت از بام ہوجائے گا اور تکلیف شرعی کی بنیاد ختم ہوجائے گی، اس دنیا میں ایمان بالغیب ضروری ہے۔

سوم: اس دنیا کے ثواب کی اور آخرت کے ثواب کی نوعیت مختلف ہے، یہاں کا انگور اور ہے اور آخرت کا اور، پھر ثواب کے طور پر کونسا انگور دیا جائے گا؟ آخرت کا انگور یہاں کا جسم استعمال نہیں کرسکتا۔

چہارم: اعمالِ صالحہ کا کچھ اجر دیا جائے گا تو گناہ کی کچھ سزا بھی یہاں دی جائے گی، اور اس صورت میں کوئی کافر پنپ نہیں سکے گا۔ سورۃ الفاطر کی آخری آیت ہے: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى، فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا﴾: اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی ان کے اعمال (بد) کے سبب فوراً دارو گیر فرمانے لگیں تو روئے زمین پر ایک متنفس کو نہ چھوڑیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک مقررہ وقت (قیامت) تک مہلت دیئے ہوئے ہیں۔ پس جب ان کا مقررہ وقت آپہنچے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لیں گے!

آیتِ پاک کا خلاصہ

تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: لوگوں کے لئے ایک مصلحت سے دنیا بھلی کی گئی ہے۔ اب اگر آدمی اُسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے، اپنی ساری نظر اُسی پر روک لے، اسی دنیا کا ہوکر رہ جائے، اور انہی دل پسند چیزوں میں پھنس کر رہ جائے تو یہ دھوکہ ہے، یہ تو چند دن کا استعمالی سامان ہے، اس کے ذریعہ تیاری کرنی ہے، آخرت کے لئے، حسن مآب تو وہاں ہے، یہ چیزیں ساری اس لئے ہیں کہ اس کے ذریعہ آپ اگلی زندگی بنائیں۔

دنیا کی چیزوں سے بہتر جنت کے سدا بہار باغات ہیں

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ أَئُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ ذٰلِكُمْ؟﴾ آپ لوگوں سے پوچھئے: کیا بتلاؤں میں تمہیں ان چیزوں سے بہتر چیزیں؟ یہ جو دنیا کا چندروزہ سامان ہے، جو تمہیں بڑا بھلا لگ رہا ہے، کیا میں تمہیں ان سے بہتر چیزیں بتاؤں؟ ان سے بہتر وہ باغات ہیں جو نیک مسلمانوں کو اللہ کے یہاں پہنچ کر ملیں گے۔ ان لوگوں کو ملیں گے جو پرہیز گار ہیں، پرہیز گار کس کو کہتے ہیں؟ نیک مؤمن کو! مؤمن بدکار بھی ہوسکتا ہے، گناہ گار بھی ہوسکتا ہے، لیکن نیک مؤمن اور متقی وہ شخص ہے جو فرض اور واجب احکام میں سے کوئی نہ چھوڑے، اور جو کسی گناہ کبیرہ کے قریب بھی نہ جائے، اور اگر کوئی گناہ ہوجائے تو پہلی فرصت میں توبہ کرلے، پھر فرائض وواجبات کے علاوہ سنتیں ہیں، سنت مؤکدہ بھی ہیں اور غیر مؤکدہ بھی، پھر مستحبات ہیں۔ ان سب اعمال سے درجے بڑھتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ آدمی ولی اللہ بن جاتا ہے۔ اولیائے کرام بھی یہی مؤمن ہوتے ہیں، البتہ وہ فرائض وواجبات سے آگے بڑھتے ہیں، سنت مؤکدہ ادا کرتے ہیں، سنت غیر مؤکدہ ادا کرتے ہیں، مستحبات ادا کرتے ہیں، نوافل ادا کرتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ اللہ سے نزدیک ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے دوست بن جاتے ہیں۔

اسی طرح گناہوں میں سے کبیرہ گناہوں سے بچنا تو نیک مؤمن ہونے کے لئے شرط ہے، پھر گناہ کبیرہ کے بعد چھوٹے گناہ ہیں ان سے بچنا بھی ضروری ہے، پھر ان کے بعد وہ

چیزیں ہیں جن میں گناہ کا شبہ ہے، ان مشتبہ امور سے بھی جو بچتا ہے وہ ولی اللہ بن جاتا ہے۔

غرض: نیک مؤمنین کو جو باغات ملیں گے وہ دنیا کی ان تمام چیزوں سے بہتر ہیں، وہ باغات سدا بہار ہیں، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اوپر دیکھو کچھ نظر نہیں آرہا، اور نیچے جڑوں میں نہریں بہ رہی ہیں، جس کی وجہ سے وہ باغات سدا بہار ہیں، کبھی خشک نہیں ہوتے، ان کے پتے نہیں جھڑتے، ان باغات میں نیک لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ ایک نعمت تو باغات ہیں، پھر باغات سدا بہار ہیں، پھر ان باغات میں ہمیشہ رہنا ہے، ان باغات سے کبھی نکلنا نہیں۔

جنت میں پاکیزہ عورتیں ملیں گی

اور دنیا کی مرغوبات میں عورتوں کا تذکرہ سب سے پہلے آیا ہے، وہ عورتیں جو دنیا میں پسندیدہ بنائی گئی ہیں، وہ عورتیں وہاں بھی ملیں گی، مگر وہ ہر طرح پاکیزہ ہونگی۔

مکتبہ حجازیہ دیوبند

زمانۂ حیض کے احکام:

مگر دنیا کی عورتوں کو کسی مصلحت سے حیض بھی آتا ہے، ہر مہینہ پانچ سات روز ایسی ہوجاتی ہیں کہ قریب جانا بھی منع ہے، الگ چارپائی پر لیٹنا ضروری ہے۔ آج ہی یہ آیتیں آئی ہیں کہ لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں: جب عورت حیض کی حالت میں ہو تو کیا معاملہ کیا جائے؟ آپؐ جواب دیں کہ حیض کی حالت تکلیف دہ حالت ہے، عورت اس زمانہ میں نارمل نہیں رہتی، لہٰذا اس حالت میں عورتوں سے جدا رہو، بیوی کے ساتھ نہ لیٹو، پھر مزید تاکید فرمائی کہ ان کے نزدیک بھی مت جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائیں۔ اور ابوداؤد میں حدیث ہے کہ ازواج مطہرات زمانۂ حیض میں نبی ﷺ کے ساتھ نہیں لیٹتی تھیں، نیچے چٹائی پر علاحدہ لیٹتی تھیں، البتہ ایک آدھ بار آپؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ لٹایا ہے، وہ مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا، پس وہ سنت نہیں ہے۔

جنت کی سب عورتیں پاکیزہ ہونگی

اور اس کے علاوہ معلوم نہیں کیا کیا انسان میں گندگیاں ہوتی ہیں، کچھ گندگیاں ناک

میں ہوتی ہیں، کچھ گندگیاں منہ میں ہوتی ہیں، کچھ گندگیاں دانتوں پر ہوتی ہیں، کچھ گندگیاں بغل میں ہوتی ہیں، اور پتہ نہیں کیا کیا گندگیاں ہوتی ہیں، لیکن جنت میں جو ازواج ملیں گی، چاہے وہ دنیا والی ہوں یا جنت کی حوریں: وہ پاکیزہ ہونگی، اللہ تعالیٰ نے ان کو پاک صاف کر رکھا ہوگا۔

جن کا دنیا میں نکاح نہیں ہوا:

دنیا میں کچھ عورتیں ایسی بھی ہیں جن کا کوئی شوہر نہیں، اور کچھ مرد بھی ایسے ہیں جن کی کوئی بیوی نہیں، ایسی عورتوں اور ایسے مردوں کے وہاں نکاح ہوں گے، وہاں کوئی بے نکاح نہیں رہے گا۔

دنیا کی عورتیں بھی حور ہیں:

مکتبہ حجاز دیوبند

جنت کی ہر عورت حور ہے، حور عربی لفظ ہے، اس کے معنی ہیں: گوری عورت، حور حوراء کی جمع ہے اور حوراء کے معنی ہیں: گوری، یورپ کی گوری نہیں، یہ تو ان کے ساتھ ایک لفظ لگ گیا ہے، چاہے وہ گوری نہ ہو، چاہے وہ کیسی ہی بدصورت ہو، مگر کھال سفید ہو تو لوگ اس کو ''گوری'' کہتے ہیں، مگر جنت کی عورتیں سب گوری اور نہایت خوبصورت ہونگی، یہ جو دنیا کی عورتیں ہیں وہ بھی وہاں حور ہونگی، بلکہ جنت کی حوروں کی سردار ہونگی، کیونکہ جنت کی حوریں تو جنت کی مخلوق ہیں، اور یہ ایمان وعمل کی برکت سے جنت میں گئی ہیں، ویسے مفت میں نہیں گئیں، اس لئے ان کا مقام وہاں بلند ہوگا۔

جس عورت کے چند نکاح ہوئے: وہ کس کو ملے گی؟

یہاں لوگ ایک مسئلہ پوچھا کرتے ہیں: ایک شخص کی بیوی تھی، پھر اس کا انتقال ہوگیا، اور بیوی کا دوسری جگہ نکاح ہوگیا، پھر اتفاقاً دوسرے شوہر کا بھی انتقال ہوگیا، پھر بیوی نے تیسرا نکاح کرلیا: پس یہ بیوی کس کو ملے گی؟ دنیا میں اس کے تین شوہر ہوئے ہیں۔ لوگ یہ سوال کرتے ہیں، آپ حضرات بھی سوچتے ہونگے کہ تقریر کے بعد پوچھیں گے۔ پس میں ابھی کیوں نہ بتادوں!

اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ یہ بات معلوم نہیں، دنیا میں آئندہ جو معاملات پیش آنے والے ہیں یا مرنے کے بعد آخرت میں جو معاملات پیش آئیں گے ان میں سے ہم انہی سوالوں کے جواب جانتے ہیں، جن کا تذکرہ قرآن وحدیث میں آیا ہے، اور جن کا تذکرہ قرآن وحدیث میں نہیں آیا اس کا جواب ہم نہیں جانتے، آخرت کے معاملات میں عقل کا گھوڑا نہیں دوڑایا جاسکتا، قیاس نہیں چلتا، قیاس اسی دنیا کے معاملات میں چلتا ہے۔ نصوص میں یعنی قرآن وحدیث میں اگر کوئی بات آئی ہے تو ہم بتا سکتے ہیں، اس کے بغیر نہیں بتاسکتے۔

اور یہ مسئلہ قرآن وحدیث میں نہ واضح طور پر آیا ہے، نہ اشارۃً آیا ہے، اس لئے صحیح جواب یہ ہے کہ یہ بات معلوم نہیں! البتہ کتابوں میں چند قول لکھے ہیں، مگر وہ علماء کی باتیں ہیں، قرآن وحدیث کی باتیں نہیں ہیں، اس لئے قطعی نہیں ہیں:

ایک قول: یہ ہے کہ جو آخری شوہر ہے اسے وہ بیوی ملے گی، کیوں کہ جب پہلا شوہر مرگیا تو نکاح ختم ہوگیا، پھر جب دوسرا شوہر بھی مرگیا تو اس کا نکاح بھی ختم ہوگیا، جبھی اگلے سے نکاح جائز ہوا، پھر تیسرے سے نکاح ہوا، پس وہ آخری شوہر ہے، اس کے نکاح میں وہ بیوی آخر تک رہی ہے، اس لئے اسی کو ملے گی۔

مگر تیسرا ابھی تو کبھی نہ کبھی مرے گا یا بیوی مرے گی، کوئی بھی مرے گا نکاح ختم ہوجائے گا۔ پھر تیسرے کے لئے وجہ ترجیح کیا ہے؟

موت سے نکاح ختم ہوجاتا ہے

بیوی مرے تو بھی نکاح ختم ہوجاتا ہے، شوہر مرے تو بھی نکاح ختم ہوجاتا ہے، بس اتنا فرق ہے کہ شوہر مرے تو نکاح عدت تک باقی رہتا ہے اور بیوی مرے تو نکاح فوراً ختم ہوجاتا ہے، بیوی کا انتقال ہوجائے تو شوہر اس کو ہاتھ نہیں لگاسکتا۔ بیوی کو کوئی نہلانے والا نہ ہو تو بھی شوہر بیوی کو نہیں نہلاسکتا، کیوں کہ نکاح ختم ہوگیا، اب وہ اجنبی بن گیا، البتہ اتنی گنجائش ہے کہ شوہر بیوی کا چہرہ دیکھ سکتا ہے، جب جنازہ تیار ہوجائے تو ایک نظر بیوی کا چہرہ دیکھ سکتا ہے، ہاتھ نہیں لگاسکتا۔

غیر محرم میت کا چہرہ دیکھنا:

سوال: یہاں تو عورتیں غیر محرم مرد کا بھی چہرہ دیکھتی ہیں؟

جواب: یہ غلط طریقہ ہے، اور یہ طریقہ ہمارے یہاں (ہندوستان میں) بھی رائج ہے۔ عورت کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا چہرہ کوئی اجنبی مرد نہیں دیکھتا، جو اس کے محرم ہوتے ہیں جیسے بیٹا، بھائی وغیرہ یا عورتیں دیکھتی ہیں: یہ جائز ہے۔

مگر مرد کا انتقال ہوتا ہے تو اجنبی عورتیں بھی زیارت کے لئے آتی ہیں، اور چہرہ دیکھتی ہیں: یہ درست نہیں، پردے کے احکام زندگی کے ساتھ خاص نہیں: موت کے بعد بھی باقی رہتے ہیں۔ ایک موقعہ پر حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا تھا: **لاتنظر إلی فخذ حي ولا میت**: نہ کسی زندہ کی ران دیکھو اور نہ کسی مردہ کی، جیسے زندے کی ران دیکھنا جائز نہیں، مردے کی ران دیکھنا بھی جائز نہیں۔ اسی لئے جب میت کو نہلاتے ہیں تو ناف سے گھٹنے تک کوئی موٹا کپڑا ڈال لیتے ہیں، پردہ کر کے نہلاتے ہیں۔ پس اجنبی مرد کا چہرہ دیکھنا جیسے زندگی میں جائز نہیں، مرنے کے بعد بھی جائز نہیں، اسی طرح اجنبی عورت کا چہرہ دیکھنا جیسے زندگی میں جائز نہیں، مرنے کے بعد بھی جائز نہیں، اس لئے یہ طریقہ کہ مرد کا جنازہ ہو جاتا ہے تو سارے محلے والے مرد اور عورتیں آ کر منہ دیکھتے ہیں: یہ شرعاً جائز نہیں۔ ہاں محرم عورتیں چہرہ دیکھ سکتی ہیں۔

دوسرا قول: کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ قیامت کے دن عورت کو اختیار دیا جائے گا وہ جس کو پسند کرے گی، اس کو وہ عورت دی جائے گی۔

تیسرا قول: کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ ان تینوں شوہروں میں سے جس کا اخلاقی برتاؤ اس عورت کے ساتھ اچھا ہوگا اس کو وہ عورت ملے گی۔

لیکن یہ سب علماء کے اقوال ہیں، قرآن وحدیث میں یہ مسئلہ نہ صراحتاً آیا ہے نہ اشارۃً، اس لئے صحیح جواب یہ ہے کہ یہ بات معلوم نہیں، آخرت میں پتہ چلے گا کہ کس کو ملی؟ اور کوئی ضروری نہیں کہ سارے مسئلے یہیں طے کر لئے جائیں، اس دنیا میں وہی مسئلے طے کرنے ضروری ہیں جو عمل سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ یہ مسئلے طے کئے بغیر عمل کیسے کیا جائے گا؟

لیکن جن باتوں کا عمل سے تعلق نہیں ان کو اس دنیا میں طے کرنا ضروری نہیں، وہ دوسری دنیا میں سامنے آجائیں گے۔

جنت میں اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی

اس دنیا میں تو اللہ کے فضل سے ہم مؤمن ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ پوری زندگی پرہیزگاری کے ساتھ گذرے، لیکن دل دھڑکتا رہتا ہے کہ اللہ جانے ہمارا انجام کیا ہوگا؟ اگر ایمان اور عمل صالح پر ہمارا خاتمہ ہوا تو اللہ خوش ہوں گے، اور اگر مرنے سے پہلے احوال بگڑ گئے تو انجام برا ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ ایک آدمی پوری زندگی جنت والے کام کرتا رہتا ہے، پھر جب جنت ایک ہاتھ باقی رہ جاتی ہے تو اس کی بدبختی غالب آتی ہے اور وہ اپنا ایمان کھو بیٹھتا ہے، کفر کے راستے پر پڑ جاتا ہے، اور کافر ہو کر مرتا ہے، اور جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی بھر جہنم کے راستے پر چلتا رہے، جب جہنم ایک ہاتھ رہ جائے تو نیک بختی غالب آجائے، اور اللہ تعالیٰ توفیق دیدیں، اور وہ ایمان لے آئے، اور اچھے احوال پر اس کی موت ہو، اور وہ جنت میں پہنچ جائے۔

اس لئے ہمارا آخری انجام کیا ہوگا؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، اس دنیا میں تو دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اور ہم سب سے بڑی دعا یہ کرتے ہیں کہ یا اللہ! ایمان پر ہمارا خاتمہ ہو!

لیکن جس کا ایمان پر خاتمہ ہوا، اور وہ آخرت میں جنت میں پہنچ گیا، اس سے اللہ تعالیٰ ایسے خوش ہو جائیں گے کہ پھر کبھی ناراض نہیں ہونگے، اور یہ آخرت میں جنت سے بھی بڑی نعمت ہوگی، سورۃ توبہ (آیت ۷۲) میں ہے: ﴿وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَر﴾ اور اللہ کی رضامندی سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہے!

آخرت کی نعمتیں کس کو ملیں گی؟

آخرت کی یہ تین نعمتیں (باغات، ازواج مطہرات اور اللہ کی خوشنودی) جن کو ملیں گی ان کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ﴾: ان بندوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں! مگر ہمیں بھی تو کچھ بتلاؤ کہ وہ بندے کونسے ہیں؟ تا کہ ہم بھی ان کی صف میں

کھڑے ہو جائیں، پس سنو! وہ بندے وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم ایمان لائے ہیں، پس آپ ہمارے گناہوں کو بخش دیں، اور ہمیں جہنم سے بچالیں۔

یہ ایک بات ہوئی یعنی وہ بندے مؤمن ہونے چاہئیں، اور جو کوتاہیاں ان سے ہوئی ہیں ان کی معافی مانگتے رہیں، اور جہنم سے بچے رہنے کی دعائیں کرتے رہیں۔

ایمان پر غرّہ نہیں چاہئے

اور ایمان کے ساتھ یہ غرّہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم مسلمان ہیں، اس لئے جنت ہمارے باپ کی جاگیر ہے۔ آج عام طور پر مسلمانوں کا یہی گمان ہے، نہ نماز پڑھتے ہیں، نہ زکات دیتے ہیں، مگر مسلمانوں کی لسٹ میں ان کا نام ہے، اس لئے مطمئن ہیں کہ جنت ہمارے لئے ریزرو ہے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم جنت میں نہیں جائیں گے تو اور کون جائے گا! اور اللہ ہمیں نہیں بخشیں گے تو اور کس کو بخشیں گے!

میرے بھائیو! جنت کسی کے باپ کی جاگیر نہیں، پہلے پارے میں ایک آیت ہے جو کل پڑھی گئی ہے: ﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا أَوْنَصٰرىٰ، تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ، قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ بَلٰى، مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ أَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ آیات ۱۱۱و۱۱۲): یہودی کہتے ہیں: جنت میں وہی جائے گا جو یہودی ہے، یہی بات عیسائی بھی کہتے ہیں یعنی مسلمان جنت میں نہیں جائیں گے، ہم ہی جائیں گے (یہی بات آج مسلمان بھی کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ دل بہلانے کی باتیں ہیں، یہ ان کی جھوٹی آرزوئیں ہیں! آپؐ ان سے کہئے: اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ، تمہارے پاس تورات ہے، تمہارے پاس انجیل ہے، ان میں سے کوئی دلیل لاؤ کہ محض نام کے یہودیوں ہی کے لئے اور نام کے عیسائیوں ہی کے لئے جنت ہے، ان کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جائیگا، مسلمانوں کے لئے جنت نہیں ہے، جنت یہود ونصاریٰ کی جاگیر ہے، اس بات کی اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کرو! کہاں سے پیش کریں؟ کوئی دلیل نہیں ہے!

آج جاہل مسلمان بھی اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں، ان سے بھی یہی کہا جائے گا کہ تم جو

گمان باندھے بیٹھے ہو، اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن سے یا حدیث سے دلیل لاؤ کہ جو بھی مسلمان کہلاتا ہے وہ ضرور جنت میں جائے گا، ان کے پاس بھی کوئی دلیل نہیں، یہود ونصاری کی طرح محض خوش فہمی ہے۔

پھر آگے قرآن معیار بتلاتا ہے کہ جنت میں کون جائے گا؟ فرمایا: ﴿بَلٰی، مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ﴾ کیوں نہیں! یعنی مسلمان جنت میں کیوں نہیں جائیں گے، جنت میں جانے کا معیار یہ ہے کہ آدمی اپنی پوری ذات اللہ کے حوالے کردے، درانحالیکہ وہ مؤمن بھی ہو۔ ایمان کے ساتھ جو کرنے کے احکام اللہ نے دیئے ہیں: وہ بجالائے، اور جو رکنے کے احکام دیئے ہیں ان سے باز رہے، ایسا شخص ضرور جنت میں جائے گا، اور یہ معیار تمہارے اندر نہیں پایا جاتا، اور کھرے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے، پس جو اس معیار پر پورا اترے گا وہ جنت میں ضرور جائے گا۔

جو بندے کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم ایمان لائے ہیں، پس ہمارے ایمان کی برکت سے ہمارے گناہ بخش دے اور جہنم کے عذاب سے ہماری حفاظت فرما وہ لوگ ایمان کے ساتھ پاکبازی کی زندگی گذارتے ہیں، اور اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے ہیں، اور جہنم سے بچنے کی دعائیں کرتے ہیں وہ ضرور جنت میں جائیں گے۔

دعائیں ضروری ہیں:

دعائیں عبادتوں کا مغز ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے اور نماز میں کئی جگہ دعائیں رکھی گئی ہیں، بلکہ نماز کا آخری جزء تو دعا ہی کے لئے خاص ہے، مگر جب اسلام عربوں سے بڑھ کر عجمیوں تک پہنچا، تو صحابہ جہاں تک گئے، اور انھوں نے جو ممالک فتح کئے وہ تو عرب ملک بن گئے، یہ عراق، یہ شام، یہ مصر، یہ خلیج کے ممالک: سب صحابہ نے فتح کئے ہیں، وہ سب عرب ملک بن گئے، لیکن بعد میں جہاں اسلام پہنچا: وہاں اسلام کمزور رہا، وہ ممالک عرب ملک نہیں بنے، ہم بھی انہی ملکوں میں سے ہیں، ہندوستان میں اسلام بہت دیر میں پہنچا، اس لئے ہندوستان عرب ملک نہیں بنا، یہاں کے لوگ عربی نہیں جانتے، یہ عجمی لوگ جو عربی زبان نہیں جانتے: نماز میں دعا نہیں مانگ سکتے، وہ اپنی زبان میں دعا مانگیں گے، لیکن اگر نماز میں

اپنی زبان میں دعا مانگیں گے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

ان بے چاروں نے بچپن میں ایک دعا یاد کی ہے: **اللّٰھم إِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ** بس وہی یاد ہے، روزانہ وہی پڑھتے ہیں، اور سمجھتے کچھ نہیں، حالانکہ دعا دل کی مراد مانگنے کا نام ہے، مگر عجمی مسلمان عربی نہ جاننے کی وجہ سے اس پر قادر نہیں!

جب یہ ضرورت پیش آئی تو علمائے کرام نے کہا: سلام کے بعد جو متصل وقت ہے وہ بھی نماز کے ساتھ ملحق ہے، پس سلام کے بعد متصلاً دعائیں مانگو، اور اپنی زبان میں مانگو، یہ بھی نماز ہی میں مانگنا ہے۔

آج کل کچھ لوگ کہتے ہیں: حضورؐ اور صحابہ سے سلام کے بعد دعا مانگنا ثابت نہیں، اس لئے نمازوں کے بعد دعا مانگنا بدعت ہے، یہ بیچارے بدعت کی حقیقت نہیں جانتے، قولاً اور فعلاً دعا ثابت ہے، ہاں ہیئت اجتماعیہ اور التزام کے ساتھ ثابت نہیں، پس ان باتوں سے احتراز کیا جائے، نفس دعا کو بدعت کیوں کہا جائے؟

اور خاص خاص عربوں کو آج بھی ضرورت نہیں، انہیں جو دعائیں کرنی ہوتی ہیں وہ نماز میں کر لیتے ہیں، مگر جاہل عرب اور عجمی کیا کریں؟ وہ تو نماز میں دعا نہیں کر سکتے، بگڑی ہوئی عربی میں دعا کرنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، پس اگر ان کو نماز کے بعد دعا مانگنے کے لئے نہیں کہا جائے گا تو بندے کا اللہ سے مانگنے کا تعلق ختم ہو جائے گا۔

دعا کی رسم:

مگر اب فرضوں کے بعد دعا رسم بن کر رہ گئی ہے، امام صاحب نے چند رَبَّنَا یاد کر لئے ہیں، وہ ہمیشہ انہی کو بالترتیب پڑھتے ہیں، اور شاید وہ بھی سمجھتے نہیں، جہاں ان کا سانس ٹوٹتا ہے: مقتدی آمین کہتے ہیں، یہ دعا نہیں ہے، دعا کی رسم ہے! دعا تو یہ ہے کہ ہر بندہ اپنے دل کی مراد اپنی زبان میں اللہ سے مانگے، محض دعا کا پڑھ لینا دعا نہیں، اس کو زیادہ سے زیادہ ذکر کہہ سکتے ہیں۔

دعا میں ہیئتِ اجتماعی اور التزام ختم کیا جائے

بہر حال نماز کے بعد دعا تو عجمی مسلمانوں کی ضرورت ہے، اس لئے ضروری ہے، مگر یہ

ضروری نہیں کہ سب کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھیں اور سب ایک ساتھ دعا ختم کریں جو جس وقت چاہے دعا شروع کردے اور جب اس کی دعا پوری ہوجائے: منہ پر ہاتھ پھیر کر جاسکتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جب امام صاحب دعا ختم کردیں تو مقتدی بھی ختم کردیں، اگر ان کی دعا باقی ہے تو مانگتے رہیں۔

اور اگر کسی کو کوئی ضرورت ہو تو وہ دعا مانگے بغیر بھی جاسکتا ہے۔ ذہنوں میں اس کی گنجائش رہنی چاہیے، بلکہ امام صاحب کو کوئی ضرورت ہو تو وہ بھی جاسکتے ہیں، کیونکہ امام اور مقتدیوں کا رابطہ سلام پر ختم ہوجاتا ہے۔

دعا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے:

اور اللہ تعالیٰ کو وہی بندے پسند ہیں جو اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں جو لوگ اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتے وہ اللہ کو پسند نہیں، سورۃ المؤمن کی (آیت ۶۰) ہے: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِىْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ، إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِىْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾: اور تمہارے پروردگار نے فرمایا: مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری درخواست قبول کرونگا۔ جو لوگ میری عبادت (دعا) سے سرتابی کرتے ہیں: وہ عنقریب ذلیل ہوکر جہنم رسید ہونگے!

باقی آئندہ!

مضمون یہ چل رہا تھا کہ دنیا کی چیزوں سے بہتر آخرت کی تین نعمتیں ہیں، بہشتِ بریں، پاکیزہ بیویاں اور اللہ کی خوشنودی، اور یہ نعمتیں ان لوگوں کو ملیں گی جن میں چھ باتیں پائی جاتی ہیں: پہلی بات: وہ مؤمن ہیں اور اللہ سے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور جہنم سے پناہ چاہتے ہیں۔ باقی پانچ باتیں آئندہ کل بیان کروں گا۔ آج ان کا تذکرہ چھیڑونگا تو بات لمبی ہوجائے گی، اس لئے یار زندہ صحبت باقی! والحمدللہ رب العالمین.

۱۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخرت کی نعمتیں کن لوگوں کو ملیں گی؟

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ، لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ○ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْأَسْحَارِ ○﴾

(آل عمران ۱۵-۱۷)

مکتبہ حجاز دیوبند

ترجمہ: آپؐ پوچھیں: کیا میں تمہیں وہ چیزیں بتلاؤں جو ان چیزوں سے بہ درجہا بہتر ہیں؟ ان لوگوں کے لئے جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور صاف ستھری بیویاں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان بندوں کو خوب دیکھتے ہیں ○ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، پس آپ ہمارے گناہ بخش دیں، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیں ○ وہ صبر شعار، راست باز، اطاعت کرنے والے، مال خرچ کرنے والے، اور آخر رات میں گناہوں کی معافی مانگنے والے ہیں ○

دنیا کی بہار چندروزہ ہے:

بزرگو اور بھائیو! مضمون کل سے یہ چل رہا ہے کہ یہ دنیا لوگوں کے لئے خوشنما بنائی گئی ہے اور اس کی وجہ سورۃ الکہف میں بیان کی ہے: ﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا

لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا○ وَإِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا﴾: ہم نے ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں: زمین کے لئے زینت بنایا ہے، تاکہ ہم تمہیں جانچیں کہ تم میں سے شاندار عمل کر کے کون آتا ہے؟ پھر زمین کی یہ زیبائش ختم ہو جانے والی ہے، ہم اس کو چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں، یہ دنیا سدا بہار نہیں ہے، چند روز کی بہار ہے! ہمیشہ کی آبادی اس دنیا کے لئے مقدر نہیں، مگر بلبل موسم بہار میں باغ کی رعنائیاں اور دل فریبیاں دیکھ کر وجد میں آتا ہے، اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ یہ بہار چند روزہ ہے، اس کا انجام خزاں ہے، ایک دن سب کچھ اجڑ جانے والا ہے، اور بلبل کی خوشی بھی ختم ہو جانے والی ہے، اس کی خوشی محض عارضی ہے، حقیقی خوشی وہی ہے جو ہمیشہ رہنے والی ہے، جس خوشی کا کوئی خاتمہ نہیں: وہی خوشی خوشی ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے:

اور اللہ تعالیٰ نے یہ خوشنما دنیا اس لئے پیدا کی ہے کہ اس کے ذریعہ آنے والی دنیا کے لئے تیاری کی جائے مگر انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اسی دنیا میں پھنسا رہتا ہے، اس سے بالاتر نہیں ہوتا، اس لئے اُس آیت میں جس کی تفسیر گذشتہ کل بیان کی تھی: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: لوگوں کے لئے خوشنما بنائی گئی ہیں دل پسند چیزیں، یعنی عورتیں، بیٹے، ڈھیر لگے ہوئے اموال، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتیاں۔ یہ سب دل پسند چیزیں ہیں، یہ سب چیزیں لوگوں کے لئے مزین کی گئی ہیں، لیکن اچھا انجام اللہ ہی کے پاس ہے، بہترین انجام دنیا میں نہیں ہے۔ البتہ اُس اچھے انجام کے لئے یہیں تیاری کرنی ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ جو دل لبھانے والی چیزیں ہیں ان میں عمل کر کے اُس دنیا کو آباد کرنا ہے۔

حدیثوں میں اس مضمون کو اس طرح سمجھایا ہے کہ جنت ایک چٹیل میدان ہے، انسان کا عمل اس میں باغ لگاتا ہے، ہم یہاں بارہ سننِ مؤکدہ پابندی سے پڑھتے ہیں تو وہاں ایک بلڈنگ تیار ہوتی ہے، ہم یہاں سبحان اللہ کہتے ہیں تو وہاں ایک درخت لگتا ہے، ہم اس دنیا میں اللہ کے لئے گھر بناتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جنت میں ہمارے لئے سونے چاندی کا محل تیار کرتے ہیں، ورنہ جنت چٹیل میدان ہے، ہر انسان کی جنت اس کے عمل سے آباد ہوتی ہے، سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔

جنت کے لئے کونسے اعمال ضروری ہیں؟

جنت حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ایمان ضروری ہے، پھر گناہوں کی بخشش طلب کرنا ضروری ہے، اور دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگنا ضروری ہے، اس کا تذکرہ کل کے بیان میں آچکا ہے۔

دوسری چیز: صبر ہے، اعمالِ اسلام میں صبر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے مذکورہ آیت میں سب سے پہلے اسی کا تذکرہ کیا ہے اور قرآنِ کریم میں دسیوں جگہ اس کا تذکرہ آیا ہے اور احادیث شریفہ بھی اس کے بیان سے بھری پڑی ہیں، معلوم ہوا کہ صبر ایک بہت بڑا اور بہت اہمیت والا عمل ہے۔

صبر کیا چیز ہے؟

صبر: عربی لفظ ہے اور ص، ب، ر کے معنی ہیں: روکنا۔ پرانے زمانے میں ظالم بادشاہ کسی کو قتل کرتے تھے تو دربار میں اس کو کھڑا کرکے گردن مارتے تھے، اس کو عربی میں کہتے تھے: قَتَلَهُ صبراً: روک کر مارا، پس صبر کے لغوی معنی ہیں: روکنا۔

اور اصطلاح میں نفس کو گناہوں سے روکنا صبر ہے، اور نیکیوں پر روکنا بھی صبر ہے آج ہی یہ آیت پڑھی گئی ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو اور سرحد کا پہرہ دو، اور اللہ سے ڈرو، یہی کامیابی کا راستہ ہے۔

غرض: جنت کی نعمتیں حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بندہ اللہ کے احکام پر خود کو روکے، اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے سے بھی خود کو روکے: یہی صبر ہے اور یہ اولوالعزمی کا کام ہے، پختہ ارادے والا ہی یہ کام کرسکتا ہے، ہر آدمی کے بس کی بات نہیں، آج ہی یہ آیت کریمہ پڑھی گئی ہے: ﴿وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾: اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو یہ پختہ عزمی کے کاموں میں سے ہے، یہ ہمت کا کام ہے، ہر آدمی کے بس کا نہیں۔

اور حدیث شریف میں ہے: الصبر ضیاء: صبر ایک روشنی ہے، اگر انسان کو یہ روشنی حاصل ہوجائے تو اس کی زندگی درخشاں ہوجائے اور اس کا بیڑا پار ہوجائے، لیکن صبر آسان نہیں، اس کے لئے تھوڑی ریہرسل کرنی پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے: مَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللهُ: جو بہ تکلف صبر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو صبر شعار بنادیں گے، شروع میں ہمت سے کام لینا پڑے گا، پھر طبیعت عادی ہوجائے گی، اور صبر کا ملکہ پیدا ہوجائے گا، اور زندگی روشن ہوجائے گی۔

قرآنِ کریم میں کل یہ آیت بھی پڑھی گئی ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر سے اور نماز سے مدد طلب کرو، صبر کو پہلے ذکر کیا ہے اور نماز کو بعد میں، اس سے صبر کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

صبر کی ضرورت کب پیش آتی ہے؟

جب آدمی کسی آفت میں گھر جاتا ہے، پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے تو کسی سے مدد مانگتا ہے۔ مدد کس سے مانگنی چاہئے؟ پہلے صبر سے پھر نماز سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں، نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہیں: یہ بات نہیں فرمائی، اس سے صبر کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اور دوسری وجہ تخصیص یہ ہے کہ نماز وہی پڑھے گا جو صبر کرے گا، جو صبر نہیں کرسکتا وہ نماز بھی نہیں پڑھے گا۔ کیونکہ اللہ کے احکام پر اپنے آپ کو روکنا بھی صبر ہے، اور اللہ کے احکام میں سے ایک حکم نماز ہے، اس لئے نماز کے لئے اپنے آپ کو وہی تیار کرتا ہے جو صبر شعار ہوتا ہے۔ جس کے اندر یہ کیفیت نہیں ہوتی وہ کٹھنائیوں میں بھی نماز کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اپنی الجھنوں میں پھنسا رہتا ہے، جبکہ حضور ﷺ کو کوئی بات پیش آتی تھی: آندھیاں چلتیں، بادل گرجتے، ہوا کے جھکڑ چلتے تو آپ فوراً نماز شروع کردیتے، نماز سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور صبر سے بھی قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، آدمی اللہ کے فیصلوں پر راضی ہوجاتا ہے، یہی وہ روشنی ہے جو صبر سے حاصل ہوتی ہے۔

جب آدمی میں صبر نہیں ہوتا تو وہ بہت سی مرتبہ پریشان ہوجاتا ہے، آپ روز اخباروں میں اور ریڈیو میں خودکشی کے واقعات پڑھتے سنتے ہیں، جاہل مسلمان بھی اس میں مبتلا ہیں،

ان میں بھی جب صبر نہیں ہوتا اور وہ اللہ کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے، تو جب وہ پریشان ہوجاتے ہیں، دنیا کی تکلیفوں سے گھبراجاتے ہیں تو مصیبت سے رستگاری کے لئے خودکشی کرلیتے ہیں، مگر اس طرح مصیبتوں سے نجات کہاں ملتی ہے؟ اگر مرکر نیست (No Thing) ہوجاتا تو بیشک مصیبت سے مُکت ہوجاتا، جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ مرکر ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہوجاتا ہے، اور دوسری دنیا میں نہ جانے کیا احوال پیش آئیں؟ کوئی ضروری نہیں کہ یہاں کے احوال سے بہتر احوال سامنے آئیں، یہاں سے برے احوال سے بھی سابقہ پڑسکتا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم میں اور احادیثِ شریفہ میں صبر پر بہت زور دیا گیا ہے، لوگوں کو چاہئے کہ اللہ کے فیصلوں پر راضی رہیں، جو بھی حالات پیش آئیں ان کا سینہ سپر ہوکر مقابلہ کریں، بیماری آئے، دشمن کی طرف سے کوئی مصیبت آئے، دین پر کوئی آفت آئے، کیسے بھی احوال پیش آئیں: ہر حال میں انسان پامردی کے ساتھ رہے، یہی صبر شعار لوگوں کا طریقہ ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

سچ بولنا جنت میں لے جاتا ہے:

تیسری صفت: سچ بولنا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: الصدقُ يَهْدِیْ إلى الْبِرِّ، وَالْبِرُّ يَهْدِیْ إلى الْجَنَّة: سچ بولنا نیک کاموں کا راستہ دکھاتا ہے، اور نیک کام جنت میں پہنچاتے ہیں۔ اور فرمایا: آدمی برابر سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے یہاں صدیق لکھا جاتا ہے، صدیق: نہایت سچا، بہت زیادہ سچ بولنے والا یعنی سچ بولنے کی مسلسل مشق صدیق بنادیتی ہے۔ اور فرمایا: جھوٹ بدکاری کا راستہ دکھاتا ہے اور بدکاری جہنم میں پہنچاتی ہیں، اور آدمی برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔ کذاب: بڑا جھوٹا، مہا جھوٹا۔ اور مشہور ارشاد ہے: الصدق يُنْجِیْ، والکذبُ يُهْلِك: سچ نجات دیتا ہے اور جھوٹ تباہ کرتا ہے۔ مگر آج دنیا والوں کا ذہن بدل گیا ہے، لوگ کہتے ہیں: جھوٹ بولے بغیر کام نہیں چلتا، جھوٹ ہی سے راستہ کشادہ ہوتا ہے، مصیبتوں سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا ضروری ہے۔ آج جھوٹ بولنا ایک فیشن ہوگیا ہے، جھوٹ کو آدمی کمال سمجھتا ہے۔

مگر اسلام یہ کہتا ہے کہ سچ بولو، سچ ایک نیکی ہے، اور ایک نیکی سے دوسری نیکی پیدا

ہوتی ہے، اور جب نیکیاں بہت جمع ہو جاتی ہیں تو آدمی جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ اور جھوٹ ایک برائی ہے، اور ایک برائی سے دوسری برائی پیدا ہوتی ہے، اور جب برائیاں بہت ہو جاتی ہیں تو آدمی جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

مقصد کی پردہ پوشی (توریہ) جائز ہے:

اس لئے میرے بھائیو! آج جو دنیا کا مزاج بن گیا ہے: وہ صحیح نہیں، اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے یہ ہے کہ سچ بولو، یہ الگ بات ہے کہ آدمی کسی موقعہ پر بات اس طرح کرے کہ وہ نہ سچ ہو نہ جھوٹ، کسی مصیبت میں آدمی پھنس گیا: ایسا کرنے کی اجازت ہے، صریح جھوٹ بولنے کی کسی حال میں اجازت نہیں، مگر یہ کہ جان بچانی ہو، لیکن آدمی اس طرح بات کر سکتا ہے کہ نہ سچ ہو نہ جھوٹ! یوں بھی مطلب ہو سکتا ہو اور وُوں بھی، ایسا کہنے کی گنجائش ہے۔

عربی میں اس کو توریہ کہتے ہیں، یعنی کذب بیانی سے بچ کر مقصد کی پردہ پوشی کرنا۔ حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر کا ارادہ فرماتے تو کسی دوسرے سفر سے توریہ کرتے، تاکہ دشمن کو نقل و حرکت کا پتہ نہ چل سکے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

حضرت نانوتویؒ کا توریہ:

دارالعلوم دیوبند جو آپ کا ادارہ ہے، اس کے بانی ہیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ، انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی تھی، شاملی کے میدان میں، اس جنگ میں مسلمان ناکام ہو گئے تھے، انگریز جن کی حکومت تھی کامیاب ہو گئے تھے، جنگ ختم ہونے کے بعد چند لوگوں کے نام وارنٹ نکلے، ان میں مولانا محمد قاسم صاحب کا نام بھی تھا۔ پولیس ان کی تلاش میں سرگرداں تھی، ایک دن پولیس کو کسی نے خبر کر دی کہ مولانا محمد قاسم صاحب اپنے گھر میں ہیں، پولیس نے آکر گھر کو گھیر لیا، حضرت مولانا سادہ مزاج اور سادہ لباس تھے، جیسے گھر کا نوکر ہوتا ہے، ان کو کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ کوئی بڑے آدمی ہیں۔ حضرت کو جب معلوم ہوا کہ پولیس نے مکان گھیر لیا ہے تو حضرت اطمینان سے

کندھے پر چادر ڈالے ہوئے نکلے، پولیس والوں نے ان کو روکا اور پوچھا: مولوی قاسم کہاں ہیں؟ ان کو یہ تو گمان ہی نہیں تھا کہ ایسا سیدھا سادہ آدمی بھی مولوی قاسم ہوسکتا ہے، انھوں نے سمجھا کہ گھر کا کوئی نوکر ہے، حضرت جہاں کھڑے تھے وہاں سے ایک قدم آگے بڑھ گئے، اور فرمایا: ابھی یہاں تھے، معلوم نہیں کہاں گئے! یہ کہہ کر آپ چل دیئے، اور پولیس کھڑی رہ گئی، جب پولیس گھر میں گھسی تو اندر کوئی نہیں تھا۔

غرض آدمی ایسی بات کہے جو نہ جھوٹ ہو نہ سچ اور سامنے والا دھوکہ کھا جائے تو اس کو توریہ کہتے ہیں، اور وہ جائز ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی سادگی کا ایک واقعہ:

ایک مرتبہ حضرت نانوتویؒ تفریح کرتے ہوئے دیوبند کے قریب ایک گاؤں مانکی میں پہنچے، وہاں مغرب کا وقت ہوگیا، مسجد میں امام صاحب نہیں تھے، لوگوں نے آپ سے پوچھا: تو نماز پڑھانا جانے؟ آپ نے فرمایا: پڑھا دیتا ہوں، انھوں نے کہا: پھر پڑھا دے! پھر اللہ جانے کیا ہوا: دونوں رکعتوں میں ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھ دی، انسان سے بھول ہوجاتی ہے، حضورؐ سے بھی بھول ہوئی ہے، سلام پھیرنے کے بعد لوگوں نے شور مچایا: نماز نہیں ہوئی! نماز نہیں ہوئی! حضرت نے فرمایا: نماز تو ہوگئی! لوگ خاموش ہوگئے اور حضرت لوٹ گئے، عشاء کے بعد لوگوں میں چرچا ہوا کہ مغرب کی نماز اللہ جانے ہوئی یا نہیں؟ صبح دیوبند کے مدرسہ میں جا کر فتوی پوچھنا چاہئے، گاؤں کا ایک وفد اگلے دن مدرسہ آیا، مدرسہ میں آ کر لوگوں سے پوچھا: یہاں بڑا مولوی کون ہے؟ طالب علموں نے ان کو حضرت کے کمرے میں پہنچادیا۔ اب وہ سارے دیکھتے ہیں کہ اسی نے تو نماز پڑھائی تھی، اب سب چپ چاپ بیٹھ گئے، کوئی بولتا نہیں، حضرت نے پوچھا: آپ حضرات کیوں تشریف لائے ہیں؟ مگر کوئی بولتا نہیں، جب بہت دیر ہوگئی تو ایک بولا: اجی مولبی جی! تو کل ہی بتا دیتا کہ میں ہی سب سے بڑا مولبی ہوں، تو ہم یہاں نہ آتے! غرض ایسا ہی آپ کا حال تھا، ایسی سادگی تھی کہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آپ کوئی عالم ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی سادگی کا دوسرا واقعہ:

ایک مرتبہ حضرت نانوتویؒ تفریح سے لوٹ رہے تھے، راستہ میں ایک دیہاتی گنّے کا گٹھر زمین پر رکھ کر سستا رہا تھا، جب حضرت وہاں سے گذرے تو اس نے کہا: او چودھری! یہ گٹھر میرے سر پے دَھر دے! حضرت نے جب گٹھر اٹھوانے کے لئے ہاتھ لگایا تو کہا: اگر تجھے بھار لگ رہا ہے تو میں اٹھالوں! اس نے کہا: اٹھالے نہ! آپ نے اٹھالیا، اور آپ آگے اور وہ پیچھے چلنے لگے۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تو کون ہے، کہاں سے آیا ہے، گنا کیوں لایا ہے اور کس کے لئے لایا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ فلاں گاؤں کا ہے، اور گنّا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے لئے ہدیہ لایا ہے، تاکہ وہ اس کا رس نکلوا کر کھیر پکا کر کھائیں۔ حضرت یہ بات سن کر چلتے رہے، جب شہر قریب آیا تو اس سے کہا: لے بھئی! اپنا گٹّھر، اس نے لے لیا اور حضرت دوسرے راستہ سے اپنی مسجد (مسجد چھتہ) میں اپنے کمرے میں آگئے۔ وہ بندہ اسی مسجد میں گنا لے کر پہنچا اور آپ ہی سے دریافت کیا: مولبی قاسم کہاں ہیں؟ آپ نے جواب دیا: مجھے ہی مولوی قاسم کہتے ہیں۔ اس نے آپ کو پہچان لیا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے ابھی گنا اٹھا کر اس کا تعاون کیا تھا۔ چنانچہ کہنے لگا: جی ہاں! تجھے گنا کی کھیر کھانی ہوگی! (اس لئے مولوی قاسم بن رہا ہے) وہ مسجد سے باہر نکلا، اور طلبہ سے دریافت کیا، طلبہ نے اس کو بتایا کہ یہی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ہیں، پس اس نے معذرت چاہی کہ میں نے آپ کے ساتھ گستاخی کی کہ آپ کو گنا اٹھوایا۔ غرض: حضرت ایسے سادہ تھے کہ جلدی کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ آپ کوئی بڑے عالم ہیں۔

توریہ کا ایک واقعہ:

ایک بڑے واعظ گذرے ہیں: عبدالرحمٰن بن جوزی۔ زور کا وعظ کہتے تھے، وعظ کی ایک مجلس میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی، (پہلے شیعہ سنیوں کی مجلس میں آتے تھے اور بات سنتے تھے، اب بالکل نہیں آتے، انھوں نے خود کو علاحدہ کرلیا ہے، اس لئے ان کی اصلاح رک گئی ہے، اب کوئی شیعہ سنی نہیں بنتا، اب ان کی فیلڈ الگ ہوگئی ہے۔ جیسے رضاخانیوں نے

دیوبندیوں کے ناپاک ہونے کا اتنا شور مچایا ہے کہ مسجد تک دھوتے ہیں، اور ہندو مسجد میں آجائے تونہیں دھوتے، اس طرح انھوں نے اپنا ریوڑ الگ کرلیا ہے، اس لئے ان کی اصلاح نہیں ہوتی، کیونکہ وہ ہمارے بیان میں نہیں آتے، ہماری بات نہیں سنتے اور جو رضا خانی نہیں ہیں، جہالت کی وجہ سے بدعتی ہیں، وہ ہماری مجلسوں میں آتے ہیں، اور جب ان کو قرآن وحدیث کی روشنی دکھائی جاتی ہے تو ان کی اصلاح بھی ہوتی ہے، مگر رضا خانی محروم رہتے ہیں، کیونکہ انھوں نے بدعات کو دین سمجھ لیا ہے) پس اُس ملی جلی مجلس میں کسی نے سوال کیا: ابوبکر افضل ہیں یا علی؟ بڑا نازک سوال تھا، اگر صحیح جواب دیں تو شیعہ شور مچائیں گے اور غلط جواب دیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں تو ضمیر کے خلاف بھی ہوگا اور سنی ناراض ہوجائیں گے۔ پس آپ نے جواب دیا: **أفضلُ الناس من كان بنتُه في بيته**: لوگوں میں سب سے افضل وہ ہیں جن کی بیٹی ان کے گھر میں ہے۔ سنیوں نے سمجھا کہ ابوبکرؓ کی بیٹی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) حضور کے گھر میں ہیں، اس لئے ابوبکرؓ افضل ہیں، اور شیعوں نے سمجھا کہ حضورؐ کی بیٹی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) حضرت علیؓ کے گھر میں ہیں، اس لئے حضرت علی افضل ہیں، اس طرح دونوں کی ناراضگی سے بچ گئے، اور ایسا جواب دیا کہ نہ سانپ بچے نہ لاٹھی ٹوٹے، اس کو توریہ کہتے ہیں، اور اس کی گنجائش ہے۔

توریہ کا دوسرا واقعہ:

جب نبی ﷺ نے ہجرت فرمائی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ساتھ تھے، مکہ والوں نے چاروں طرف اعلان کررکھا تھا کہ جو ان کو زندہ پکڑ کر لائے یا ان کے سر لائے: اس کو سو اونٹ دیئے جائیں گے۔ طالع آزما چاروں طرف تلاش کررہے تھے، ایک جگہ کچھ لوگوں نے آپؐ کو اور ابوبکرؓ کو دیکھ لیا، وہ حضرت ابوبکرؓ کو جانتے تھے، مگر آپؐ کو نہیں پہچانتے تھے، انھوں نے ابوبکرؓ سے پوچھا: یہ تمہارے ساتھ کون آدمی ہے؟ آپؓ نے جواب دیا: **رجلٌ يَّهْدِيْنِي السبيل**: ایک آدمی ہے جو مجھے راستہ دکھا رہا ہے۔ آپؓ کی مراد یہ تھی کہ یہ ہمارے نبی ہیں جو ہمیں دین کا راستہ دکھاتے ہیں۔ مگر وہ لوگ سمجھے کہ یہ ابوبکر کا گائڈ (راہ نما) ہے جو پہاڑی علاقہ میں راہ نمائی کررہا ہے، اس طرح کا جملہ توریہ کہلاتا ہے، جس کی گنجائش ہے، یہ جھوٹ نہیں۔

چوتھی صفت: اطاعت شعاری:

قَنَتَ قُنُوْتًا کے لغوی معنی ہیں: اطاعت شعاری، فرمانبرداری، انکساری، فروتنی اور عاجزی۔ قَنَتَ لَہٗ: کسی کے سامنے عاجزی وانکساری کرنا، اور آیت میں معنی ہیں: خدا کا فرمانبردار ہونا، اللہ کے سامنے کمال انکساری سے اظہار بندگی کرنا۔ قَانِت: اطاعت شعار اور فرمانبردار۔

اللہ پر ایمان رکھنے والے بندے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر بھی اس کی فرمانبرداری پر جمے رہتے ہیں، اور معصیت سے رُکے رہتے ہیں، اور لوگوں کے ساتھ بھی انکساری سے پیش آتے ہیں، تکبر وغرور اللہ کو ہرگز پسند نہیں۔ حدیث میں ہے: جو سر اونچا کرتا ہے: ذلیل کیا جاتا ہے، اور جو اپنے آپ کو نیچا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اونچا کرتے ہیں، بہر حال تکبر اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

تکبر کیا ہے؟

مگر تین چیزیں الگ الگ ہیں:

ایک: ہے نفاست اور نظافت۔ آدمی کو یہ پسند ہو کہ صاف ستھرے کپڑے پہنے، گھر صاف ستھرا رکھے، اس کی کار صاف ستھری ہو، اس کی ہر چیز عمدہ ہو، گندگی اور بے ترتیبی اسے پسند نہ ہو: یہ تکبر نہیں ہے، یہ تو نظافت و پاکیزگی ہے اور یہ ایمان کا حصہ ہے۔

دوسری چیز: ہے خودداری۔ خودداری بھی تکبر نہیں۔ خودداری یہ ہے کہ آدمی خود کو پہچانے کہ میں کیا ہوں؟ اپنے آپ کو کسی جگہ ذلیل نہ کرے، خود کو پہچانے کہ میں مؤمن ہوں، مجھے ایک مؤمن کی حیثیت سے باوقار رہنا چاہئے، مجھے خود کو کسی کے سامنے ذلیل نہیں کرنا چاہئے، اپنے آپ کو ذلیل کرنے سے بچنا خودداری ہے، خودداری تکبر نہیں۔

تیسری چیز: تکبر ہے، تکبر کیا ہے؟ بَطَرُ الحقِّ وَغَمْطُ الناسِ: حق کے سامنے اکڑنا اور لوگوں کو ذلیل سمجھنا: تکبر ہے۔ حق بات سامنے آئے تو اسے نہ ماننا، گھمنڈ کرنا کہ مجھے کون کہنے والا ہے! اور لوگوں کو نظروں سے گرا دینا، اور یہ سمجھنا کہ ہم چوں دیگرے نیست! میں

ہی سب سے اچھا اور سب سے بڑا ہوں، میں تو دوسروں سے کہہ سکتا ہوں، مگر دوسروں کو کیا حق ہے کہ مجھ سے کچھ کہیں! سوچنے کا یہ انداز تکبر ہے جو اللہ کو ناپسند ہے۔

حدیث شریف میں ہے: **من تواضع للہ رفعہ اللہ**: جو خود کو اللہ کے لئے چھوٹا بناتا ہے: اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے: نہد شاخِ پُر میوہ سر برزمیں: جو ٹہنی میوؤں سے لدی ہوئی ہوتی ہے وہ زمین کی طرف جھکتی ہے اور جو ٹہنی میوؤں سے خالی ہوتی ہے وہ اوپر کو اٹھتی ہے۔ باکمال آدمی بھی خود کو بڑا نہیں سمجھتا۔ کھوکھلا ڈھول ہی بجتا ہے۔

پس جب بھی کوئی حق بات سامنے آئے: فوراً قبول کر لینی چاہئے، خواہ حق بات کہنے والا معمولی آدمی کیوں نہ ہو، کیونکہ حق بات معمولی نہیں ہوتی، حق بات بڑی ہوتی ہے، اس لئے جب حق بات سامنے آئے تو فوراً مان لینی چاہئے۔ یہی آدمی کا کمال ہے۔

اللہ کے راستے میں خرچ کرنا جنت نشیں بناتا ہے:

پانچویں صفت: انفاق ہے۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا بھی جنت میں پہنچاتا ہے۔ ہر انسان دنیا میں کماتا ہے، لیکن جو پانی آ رہا ہو اگر وہ جمع ہوتا رہے، اس کے نکلنے کا راستہ نہ ہو تو پانی سڑ جائے گا، اور اگر اس کے نکلنے کا راستہ ہو تو آنا بھی بند نہیں ہوگا اور پانی بھی تازہ رہے گا۔ اس لئے آخرت کو آباد کرنے کا بہترین راستہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا ہے، مال اناپ شناپ نہیں اڑانا چاہئے، اپنی ضروریات میں خرچ کرے، اللہ نے اس سے منع نہیں کیا، اپنے گھر والوں پر خرچ کرے اور اپنی حاجتیں پوری کرے: اس سے اللہ نے نہیں روکا۔

قارون کو اہل علم نے سمجھایا تھا کہ تیرا جو دنیا میں سے حصہ ہے اسے مت بھول، جو اللہ نے تجھے مال دیا ہے اس کو اپنی ضروریات میں خرچ کر، اور جو بچے اسے اللہ کے راستہ میں خرچ کر، اور جان لے کہ اللہ کے راستہ میں تو جو خرچ کر رہا ہے وہ اپنے ہی لئے خرچ کر رہا ہے۔

آخرت کو آباد کرنے کی راہیں:

عبادتیں دو ہیں: بدنی اور مالی۔ یہی دو بنیادی عبادتیں ہیں، لوگ بدنی عبادتیں تو آسانی

سے کر لیتے ہیں، مگر جب مال خرچ کرنے کا وقت آتا ہے تو ہزار بار سوچتے ہیں، ٹھیک ہے اگر کسی کی اپنی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، اور وہ سوچ کر خرچ کرتا ہے تو بہتر کرتا ہے، لیکن ایک کے پاس اتنا مال پس انداز کیا ہوا ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروریات سے زائد ہے، اس وقت بھی اگر آدمی قدر واجب خرچ کرنے سے ہاتھ روک لے تو وہ جنت کیسے حاصل کرسکتا ہے۔

مال خرچ کرنا مشکل کیوں ہے؟

مگر مال خرچ کرنا مشکل ہوتا ہے، ایک تو مال کی محبت فطری ہے: ﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْد﴾: اور وہ (انسان) مال کی محبت میں بڑا مضبوط ہے (العادیات ۸) پھر انسان مایہ ناز ہے، مال اس کے لئے فخر کی چیز ہے، اس لئے وہ سوچتا ہے کہ اس کے پاس مال زیادہ سے زیادہ جمع رہنا چاہئے، تا کہ اس کا سر اونچا ہو جائے۔

پھر انسان کے ساتھ وقتی اور ناگہانی حاجتیں لگی ہوئی ہیں، وقتی حاجتوں کا تو خود شریعت نے لحاظ کیا ہے، اور ایسے شخص پر زکات واجب نہیں کی، مگر جو صاحب نصاب ہے اس کے پاس مال حاجتوں سے بچا ہوا ہے اور سال بھر بچا رہا ہے: وہ بھی ناگہانی حاجتوں سے ڈرتا ہے۔ سوچتا ہے: آگے معلوم نہیں کیا خرچ کرنا پڑے، شریعت نے اس کا بھی لحاظ کیا ہے، چنانچہ نصاب کا تھوڑا سا حصہ ہی خرچ کرنے کے لئے کہا ہے۔

خرچ کرنے کی درمیانی راہ:

اور یہ بھی شریعت کا حکم ہے کہ ہاتھ بالکل کھول نہ دو، ورنہ پریشان ہو کر رہ جاؤ گے، اور ہاتھ گلے سے باندھ بھی نہ لو، ورنہ ساری دنیا تم پر پھٹکار بھیجے گی، کہے گی: بڑا مکھّی چوس ہے! اس کی مٹھی کبھی کھلتی ہی نہیں، پس درمیانی راستہ اختیار کرو۔

مال لوگوں کے لئے سہارا ہے:

سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال کو مایۂ زندگی بنایا ہے، وہ لوگوں کے لئے سہارا ہے، جیسے یہ ستون چھت کے لئے سہارا ہیں، ایسے ہی مال لوگوں کے لئے

سہارا ہے، اگر مال نہ رہے تو آدمی ہمت ہار جاتا ہے، لیکن اگر چھت کے نیچے ضرورت سے زائد ستون کھڑے کر رکھے ہوں، اور ان میں سے بعض نکال دیئے جائیں جو فالتو (ضرورت سے زائد) ہیں: تو اس میں کیا حرج ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

مال اللہ کا ہے: بندے اس میں نائب ہیں:

میرے بھائیو! قرآنِ کریم میں اللہ پاک کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَأَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾: اور جس مال میں اس نے تم کو اپنا قائم مقام کیا ہے: اس میں سے خرچ کرو (الحدید ۷) یعنی یہ مال اللہ کا ہے تم کو اس کا منیجر (منتظم) بنایا ہے، اپنا نائب بنایا ہے۔ اب اللہ حکم دیتے ہیں کہ میرا جو مال تمہارے پاس ہے اس میں سے اتنا خرچ کرو، تو تم کیوں ہچکچاتے ہو؟ مال تمہارا کہاں ہے؟

پھر تم اس میں سے جو خرچ کرو گے: اللہ تعالیٰ اس کا عوض دیں گے: ﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾: تم جو کچھ خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کا عوض دیں گے (سبا ۳۹) عوض کدھر سے آئے گا؟ معلوم نہیں کدھر سے آئے گا! قرآنِ کریم میں ہے: ﴿يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَايَحْتَسِبُ﴾: اللہ اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچاتے ہیں جہاں گمان بھی نہیں جاتا (الطلاق ۳)

ایک معاملہ شرعاً ناجائز ہے، اس میں سودوسوڈالر کا فائدہ ہے، مگر ایک آدمی وہ معاملہ ناجائز ہونے کی وجہ سے نہیں کرتا، نقصان برداشت کر لیتا ہے، پس اللہ تعالیٰ معلوم نہیں کہاں سے اس کا عوض دیدیں گے، اسے گمان بھی نہیں ہوگا، ایسی جگہ سے وہ مل جائے گا۔

سحری کا وقت قیمتی وقت ہے:

چھٹی اور آخری صفت ہے: سحری کے وقت اٹھ کر اللہ کے سامنے گڑگڑانا، اور معافی مانگنا کہ خدایا میرے گناہ معاف فرما! یہ قبولیتِ دعا کا وقت ہے، سحری کا وقت تہجد کا وقت ہے، آج کل ماہِ مبارک میں ہر کوئی اٹھتا ہے، کیونکہ سحری سنت ہے، سحری کرنے کی فضیلتیں آئی ہیں، مگر اٹھنے کے بعد سارا وقت کھانے پینے کی نذر ہو جاتا ہے، دو رکعات نفلیں پڑھنے کی

ہمیں توفیق نہیں ہوتی، کیوں نہیں ہوتی؟ ہم چاہتے ہی نہیں، چاہیں گے تو توفیق ملے گی۔

میرے بھائیو! یہ بہت قیمتی وقت ہے، اور رمضان میں تو مفت میں یہ وقت ہاتھ آ جاتا ہے، لہٰذا جو شخص سحری میں اٹھے وہ دو یا زیادہ نفلیں پڑھے، اور نفلیں پڑھنے کے بعد خوب گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں کرے۔ ہماری زندگی کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہے۔ پس تمام گناہوں سے اللہ سے معافی مانگے۔

گناہوں کی معافی کے لئے تین شرطیں:

مگر گناہوں کی معافی کے لئے تین شرطیں ہیں، اگر یہ تین شرطیں پائی جائیں گی تو توبہ ہے، ورنہ زبانی جمع خرچ ہے:

پہلی شرط: جو گناہ ہو گیا ہے اس پر پشیمانی ہو۔

دوسری شرط: عہد کرے کہ آئندہ وہ یہ گناہ نہیں کرے گا۔

تیسری شرط: پھر اللہ سے قول سے یا فعل سے معافی مانگے، زبان سے معافی طلب کرنا تو ظاہر ہے، اور فعل (طرز عمل) سے معافی مانگنا یہ ہے کہ زندگی کا ورق پلٹ دے، بری زندگی چھوڑ کر اچھی زندگی اختیار کر لے، یہی اصل توبہ ہے، زندگی کا رخ پھیرے بغیر محض زبان سے توبہ تلاّ کرنا بے معنی ہے۔

بھائیو! اپنی زندگیوں کا جائزہ لو، اپنی زندگیوں میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، عبادتوں میں جو کمیاں ہوئی ہوں، معاملات میں جو کمیاں ہوئی ہیں، اخلاق میں، کاروبار میں، لباس میں، چہرے کی تراش خراش میں جو خلاف شرع کام کئے ہیں، ان پر انفعال کے آنسو بہاؤ اور آئندہ ان معاملات کو سنوارو، اور ان غلط باتوں سے دور رہنے کا عہد و پیمان کرو، اور اللہ سے معافی مانگو، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اللہ کی بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں، ان کے دروازے پر جو دستک دیتا ہے تو وہ کھل جاتا ہے، ان کی چوکھٹ پر جو جا پڑتا ہے اس کو وہ دھتکارتے نہیں۔

ایں درگہ ما درگہ نوامیدی نیست ❁ اگر صد بار توبہ شکستی باز آ!

اگر ہزار مرتبہ بھی توبہ توڑی ہے پلٹ آ! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں!

خلاصہ: فرمایا: دنیا کی یہ دل خوش کرنے والی چیزیں جن پر تم ریجھتے ہو، جن پر تم رال

ٹپکاتے ہو، جن کے پیچھے تم رات دن پڑے ہوئے ہو، اور جن کے پیچھے تم اپنی تمام توانائیاں صرف کررہے ہو: ان سے بہتر بہشتِ بریں کی نعمتیں ہیں، وہ سدا بہار ہیں، وہاں پاکیزہ حوریں ملیں گی اور ان سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ مگر یہ چیزیں ان مؤمنین کو ملیں گی جو اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں، جہنم سے رستگاری کی دعائیں کرتے ہیں، صبر شعار، راست باز، فرمانبردار، مال خرچ کرنے والے اور آخر شب میں اٹھ کر گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔ آخرت کی یہ نعمتیں صرف دنیا میں پھنسے رہنے والوں کے لئے نہیں ہیں، بلکہ ان بندوں کے لئے ہیں جو دنیا میں رہ کر آخرت کی تیاری کرتے ہیں۔ پھر دنیا کی یہ چیزیں دنیا کی چیزیں نہیں رہتیں، آخرت کی چیزیں بن جاتی ہیں۔

میرے بھائیو! اسے خوب سمجھ لو! اللہ جل شانہ وعم نوالہ نے ہمیں اس دنیا میں جو نعمتیں دی ہیں، وہ اپنی آخرت کو آباد کرنے کے لئے دی ہیں۔ اللہ ہمیں اس مضمون کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں، اور ہمارا مطمح نظر دنیا کو نہ بنائیں، بلکہ اس دنیا کے ذریعہ آخرت کو آباد کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین) **وآخر دعوانا أن الحمد لله العالمین.**

۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نیکیوں کا پورا اجر آخرت میں ملے گا

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے، اور انھوں نے نیک کام کئے، ان کے لئے ایسا اجر ہے جو کبھی موقوف ہونے والا نہیں [حٰم السجدة ۸]

ایمان کے بغیر نیک کام کی آخرت میں کوئی قیمت نہیں

بزرگو اور بھائیو! یہ حٰم السجدة کی آیت ہے، اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ﴾ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ ایمان کے بغیر نیک کام کی آخرت میں کوئی قیمت نہیں، حدیث میں ہے: ایمان کے بغیر نیک کام کرنے والوں کو ان کی نیکی کا اجر دنیا میں کھلا دیا جاتا ہے، آخرت میں ان کے نیک کام کی کوئی قدر و قیمت نہیں، وہاں ایمان کے ساتھ کی ہوئی نیکی کی قدر و قیمت ہے۔

قرآنِ کریم میں غیر مسلموں کے نیک کاموں کی کئی تمثیلیں آئی ہیں، ان میں سے ایک تمثیل ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً﴾: وہ لوگ جنھوں نے اللہ کا اور اس کے رسول کا انکار کیا: ان کے (نیک) اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے لق و دق میدان میں چمکتی ریت۔ جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، مگر آدمی اس کو پانی سمجھتا ہے اور خوش خوش وہاں پہنچتا ہے ﴿حَتّٰى إِذَا جَاءَ هٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا﴾ یہاں تک کہ

جب وہ وہاں پہنچتا ہے تو وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ کفار جنھوں نے نیک اعمال کر رکھے ہیں اور ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں اُن کو ان اعمال کی مرنے کے بعد ضرورت پیش آئے گی، مگر جب وہ امید لے کر قیامت میں آئیں گے ﴿لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا﴾ تو وہاں کچھ بھی نہیں پائیں گے ﴿وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهُ فَوَفّٰهُ حِسَابَهُ﴾ اور وہ اس سراب کے پاس اللہ پاک کو پائیں گے، پس اللہ پاک اس کو اس کا پورا پورا حساب چکائیں گے، یعنی موت کے بعد لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

قرآنِ کریم میں ایسی متعدد مثالیں آئی ہیں، سب کا حاصل یہ ہے کہ نیک اعمال ایمان کے ساتھ ہی آخرت میں کارآمد ہیں، اگرچہ ایمان کے بغیر بھی نیک اعمال: نیک اعمال ہیں، برے نہیں ہیں، لیکن ان کا صلہ اللہ تعالیٰ عمل کرنے والے کو دنیا ہی میں دیدیتے ہیں، آخرت میں اس کے لئے کچھ نہیں بچتا، البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے کبھی ختم نہ ہونے والا بدلہ ہے، اس آیت میں دو باتیں ہیں: ایک: ان کو نیک اعمال کا بدلہ آخرت میں ملے گا، دوسری: وہ بدلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

نیکی اور برائی میں تین فرق:

انسان بشر ہے، وہ اچھے اعمال بھی کرتا ہے اور برے اعمال بھی، اور نیکی اور برائی میں تین فرق ہیں:

پہلا فرق: برائی مٹنے والا عمل ہے اور نیکی جب وجود میں آجاتی ہے تو وہ نہ مٹنے والا عمل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّآتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذَّاكِرِيْنَ﴾: بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، ختم کردیتی ہیں، یہ نصیحت پذیر ہونے والوں کے لئے ایک نصیحت ہے۔ نصیحت یہ ہے کہ نیکیاں کرو، نیکیوں سے دانستہ یا نادانستہ کی ہوئی برائیاں مٹ جاتی ہیں، اور حدیث میں ہے کہ وضوء میں چہرہ دھوتے وقت چہرے کے گناہ نکل جاتے ہیں، ہاتھ دھوتے وقت ہاتھ کے گناہ نکل جاتے ہیں، مسح کرتے وقت سر کے گناہ نکل جاتے ہیں، اور پیر دھوتے وقت پیر کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں تو ایک نماز سے دوسری نماز تک کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، جمعہ سے جمعہ تک کے

گناہ جمعہ کی وجہ سے معاف ہوجاتے ہیں، عرفہ کا روزہ رکھنے سے دوسال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، عاشوراء کا روزہ رکھنے سے ایک سال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ ایسی اور بھی حدیثیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گناہ مٹنے والا عمل ہے، حتی کہ سب سے بڑا گناہ کفر وشرک بھی توبہ سے اور ایمان لانے سے مٹ جاتا ہے: **إن الإسلام يهدم ما كان قبله**: اسلام سابقہ تمام گناہوں کو ڈھادیتا ہے۔

الغرض اگر آدمی مٹانا چاہے تو ہر برائی مٹ سکتی ہے اور برائیوں کے مٹنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بے شمار اسباب رکھے ہیں۔ اور نیکی وجود میں آنے کے بعد نہیں مٹتی، بس ایک ہی صورت میں مٹتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **﴿وَلَقَدْ أُوْحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ، لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾**: اور آپؐ کی طرف اور ان پیغمبروں کی طرف جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں: یہ وحی بھیجی جاچکی ہے کہ اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کرایا سب اکارت ہوجائے گا، اور تو ٹوٹا پانے والوں میں سے ہوجائے گا (الزمر ۶۵)

دوسرا فرق: نیکی کا اجر مضاعفۃً دیا جاتا ہے، دوچند کر کے دیا جاتا ہے اور برائی کی سزا بڑھائی نہیں جاتی، جتنی برائی کی ہے اتنی ہی سزا دی جاتی ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

نیکی کا اجر کتنا بڑھتا ہے؟

عام ضابطہ یہ ہے کہ ایک نیکی کا اجر دس گنا تو ملتا ہی ہے، یہ کم از کم ہے، اور زیادہ سے زیادہ سات سو گنا ملتا ہے، مگر اس میں دو استثناء ہیں: ایک روزہ مستثنیٰ ہے، دوسرا: انفاق فی سبیل اللہ مستثنیٰ ہے۔ روزہ کا بھی کم از کم تو دس گنا ہی ہے، لیکن زیادہ سات سو پر نہیں رکتا۔ کہاں تک جاتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُسے ڈکلیر (ظاہر) نہیں کیا۔ حدیث میں ہے: **للصائم فرحتان: فرحة عند فطره، وفرحة عند لقاء ربه**: روزہ دار کے لئے دوخوشیاں ہیں: ایک خوشی: اس کو افطار کے وقت ہوتی ہے، اور دوسری خوشی: جب اس کی اس کے پروردگار سے ملاقات ہوگی، اور وہ اس کو روزے کا ثواب عطا فرمائیں گے تو وہ ثواب وہم وگمان سے بھی زیادہ ہوگا، اور وہ خوش خوش ہوجائے گا۔

جو فرشتے اچھائیاں اور برائیاں لکھتے ہیں وہ ادھورا رجسٹر تیار نہیں کرتے، کامل رجسٹر تیار کرتے ہیں، نیکی بھی لکھتے ہیں، اور اس کے مقابل اجر کے خانہ میں اجر بھی لکھتے ہیں، لیکن نیکی لکھنے والے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت دی ہے کہ الصوم لی وأنا أَجْزِیْ بہ: میرے بندے نے روزہ میرے لئے رکھا ہے اور میں ہی اس کے روزے کا ثواب دونگا، پس تم روزے کے مقابل ثواب کا جو خانہ ہے اس کو خالی چھوڑ دو، غرض فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ کس کے روزے کا کتنا ثواب ہے۔ پس ایک استثناء تو یہ ہے۔

دوسرا: انفاق فی سبیل اللہ مستثنیٰ ہے یعنی اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جو محنتیں ہوتی ہیں ان میں خرچ کرنا مستثنیٰ ہے، اس کا کم از کم ثواب دس گنا نہیں ہے بلکہ سات سو گنا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ، فِیْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّاَةُ حَبَّةٍ﴾: اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کے ثواب کی مثال بیان کی ہے کہ گیہوں کا ایک دانہ ہے، اس کو بویا تو اس میں سے سات بالیاں نکلیں ہر بالی میں سو دانے ہیں، پس کل سات سو دانے ہوئے۔ غرض جو مال اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے خرچ کیا جاتا ہے اس کا ثواب سات سو سے شروع ہوتا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾: اور اللہ جس کے لئے چاہتے ہیں اجر بڑھا دیتے ہیں مگر زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا۔ اور حدیث میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میرے صحابہ نے ایک مد (ساڑھے چار سو گرام) جو جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے خرچ کئے ہیں: اگر بعد کے لوگ احد پہاڑ کے بقدر خرچ کریں تو بھی ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اندازہ کیجئے: صحابہ کے ایک مد کا ثواب کہاں تک پہنچے گا۔

ثواب کیسے بڑھتا ہے؟

اور ثواب بڑھنے کا بھی ایک ضابطہ ہے اور وہ یہ ہے کہ موقعہ اور محل کے تقاضے سے ثواب بڑھتا ہے۔ آپ نے یہ حدیث سنی ہوگی کہ ایک رنڈی نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلایا اور اس کی جان بچائی تو اللہ نے اُسے جنت دیدی، ہم بوتلیں بھر بھر کر پلائیں تو بھی یہ ثواب نہیں مل سکتا، وہ موقعہ کی بات تھی، ایک کتے کی جان جارہی تھی اور اس کے پاس پانی

نکالنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی، اس نے کنویں میں اتر کر موزے میں پانی بھرا، اور موزے کو دانتوں میں پکڑ کر باہر نکلی اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ نے تھینک یو کہا: **فشکر اللہ لھا**: اللہ کا تھینک یو کہنا یہ ہے کہ اللہ نے اس کو جنت عطا فرمادی، اس طرح کہ اس کی زندگی بدل گئی، وہ اللہ کی نیک بندی بن گئی اور اعمالِ صالحہ پر اس کی زندگی ختم ہوئی، اور مری اور جنت میں پہنچ گئی۔ پس یہ موقع کے اعتبار سے ثواب بڑھنا ہے۔ اسی طرح صحابہ کا ایک مدجو جو ثواب میں بڑھ گیا ہے: وہ موقع ہی کی بات ہے، فتح مکہ سے پہلے کیا ہوا خرچ اور فتح مکہ کے بعد کیا ہوا خرچ یکساں نہیں۔ سورۃ الحدید (آیت ۱۰) میں ہے۔ ﴿لَايَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ، أُوْلٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتِلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾: تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کیا اور لڑے وہ برابر نہیں، وہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بہت بڑھے ہوئے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑے، اور یوں اللہ نے بھلائی (ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

تیسرا فرق: مؤمن کو نیکی کا بدلہ آخرت میں ملتا ہے، دنیا میں نہیں ملتا، اور گناہ دنیا میں مٹتا ہے یا اس کی سزا ملتی ہے، کیونکہ اگر دنیا میں نیکی کا اجر دیدیا جائے تو مؤمن کا بڑا نقصان ہوگا، دنیا کی زندگی چند دن کے بعد ختم ہونے والی ہے، اب اگر دنیا میں نیکی کا اجر دیدیا جائے جیسے نمازوں کے بدلے میں ایک محل مل جائے تو جب وہ اسّی سال میں مرجائے گا تو محل یہیں پڑا رہ جائے گا۔ پس مؤمن کا بڑا نقصان ہوگا، اور آخرت میں اجر ملے گا تو وہ ابد تک باقی رہے گا۔

غرض: نیکی کا کچھ بھی اجر اس دنیا میں نہیں ملتا وہ آخرت میں ملے گا اور یہ مضمون سورۂ یوسف میں آیا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں دو جگہ تبدیلی آئی ہے، دونوں جگہ قرآنِ کریم نے واقعہ روک کر عبرت ابھاری ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں ڈال دیئے گئے تھے، نو سال جیل میں رہے، پھر بادشاہ نے خواب دیکھا، اس کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے بتائی، اور تدبیر بھی بتائی، بادشاہ تعبیر سن کر بڑا عقیدت مند

ہوگیا اور حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے حاضری سے انکار کر دیا، اور کہا: جس مقدمہ میں مجھے جیل میں ڈالا گیا ہے، پہلے اس مقدمہ کو فائنل کرو، میرا جرم ہے یا نہیں؟ یہ واضح کرو، بادشاہ نے کورٹ سے وہ مقدمہ اپنے پاس منگوالیا، اور مقدمہ دوبارہ شروع ہوا، اور الزام لگانے والی تمام عورتوں کو بادشاہ نے طلب کیا اور پوچھا: بتاؤ معاملہ کیا ہے؟ سب نے کہا: ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ﴾: سبحان اللہ! ہم نے ان میں کوئی برائی نہیں جانی! اور خاص الزام لگانے والی عورت عزیز مصر کی بیوی نے کہا: وہ سچا ہے، جھوٹ میں نے گھڑا تھا۔ پس مقدمہ فائنل ہوگیا کہ یوسف علیہ السلام بے گناہ ہیں، مصر کی عورتوں نے ان پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اب حضرت یوسفؑ بلائے گئے، حضرت تشریف لائے، اور ایک بات عجیب کہی کہ یہ جو میں نے مقدمہ چلوایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عزیز مصر جو میرا آقا ہے، اس نے مجھے اولاد کی طرح پالا ہے، عزت کے ساتھ گھر میں رکھا ہے، اس کا ذہن صاف ہو جائے کہ میں نے اس کے حرم میں ہاتھ نہیں ڈالا، کیونکہ لکڑی کا گھوڑا چلا نہیں کرتا، اور کاٹھ کا الو بولا نہیں کرتا، یہ مقدمہ میں نے کچھ اپنی براءت کے لئے نہیں چلوایا کہ میں دودھ کا دھلا ہوا ہوں۔ میں اپنے نفس کو کچھ پاک نہیں سمجھتا، ہر نفس برائی کا حکم دینے والا ہے، ہاں اللہ جس کی حفاظت فرمائیں وہ گناہ سے بچ جاتا ہے۔

غرض: میں نے یہ مقدمہ اپنے آقا کا ذہن صاف کرنے کے لئے چلوایا ہے، اپنے آپ کو دودھ کا دھلا ہوا ثابت کرنے کے لئے نہیں چلوایا۔

پھر جب بادشاہ سے براہ راست گفتگو ہوئی تو وہ اور عقیدت مند ہوگیا اور اس نے کہا کہ آپ نے جو تعبیر بتائی ہے اس پر عمل درآمد مشکل ہے۔ حضرت نے فرمایا: یہ کام میں کرسکتا ہوں، پورے ملک کی پیداوار میرے کنٹرول میں دیدو، میں سب انتظام کرلوں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ملک کی تمام پیداوار آپ کے کنٹرول میں دیدی۔

یہاں قرآن نے قصہ روک کر نصیحت فرمائی ہے کہ دیکھو! ابھی ایک قیدی کال کوٹھری میں سالوں سے سڑ رہا تھا، اب وہ ملک مصر کی ساری پیداوار کا مالک ہوگیا ہے، اور پورا ملک اس کا گھر بن گیا ہے کہ جہاں چاہے رہے! ﴿وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْأَرْضِ

یَتَبَوَّأُ مِنۡهَا حَيۡثُ يَشَاءُ﴾

پھر ایک سوال کا جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نیک کام کرنے والے بندے کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں نہیں کرتے جیسا اللہ نے یوسفؑ کے ساتھ کیا؟ جواب یہ دیا ہے کہ یہ یوسفؑ کے ساتھ خاص معاملہ تھا، ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر نیک بندے کے ساتھ ایسا معاملہ کریں کیونکہ نیکی کا بدلہ دنیا میں نہیں دیا جاتا ﴿نُصِيۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَاءُ﴾: ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت سے ہمکنار کرتے ہیں ﴿وَلَا نُضِيۡعُ أَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾ اور نیکوکاروں کا اجر ہم ضائع نہیں کرتے۔ یعنی جن کو دنیا میں اجر نہیں دیا جاتا ان کا اجر ضائع نہیں ہوتا، ان کو آخرت میں اجر ملتا ہے۔ ﴿وَلَأَجۡرُ الۡآخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ آمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ﴾: اور جو لوگ ایمان لائے اور پرہیزگار بنے ان کے لئے اس دنیا میں اجر دینے سے بہتر آخرت میں اجر دینا ہے۔ کیونکہ دنیا کا اجر ختم ہونے والا ہے اور آخرت کا اجر ہمیشہ رہنے والا ہے۔ بہرحال ان آیات میں یہ بتایا کہ نیکیوں کا اجر دنیا میں نہیں دیا جاتا، البتہ کسی کو دیگ کے چند چاول چکھائے جاتے ہیں، اور وہ بھی اللہ کی مصلحت ہوتی ہے، تب!

صحابہ میں حضورؐ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جب شہید ہوئے ہیں تو ان کی ملکیت میں صرف ایک چادر تھی، اسی میں کفن دیا گیا اور وہ چادر اتنی چھوٹی تھی کہ سر کی طرف کھینچتے تھے تو پیر کھل جاتے تھے، اور پیر کی طرف کھینچتے تھے تو سر کھل جاتا تھا، حضورؐ نے فرمایا: سر ڈھانک دو اور پیر پر گھاس ڈال دو۔

ایک تو یہ صحابی ہیں، اور ایک دوسرے صحابی ہیں حضرت عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ، جب ان کا انتقال ہوا تو ترکے کا ایک بڑا حصہ وصیت میں جانے کے بعد اتنا سونا بچا تھا کہ چار بیویوں میں سے ایک بیوی کو (جس کو آٹھویں حصہ کا چوتھائی ملتا ہے) اتنا ملا تھا کہ بخاری میں ہم اس کا فیگر پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہیں، یہ بھی صحابی ہیں اور وہ بھی صحابی ہیں، مگر ایک صحابی کے ساتھ اللہ کا برتاؤ وہ ہے اور دوسرے صحابی کے ساتھ اللہ کا معاملہ یہ ہے، یہ اللہ کی شان ہے، اور اس میں مصلحت ہوتی ہے جس کوئی نہیں جان سکتا!

مکتبہ حجاز دیوبند

نبیوں میں حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت ایوب علیہم السلام کو دیکھو، بے حساب دولت اللہ نے ان کو دی تھی، اور کیسے دی تھی؟ بخاری میں قصہ آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ایوبؑ گھر کے صحن میں بارش میں نہا رہے تھے۔ اچانک سونے کی ٹڈیاں برسنے لگیں، حضرت ایوبؑ فوراً ٹوکرے میں ٹڈیاں بھرنے لگے، اللہ کے یہاں سے وحی آئی کہ ایوب ہم نے تو تمہیں بے حساب دولت دے رکھی ہے، پھر بھی تم دولت کے اتنے حریص ہو۔ حضرت ایوبؑ نے بہت اچھا جواب دیا: عرض کیا: پروردگار! آپ کی طرف سے جو چیز آئے اس سے میں کیسے صبر کر سکتا ہوں!

ایک طرف یہ انبیاء ہیں، دوسری طرف ہمارے آقا ہیں، دو دو مہینے گھر میں پکانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا، نہ آٹا نہ گوشت، بس کھجوروں اور بکریوں کے دودھ پر گذارہ ہوتا تھا!

اور حدیثوں میں یہ واقعہ بھی آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اللہ کا ایک فرشتہ آیا، اس نے اللہ کا سلام پہنچایا اور کہا: اللہ پاک آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ آپ عبد رسول بننا چاہتے ہیں یا ملک رسول؟ غلام رسول بننا چاہتے ہیں یا بادشاہ رسول؟ حضورؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف دیکھا، حضرت جبرئیلؑ نے اشارہ کیا کہ اپنے آپ کو چھوٹا کرو، چنانچہ حضورؐ نے اللہ کی بارگاہ میں جواب بھیجا کہ میں عبد رسول بننا چاہتا ہوں، ایک دن کھانا ملے تاکہ اللہ کا شکر بجالاؤں اور ایک دن فاقہ رہے تاکہ صبر کروں اور ثواب پاؤں۔ تو اللہ کا اُن نبیوں کے ساتھ یہ معاملہ تھا اور اپنے محبوب کے ساتھ یہ معاملہ، یہ اللہ کی حکمتیں ہیں وہ جانیں ہم کون حکمتوں میں دخل دینے والے ہیں۔

تو فرمایا: ﴿نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ﴾ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں۔ بہر حال تیسرا فرق یہ ہے کہ نیکی کا بدلہ آخرت میں ملتا ہے دنیا میں نہیں ملتا اور گناہ دنیا میں مٹتا ہے یا اس کی سزا مل جاتی ہے۔

اور سزا کا یہ سلسلہ اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے، اللہ کے جو بہت خاص بندے ہیں ان کا حساب اسی زندگی میں نمٹا دیا جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ جس بندے کے ساتھ اللہ کو

خیر منظور ہوتی ہے اس کو زندگی کے آخر میں الاؤں بلاؤں میں مبتلا کیا جاتا ہے اور صبر کی توفیق دی جاتی ہے، پھر جب وہ الاؤں بلاؤں کے ذریعہ تمام گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح قبض کرتے ہیں، غرض خاص بندوں کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ ہے کہ دنیا ہی میں قصہ نمٹ جاتا ہے۔

پھر اگر برائیاں بچ جائیں تو قبر میں عذاب ہوتا ہے، وہاں گناہ دھل جاتے ہیں، وہاں بھی اگر برائیاں بچ جائیں تو میدانِ محشر میں عذاب ہوتا ہے اور وہاں قصہ ختم ہو جاتا ہے اور اگر کسی بدنصیب کے گناہ اب بھی بچ جائیں تو اس کو سزا پانے کے لئے جہنم میں جانا ہوگا۔ پھر ایمان کی برکت سے جہنم سے نکل کر جنت میں آئے گا۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک حدیث لکھی ہے، وہ حدیث اب تک مجھے نہیں ملی مگر ہوگی کہیں، ان کی نظر ہماری نظر سے بہت وسیع تھی۔ حدیث یہ لکھی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کا اکثر عذاب قبر میں نمٹا دیا جاتا ہے۔

عذابِ قبر کا تذکرہ قرآن کریم میں:

یہاں کچھ بھائی کہتے ہیں کہ عذابِ قبر کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں نہیں تو کیا آسمان ٹوٹ پڑا؟ کیا ہر بات کا قرآن میں ہونا ضروری ہے؟ اگر ضروری ہے تو پھر حدیثوں کی کیا ضرورت ہے؟ یہ وہ فرقہ ہے جو خود کو اہل قرآن کہتا ہے، مگر حقیقت میں وہ اہل قرآن نہیں، منکر حدیث ہے۔

غرض: عذابِ قبر کا تذکرہ قرآن میں دکھانے کا ان کا مطالبہ صحیح نہیں، مگر ہم بتا دیتے ہیں۔ آج تراویح میں وہ آیات پڑھی گئی ہیں جن میں عذابِ قبر کا بیان اتنا صاف اور دوٹوک ہے کہ اس سے زیادہ واضح آیت نہیں ہو سکتی۔ جب فرعون اور اس کی قوم سمندر میں غرقاب ہو گئی تو ڈوبتے ہی نہایت سخت عذاب نے ان کو گھیر لیا ﴿فَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوْءُ الْعَذَابِ﴾ وہ عذاب کیا ہے؟ ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾ وہ عذاب دوزخ کی آگ ہے جس کے پاس فرعونیوں کو صبح و شام لے جایا جاتا ہے اور ان کو بتایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ تمہارا انجام ہے۔ ﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ﴾ اور جس دن قیامت برپا ہوگی ﴿اُدْخِلُوْا

آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ فرشتوں سے کہا جائے گا: فرعونیوں کو سخت عذاب میں ڈالو۔ صبح وشام ان کو جہنم کی زیارت کرائی جاتی ہے، آگ پر لیجایا جاتا ہے، یہی عذاب قبر ہے۔

مگر قبر میں صرف عذاب ہی نہیں ہوتا، راحتیں بھی پہنچتی ہیں، یاد کرو وہ حدیث کہ جب مؤمن بندہ تینوں سوالوں کے جواب دیدیتا ہے تو جنت کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے، اُدھر سے ہوائیں آنی شروع ہوتی ہیں، قبر ستر گز کشادہ کردی جاتی ہے اور فرشتہ کہتا ہے: دلہن کی طرح سوجا، دلہن جو پہلی رات میں سوتی ہے تو وہ سوتی نہیں، کسی کا انتظار کرتی ہے، شوہر کے انتظار میں سوتی ہے جو اس کی محبوب ترین شخصیت ہے، وہی اب کمرے میں آئے گا، اور وہی اس کو جگائے گا۔ پس فرشتے کہتے ہیں: دلہن کی طرح سوجا، اب تجھے تیری محبوب ترین شخصیت اللہ پاک ہی جگائیں گے، پس پورا مسئلہ یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کے لئے قبر میں راحتیں ہیں اور بدکاروں کے لئے عذاب ہے۔

الغرض: دنیا میں مؤمن کی سزا اگر نمٹ گئی تو آخرت میں کوئی سزا نہیں، اور اگر نہیں نمٹی تو قبر میں سزا ہے، وہاں نمٹ گئی تو قیامت کے دن کوئی سزا نہیں اور اگر وہاں بھی نہیں نمٹی تو قیامت کے بڑے دن میں سزا ہوگی، وہاں نمٹ گئی تو پھر آگے دوزخ میں نہیں جانا، اور پچاس ہزار سال کے دن میں بھی سزائیں نہیں نمٹیں تو اگر اللہ نے نہ بخشا اور سفارش کرنے والوں کی سفارش بھی اس کے حق میں قبول نہ ہوئی تو اسے باقی سزا پانے کے لئے جہنم میں جانا ہوگا۔

بہر حال میں مضمون یہ سمجھا رہا تھا کہ ہر مسئلہ کا قرآن میں ہونا ضروری نہیں، اسی لئے تو حدیثیں حجت ہیں کہ جو باتیں قرآن میں نہیں ہیں وہ حدیثوں میں ہیں، اور عذابِ قبر کے سلسلے میں حدیثیں اتنی ہیں کہ تواتر معنوی تک پہنچی ہوئی ہیں، مگر جن کو یہ حدیثیں ماننی ہی نہیں وہ مرغ کی ایک ٹانگ ہی گاتے رہیں گے! چونکہ آج تراویح میں عذابِ قبر سے متعلق یہ آیتیں پڑھی گئی تھیں اس لئے میں نے سوچا کہ آپ حضرات کی توجہ اس کی طرف منعطف کروں تاکہ آپ کا ذہن صاف رہے۔ وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

مسائل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) بے روزگاری کے وظیفہ کا حکم:

سوال: حکومت کی طرف سے بے روزگاروں کو جو وظیفہ ملتا ہے: اس کا لینا کیسا ہے؟

جواب: بے روزگاری کا وظیفہ (ویلفیر) لینے کی دو صورتیں ہیں:

ایک: مستحق کا لینا یعنی واقعی بے روزگار ہے تو لے سکتا ہے، اور وہ اس رقم کو ہر مصرف میں خرچ کر سکتا ہے۔

دوسری: غیر مستحق کا لینا، یعنی جو برسر روزگار ہے، ویلفیر کا مستحق نہیں، مگر اپنا ذریعہ معاش چھپا کر اور جھوٹ بول کر وظیفہ لیتا ہے تو یہ حکومت کے خزانے پر ایک طرح سے ڈاکہ ڈالنا ہے، اور اس کا حکم واضح ہے۔

مکتبہ حجاز دیوبند

(۲) حکومت بوڑھوں کو جو وظیفہ دیتی ہے: اس کا لینا جائز ہے:

سوال: یہاں (برطانیہ میں) ساٹھ سال کے بعد حکومت بوڑھوں کو وظیفہ دیتی ہے تو کیا اس رقم کو حج یا عمرہ میں استعمال کر سکتے ہیں؟ اور مسجد کے چندہ میں دے سکتے ہیں؟

جواب: حج بھی کر سکتے ہیں، عمرہ بھی کر سکتے ہیں اور مسجد کے چندے میں بھی دے سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ یہ ایک قانون ہے کہ جو ساٹھ سال کا ہو جائے اسے وظیفہ دیا جائے، پس اس قانون سے جو وظیفہ ملتا ہے: اسے لے کر استعمال کر سکتے ہیں۔

اور اگر کسی کے ذہن میں شبہ ہو کہ حکومت کا مال: معلوم نہیں کن ذرائع سے حاصل ہوتا ہے؟ ہوسکتا ہے وہ ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا ہو! ایسا مال ہمارے پاس آتا ہے، اس لئے اس کو حج یا عمرہ میں یا مسجد میں دینا کیسے مناسب ہوگا؟

اگر یہ شبہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ملکیت بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے، مثلاً ٹیکس کی

رقم گورنمنٹ نے لوگوں پر ظلم کر کے لی، یا جرمانہ کر کے لی تو گورنمنٹ مالک ہوگئی، پھر وہ بوڑھے کو دیتی ہے تو ملکیت بدل گئی، اور ملکیت بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

دلیل: حدیث شریف میں ہے: حضور اکرم ﷺ گھر میں تشریف لائے اور کچھ کھانے کو مانگا، چنانچہ روٹی اور سرکہ پیش کیا گیا، آپؐ نے فرمایا: گوشت پکنے کی خوشبو آرہی ہے، کیا ہمارا اس میں حصہ نہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ گوشت کسی نے بریرہؓ کو صدقہ دیا ہے (حضرت بریرہؓ ایک باندی تھیں ان کو حضرتِ عائشہؓ نے خرید کر آزاد کیا تھا، وہ آزاد ہونے کے بعد حضرت عائشہؓ کی خدمت میں رہتی تھیں اور ان سے پڑھتی تھیں، ان کو کسی نے خیرات دی تھی، وہ گوشت پک رہا تھا، اور حضورؐ کے لئے صدقہ حلال نہیں تھا) آپ نے فرمایا: لها صدقة، ولنا هدية: بریرہ کے لئے وہ گوشت صدقہ ہے، اور جب بریرہ ہمیں دیں گی تو وہ ہمارے لئے ہدیہ ہوگا یعنی اب ہمارے لئے اس کا استعمال جائز ہوگا۔ یہاں سے مسئلہ سمجھ میں آیا کہ ملکیت بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

دوسری مثال: زکوٰۃ دینے والے نے غریب کو زکوٰۃ دی، جب تک وہ رقم زکوٰۃ دینے والے کے پاس تھی: زکوٰۃ تھی، پھر جب وہ غریب کو دیدی اور وہ اس کی ملکیت میں چلی گئی تو وہ زکوٰۃ نہیں رہی، ملکیت بدل گئی، اب وہ غریب کسی مالدار کی دعوت کر سکتا ہے، اور کسی مالدار کو ہدیہ بھی دے سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی چوری کر کے مال لایا، اور اس نے کسی کو ہدیہ دیا یا دعوت کی درانحالیکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چوری کا مال ہے تو وہ ہدیہ لینا اور دعوت کھانا جائز نہیں، حرام ہے، کیونکہ آدمی چوری کے پیسے کا مالک نہیں ہوتا، پس اگر وہ دعوت کرتا ہے یا کسی کو ہدیہ دیتا ہے تو جائز نہیں۔

البتہ اگر چوری کا مال یا سود کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا دیا، اور اس طرح ملا دیا کہ کوئی امتیاز باقی نہ رہا تو دیکھا جائے گا کہ غالب مال کونسا ہے؟ حلال یا حرام؟ اگر غالب مال حلال ہے تو دعوت یا ہدیہ لینا جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔

اسی لئے کہتے ہیں: سود کی رقم غریب کو ثواب کی نیت کے بغیر دینا ضروری ہے، کیوں؟ اس لئے کہ سود کی رقم لینے والے کا مال کہاں ہے؟ کسی کی اپنی رقم ہو، اور وہ کسی غریب کو دے

اور ثواب کی نیت کرے تو ایک بات بھی ہے، مگر بینک سے جو سود ملتا ہے، لینے والا اس کا مالک نہیں ہوتا، جب مالک ہی نہیں ہوتا تو ثواب کی نیت کیسے درست ہوسکتی ہے؟

غرض میں بات یہ سمجھا رہا تھا کہ حضرت بریرہؓ کی حدیث سے یہ ضابطہ نکلا کہ ملکیت بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں اور میں نے یہ بھی سمجھایا کہ چوری کے مال میں اور سود کے مال میں ملکیت نہیں بدلتی، اس لئے اس کے احکام علاحدہ ہیں، جہاں ملکیت بدلتی ہے جیسے زکوٰۃ، صدقہ میں تو وہاں احکام بدلتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کا جو فنڈ ہے وہ اگرچہ مختلف طرح سے اکٹھا ہوتا ہے: جائز جگہوں سے بھی مال آتا ہے اور ناجائز جگہوں سے بھی، مگر پہلے گورنمنٹ اس کی مالک بنتی ہے، استیلاء سے حکومت مالک ہوجاتی ہے، پھر وہ بوڑھوں کو وظیفہ دیتی ہے، اس لئے اس کا لینا جائز ہے، اور ہر مصرف میں اس کو خرچ کرسکتے ہیں، حج بھی کرسکتے ہیں، عمرہ بھی کرسکتے ہیں اور مسجد کے چندے میں دے سکتے ہیں۔

(۳) غریب کے پاس جب تک مال بعینہٖ موجود ہو زکوٰۃ کی نیت کی جاسکتی ہے

سوال: ایک شخص بیمار ہے، ایک ماہ پہلے اس کا فون آیا، اور اس نے مدد طلب کی، وہ رشتہ دار ہے، یہاں سے کسی نے اس کو کچھ رقم بھیج دی، جب رقم بھیجی اس وقت کچھ نیت نہیں تھی، جس طرح رشتے داروں کا تعاون کرتے ہیں: اس طرح رقم بھیجی تھی، اب رمضان آیا، اس نے اپنا زکوٰۃ کا حساب کیا، اب وہ یہ چاہتا ہے کہ پہلے جو رقم بھیجی ہے اُسے زکوٰۃ میں گن لے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: زکوٰۃ کی نیت تین موقعوں پر ہوسکتی ہے:

ایک: جب حساب کیا، اور معلوم ہوگیا کہ ایک ہزار روپے زکوٰۃ واجب ہے۔ اس نے ہزار روپے نکال کر کسی ڈبے میں رکھ دیئے تو یہ نیت ہوگئی، اب وہ اس میں سے کسی کو پچیس روپے، کسی کو پچاس روپے دیتا رہا تو زکوٰۃ ادا ہوگئی، کیونکہ اس نے ڈبے میں جب رقم علاحدہ کی تھی اس وقت نیت کرلی تھی، اب خرچ کے موقع پر نیت ضروری نہیں۔

دوسرا موقعہ: کسی نے حساب کیا، اس کے ذمہ ایک ہزار روپے زکوٰۃ واجب نکلی، مگر اس نے رقم علاحدہ نہیں کی، پھر کسی کو پچاس روپے دیئے، اور دیتے وقت نیت کی، اور ڈائری میں

لکھ لیا کہ فلاں تاریخ کو پچاس روپے دیئے، اسی طرح پھر پندرہ دن کے بعد کسی غریب کو سو روپئے دیئے تو زکوٰۃ کی نیت کی اور لکھ لئے تو یہ صورت بھی صحیح ہے، اس کو کہتے ہیں: زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ نیت۔

تیسرا موقعہ: رقم علاحدہ بھی نہیں کی اور جب دی اس وقت بھی نیت نہیں کی، مگر غریب کے پاس ابھی دی ہوئی رقم بعینہٖ موجود ہے، خرچ نہیں ہوگئی تو جب تک وہ رقم بعینہٖ غریب کے پاس موجود ہے: نیت کرسکتا ہے۔ البتہ اگر رقم اس کے پاس سے ہلاک ہوگئی یا خرچ ہوگئی تو اب زکات کی نیت نہیں کی جاسکتی۔

بہرحال یہ تین مواقع ہیں نیت کرنے کے۔ اور صورتِ مسئولہ میں بظاہر وہ بھیجی ہوئی رقم بعینہٖ موجود نہیں ہوگی، کیونکہ یہ پرانا قصہ ہے، اس لئے اب زکات کی نیت نہیں ہوسکتی۔

اضافہ: درمختار میں ہے: وشرطُ صِحَّةِ أَدَائِها: نيةٌ مقارنة له أى للأداء، ولو كانت المقارنة حكما، كما لو دفع بلانية، ثم نوى، والمالُ قائم فى يد الفقير: زکات کی ادائیگی کی صحت کے لئے شرط: اداء کے ساتھ نیت کا مقارن ہونا ہے، اگرچہ مقارنت حکمی ہو، جیسے بغیر نیت کے دیا، پھر نیت کی درانحالیکہ مال غریب کے پاس (بعینہٖ) موجود ہے (تو یہ مقارنت حکمی ہے اس لئے زکات اداء ہوجائے گی)

(۴) سونے چاندی کے دانتوں کے ساتھ نماز درست ہے:

سوال: اگر دانت سونے کے ہوں تو نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: ہوسکتی ہے۔ دانت خواہ سونے کا ہو، چاندی کا ہو، لوہے کا ہو، پیتل کا ہو، کانسے کا ہو، کسی بھی دھات کا ہو نماز درست ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور یہ ایسا ہے: جیسے جیب میں سونے، چاندی یا لوہے وغیرہ کا کوئی ٹکڑا رکھ لیا جائے تو نماز درست ہے۔

اور اگر شبہ اس لئے ہے کہ سونے کا استعمال مرد کے لئے جائز نہیں، تو جاننا چاہئے کہ ضرورت کے وقت دانت میں سونے کا استعمال جائز ہے۔ حدیث میں ہے: ایک صحابی کی ایک جنگ میں ناک کٹ گئی تھی، انھوں نے چاندی کی ناک بنوائی، مگر اس میں بدبو ہوجاتی تھی۔ چنانچہ نبی ﷺ نے ان کو سونے کی ناک بنوانے کی اجازت دی، اس پر دانت کو

قیاس کیا گیا ہے، کیونکہ چاندی کا دانت کالا پڑ جاتا ہے، اس لئے دانت پر سونے کا خول چڑھانا جائز ہے۔

(۵) حرام گوشت کا پیسہ بھی حرام ہے:

سوال: کسی کا اپنا ریسٹورنٹ ہو، اس میں گوشت حرام ہو، مرغی اور گائے کا، تو کیا اس کا پیسہ بھی حرام ہے؟

جواب: یقیناً حرام ہے! جب حرام بیچے گا تو اس سے جو پیسہ آئے گا وہ بھی حرام ہوگا۔ وہ پیسے کیسے حلال ہو سکتے ہیں؟

اور یہ مسئلہ کہ اگر حلال آمدنی بھی ہو تو غالب کا اعتبار ہے: یہ مسئلہ ہوٹل والے کے لئے نہیں ہے، بلکہ وہ اگر کسی کی دعوت کرے یا ہدیہ چندہ دے تو اس دعوت کھانے والے کے لئے اور ہدیہ لینے والے کے لئے ہے کہ وہ ہدیہ قبول کرے یا نہ کرے؟ چندہ لے یا نہ لے؟ مگر ہوٹل والے کے لئے تو ایک پیسہ بھی حرام ہے، کیونکہ مٹکا بھرا ہوا دودھ ہو اس میں پیشاب کا ایک قطرہ ڈال دیا جائے تو سارا دودھ ناپاک ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر آدمی کی آمدنی میں ایک ڈالر بھی حرام کا آ جائے گا تو ساری آمدنی گندی ہو جائے گی۔

(۶) ایسی ہوٹل میں ملازمت کرنا جہاں حرام چیزیں بیچی جاتی ہیں:

سوال: کوئی ایسی ریسٹورنٹ میں مزدوری کرتا ہو جہاں حرام چیزیں (غیر مذبوحہ گوشت یا شراب) بیچی جاتی ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ تنخواہ جائز ہے یا نہیں؟ اور ایسی ہوٹل میں ملازمت کرنی چاہئے یا نہیں؟

جواب: تنخواہ خبث (گندگی) کے ساتھ جائز ہے، مگر ایسی جگہ نوکری نہیں کرنی چاہئے، دوسری متبادل نوکری تلاش کرنی چاہئے: جب مل جائے تو یہ نوکری چھوڑ دے، جیسے کوئی بینک میں ملازم ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے، کیونکہ بینک کی ملازمت جائز نہیں، وہاں سودی کاروبار ہوتا ہے، اور سود کے معاملہ میں جو کسی طرح کا بھی عمل دخل رکھتا ہے اس پر لعنت آئی ہے۔ لیکن اگر کوئی ملازمت کرتا ہے تو وہاں سے جو تنخواہ ملتی ہے وہ جائز ہے، کیونکہ بینک کے پاس

صرف سود ہی نہیں ہوتا، اور بھی ذرائع آمدنی ہوتے ہیں۔ بینک ڈرافٹ بناتا ہے اور فیس لیتا ہے جو جائز ہے، ایسے اور بھی کام ہیں، مگر بینک کا بڑا کاروبار سود پر رقمیں دینا ہے، اس لئے اس کی آمدنی میں سود بھی شامل ہوتا ہے اور ملازم کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ مجموعہ سے ملتی ہے، اس لئے تنخواہ جائز ہے، مگر اس میں خبث (گندگی) ہے، جیسے کھڑکی پر پیلا گلاس ہو تو سورج کی جو دھوپ آئے گی وہ پیلی آئے گی، اسی طرح بینک کی جو رقم تنخواہ میں ملے گی وہ خبث لے کر آئے گی، اسی طرح جس ہوٹل میں حرام چیزیں بیچی جاتی ہیں: اس کا بھی یہی معاملہ ہے۔

اور بینک کی ملازمت کے بارے میں مفتیانِ کرام نے یہ فتوی دیا ہے کہ فوراً وہ ملازمت نہ چھوڑے، دوسری متبادل ملازمت تلاش کرے، جب دوسری ملازمت مل جائے تو بینک کی ملازمت چھوڑ دے، اسی طرح اس ہوٹل کی ملازمت سے کنارہ کش ہو جائے، مگر پہلے دوسری ملازمت تلاش کر لے، پھر اس ملازمت کو چھوڑ دے۔

(۷) کوٹ پتلون کے ساتھ مسجد میں نماز کے لئے آنا:

سوال: ان ملکوں میں لوگ عام طور پر کوٹ پتلون پہنتے ہیں، یہاں کا عام لباس یہی ہے، پس مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آنے کا کیا حکم ہے؟ کیا اس لباس میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہیت تو نہیں؟

جواب: لوگ کام پر جانے کے لئے الگ کپڑے رکھتے ہیں، کوٹ، پتلون اور ٹائی باندھ کر جاتے ہیں، میں اس کو منع نہیں کرتا کہ یہ ایک مجبوری ہے، مگر لوگ جب مسجد میں آتے ہیں تو بھی یہی کپڑے پہن کر آتے ہیں: یہ ٹھیک نہیں، مسجد (اللہ کے گھر) میں اسلامی لباس پہن کر آنا چاہئے، اگر اس لباس میں ڈیوٹی پر نماز پڑھ لی تو کوئی حرج نہیں، مگر جب آپ کام سے فارغ ہو گئے، اور اپنے گھر آ گئے تو اب لباس بدل دینا چاہئے، پھر جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہو تو اسلامی لباس پہن کر آنا چاہئے۔

اور یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جیسے آفس میں جانے کے لئے یونیفارم ہے، اللہ کے دربار میں آنے کے لئے بھی ایک یونیفارم ہے، اور وہ اسلامی لباس ہے، کیونکہ انگریزی لباس کھڑے ہوئے ہونے کی حالت میں تو اچھا لگتا ہے، لیکن جب آدمی سجدے میں جاتا ہے تو

آدھا ننگا ہوجاتا ہے، اس لئے ایسا لباس پہن کر اللہ کے گھر میں نہیں آنا چاہئے۔

(۸) روزے میں بھول معاف ہے: نماز میں کیوں معاف نہیں؟

سوال: روزے میں بھول کر کوئی کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا، مگر نماز ٹوٹ جاتی ہے، فرق کیوں ہے؟

جواب: فرق اس لئے ہے کہ روزے کے سلسلہ میں حدیث ہے، اور نماز کے سلسلہ میں کوئی حدیث نہیں، اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ٹوٹ جائیں، مگر حدیث کی وجہ سے روزہ استحساناً نہیں ٹوٹتا۔ اور وہ یہ حدیث ہے: **عن أبی هریرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم أنه قال: إذا نَسِیَ أحدُکم، فأکل أو شَرِبَ، فلیُتِمَّ صومَه، فإنما أَطْعَمَهُ الله وَسَقَاه:** (متفق علیہ یعنی بخاری و مسلم کی حدیث ہے) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص بھول کر کھا پی لے تو وہ اپنا روزہ پورا کرے یعنی بھول کر کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اس کو اللہ ہی نے کھلایا پلایا ہے، یعنی وہ بے اختیار بھول گیا ہے، اور ایسی صورت میں کوئی مواخذہ نہیں۔

مگر بھول کب ہوتی ہے؟ جب روزہ لگا ہوا نہ ہو، بھوک پیاس لگی ہوئی نہ ہو، اور جب گرمیوں میں دوپہر کے بعد روزہ لگتا ہے تو بھول نہیں ہوتی۔ ہاں دو آدمیوں کو ہوتی ہے:

ایک: رمضان کے شروع میں بھول ہوجاتی ہے، پھر جب عادت ہوجاتی ہے تو بھول نہیں ہوتی۔

دوسرا: نفل روزے میں بھول ہوجاتی ہے۔ جو لوگ اللہ کے فضل سے نفل روزے رکھتے ہیں وہ کبھی بھول جاتے ہیں، کسی دوست کے یہاں گئے، چائی آئی، سب کے ساتھ اس نے بھی پی ڈالی، اور روزہ یاد نہیں رہا۔

لوگ نفل روزے کم کیوں رکھتے ہیں؟

مگر اب لوگوں نے نفل روزوں کی چھٹی کردی ہے، بیڑی، سگریٹ، پان، گٹکا، چائے وغیرہ لغویات کی جو عادت ہمیں پڑگئی ہے یہ نفل روزے نہیں رکھنے دیتی۔ یہ عادتیں سر پر

ایسی سوار رہتی ہیں کہ گیارہ مہینے گذر جاتے ہیں اور ہم کوئی نفل روزہ نہیں رکھتے، ورنہ سردیوں میں تو روزہ غنیمت باردہ ہے، نہ لگے بھوک نہ لگے پیاس اور ثواب ملے چوکھا! اور ٹھنڈی غنیمت وہ ہے جو لڑے بھڑے بغیر حاصل ہو۔ مگر ہائے رے بری عادتیں! وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں!

نماز میں لاعلمی اور بھول معاف نہیں:

بہر حال: بھول کر کھا پی لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، بلکہ روزہ مکروہ بھی نہیں ہوتا، اور نماز میں بھول ہو جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے، اگر بھول کر یا مسئلہ نہ جاننے کی وجہ سے کوئی کام نماز کے منافی کر لیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ حدیث میں ہے: حضرت معاویہ بن الحکم السُّلمی جو نو مسلم تھے جماعت میں آکر کھڑے ہوئے، نماز میں کسی نے چھینک لی تو انھوں نے کہا: یرحمك الله یعنی اللہ آپ پر مہربانی کرے۔ لوگوں نے انہیں گھورا، وہ پھر بولے: مجھے کیوں گھورتے ہو! لوگوں نے ران پر ہاتھ مارے، عربوں کے یہاں یہ اشارہ ہے کہ خاموش رہو، جیسے ہم لوگ منہ پر انگلی رکھتے ہیں، جب نماز پوری ہوئی تو نبی ﷺ نے ان کو بلایا، وہ فرماتے ہیں: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! آپؐ نے نہ مجھے ڈانٹا، نہ جھڑکا، بلکہ فرمایا: إن هذه الصلاةَ: لَايَصْلُحُ فيها شيئ من كلام الناس: نماز میں لوگوں کے کلام کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، یعنی جان بوجھ کر بات ہو، بھول کر ہو، تھوڑی ہو یا زیادہ: اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، پس دیگر منافی نماز چیزوں کو 'کلام' پر قیاس کیا جائے گا، ان سے بھی نماز فاسد ہو جائے گی مگر روزہ بھول کر کھانے پینے سے فاسد نہیں ہوگا۔

نماز اور روزے میں عقلی فرق:

اور عقلاً فرق یہ ہے کہ آدمی جب نماز پڑھتا ہے تو ایک خاص حالت میں ہو جاتا ہے، اس حالت میں بھول نہیں ہوتی، اور روزہ میں ایسی کوئی حالت نہیں ہوتی جو روزہ یاد دلائے، اس لئے روزہ میں بھول ہو جاتی ہے، اور اگر آپ کہیں کہ رمضان میں تو بھول نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ رمضان میں عادت پڑ جاتی ہے، اس لئے بھول نہیں ہوتی، مگر رمضان کے

بھی شروع میں اور نفل روزوں میں بھول ہوجاتی ہے، اس لئے شریعت نے بھول کو معاف کیا ہے اور نماز میں چونکہ ایسی حالت ہوتی ہے جو نماز کو یاد دلاتی ہے اس لئے نماز میں کلام کی گنجائش نہیں رکھی، کچھ بھی کلام کرے گا تو نماز فاسد ہوجائے گی۔

(۹) وضوء کے تین ضروری مسئلے:

عن لَقِيْطِ بْنِ صَبِرَةَ رضى الله عنه قال: يارسولَ اللّٰهِ! أخبرنى عن الوضوءِ؟ قَال: أَسْبِغِ الوضوءَ، وَخَلِّلْ بين الأصابع، وبالِغْ فى الِاسْتِنْشَاقِ، إلا أن تكون صائماً.

ترجمہ: حضرت لقیطؓ نے وضوء کے بارے میں پوچھا یعنی وضوء کا طریقہ پوچھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

۱- وضوء کامل کرو، وضوء کامل کرنے کے لئے دھونے کے اعضاء کو تین مرتبہ دھونا سنت کیا ہے، تاکہ ایک مرتبہ دھونا جو فرض ہے: کامل ہوجائے اور مسح میں چوتھائی سر کا مسح فرض ہے، مگر پورے سر کا مسح سنت کیا ہے، تاکہ ڈھنگ سے چوتھائی سر کا مسح ہوجائے۔

۲- اور انگلیوں کے درمیان خلال کرو، ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان بھی اور پیروں کی انگلیوں کے درمیان بھی۔ اور یہ حکم ان ملکوں میں جہاں پانی بہت کم ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے یہاں (برطانیہ میں) پانی بہت ہے، لیکن مفت نہیں ہے، پانی کے پیسے دینے پڑتے ہیں، پھر پانی کو گرم کرنے کے بھی پیسے دینے پڑتے ہیں۔

مگر میں دیکھتا ہوں: ایک آدمی وضوء میں پانچ آدمیوں کے بقدر پانی استعمال کرتا ہے، نل کھلا ہے، بیٹھا ہوا باتیں کررہا ہے یا مسواک کررہا ہے، اور پانی برابر جارہا ہے، مسواک سے فارغ ہونے تک ایک بالٹی پانی گرجاتا ہے، مگر اسے اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ نل بند کرے، حالانکہ پانی جو آتا ہے اس کے پیسے دینے پڑتے ہیں، پھر اس کو گرم کرنے کے الگ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔

اسی طرح مسجد میں بتیاں کھلی ہیں، جو پیشاب کرنے جاتا ہے: بتی کھلی چھوڑ کر آجاتا ہے، پوری رات بتیاں جلتی رہتی ہیں، جبکہ چاہئے یہ تھا کہ جب آدمی بیت الخلاء جائے تو بٹن

کھولے اور اپنی ضرورت پوری کرکے نکلے تو بتی بند کردے، بجلی مفت نہیں آتی، اس کے پیسے دینے پڑتے ہیں، اور آپ ہی دیتے ہیں، آپ کے چندے سے پیسے جاتے ہیں۔

میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا مصیبت ہے کہ یہاں کوئی بتی بند ہی نہیں کرتا! مسجد کا خادم بھی نہیں کرتا تو اس آدمی نے مجھے وجہ بتائی، اور وہ میری سمجھ میں آئی، اس نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اور اس کی بجلی کرایے میں شامل ہوتی ہے، اس لئے وہاں سے بری عادت پڑگئی ہے کہ جلنے دو ہمارا کیا بگڑتا ہے! یہ بات میری سمجھ میں آئی، جب بری عادت پڑجاتی ہے تو وہ سب جگہ چلتی ہے۔ اس لئے میرے بھائیو! اپنے کرایے کے مکان میں جو چاہو کرو، مگر مسجد میں مسجد کے مال کی حفاظت کرو۔

غرض: جہاں پانی زیادہ ہے اگر وہاں خلال کا اہتمام نہ کیا جائے تو بھی انگلیوں کے درمیان خشک رہنے کا احتمال کم رہتا ہے، مگر جن ملکوں میں پانی بہت کم ہے وہاں ذرا سے پانی سے وضوء کیا جاتا ہے، پس اگر وہاں انگلیوں کے بیچ میں دوسری انگلی ڈال کر رگڑ کر بھگائیں گے نہیں تو خشک رہنے کا احتمال رہے گا۔

مکتبہ حجاز دیوبند

۳- اور ناک اچھی طرح صاف کرو، جب ناک میں پانی ڈالو تو اس کو سانس کے ذریعہ اوپر چڑھاؤ، پھر ناک جھاڑو۔ مضمضہ اور استنشاق کا مقصد یہ ہے کہ منہ اور ناک صاف ہوجائیں، مسواک کرکے منہ اچھی طرح دھوؤ، تاکہ منہ کی بدبو زائل ہوجائے، پھر ناک کی آلائش صاف کرو، تاکہ اس کا تعفن ختم ہوجائے۔ پھر اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہوؤ۔

البتہ اگر کوئی روزے سے ہو تو پانی چڑھانے میں مبالغہ نہ کرے، پہلے سانس روک لے، پھر ناک میں پانی ڈالے، اگر سانس جاری ہوگا اور پانی چڑھائے گا تو پانی اوپر چلا جائے گا، اس لئے نبی ﷺ نے فرمایا: اگر روزہ ہو تو پانی ناک میں احتیاط سے چڑھاؤ کیونکہ پانی اگر دماغ میں چڑھ گیا تو روزہ فاسد ہوجائے گا۔

اسی طرح کبھی روزے کی حالت میں آدمی ندی کنویں میں اترتا ہے پھر ڈبکی لگاتا ہے، پس جو عادی ہے وہ تو عادی ہے وہ ناک نہیں بھی پکڑے گا: تو بھی پانی دماغ میں نہیں چڑھے

گا، لیکن اناڑی ایسا کرے گا: تو ممکن ہے پانی دماغ میں چڑھ جائے، اور پانی دماغ میں چڑھ گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

(۱۰) اگر علاج کے لئے بڑی رقم کی ضرورت ہو تو زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟

سوال: ایک شخص کا پڑوسی کھاتا پیتا آدمی ہے، لیکن اس کے لڑکے کا گردہ فیل ہو گیا ہے، اس لئے فوری گردہ بدلنے کی ضرورت ہے، مگر اس کے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ وہ گردہ خرید سکے، پس کیا اُسے زکوٰۃ کی رقم دینا جائز ہے؟

جواب: مالدار ہونے کی حالت میں زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں، اگر اس حالت میں دی جائے گی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اور جس پر قربانی، صدقۂ فطر واجب ہے یعنی چھوٹے نصاب کا مالک ہے: وہ مالدار ہے، اُسے زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ البتہ اگر وہ مقروض ہو جائے تو پھر دے سکتے ہیں۔ پس وہ کہیں سے قرض لے کر گردہ خرید لے، اور وہ مقروض ہو جائے تو اب زکوٰۃ کی رقم اس کو دے سکتے ہیں۔

(۱۱) قضا عمری پہلے پڑھے یا سنتیں نفلیں؟

سوال: ایک آدمی کی زندگی میں بہت سی نمازیں قضا ہوئی ہیں تو ایسے شخص کو نفلیں اور سنتیں پڑھنی چاہئیں یا قضا عمری پڑھنی چاہئے؟

جواب: ایسے آدمی کو پہلے قضا عمری پڑھنی چاہئے! پھر جب قضا عمری سے فارغ ہو جائے تو نفلیں، سنتیں پڑھے، کیونکہ فرض: فرض ہے۔ جو پچھلی نمازیں چھٹی ہیں ان کی قضا ضروری ہے۔ اور نفل: نفل ہے، اس کا مقام و مرتبہ بعد میں ہے، اس لئے اس شخص کو پہلے اپنی چھٹی ہوئی نمازوں کی تلافی کرنی چاہئے۔ سنتوں کی جگہ، نفلوں کی جگہ، تحیۃ الوضوء کی جگہ اور تحیۃ المسجد کی جگہ قضائے عمری پڑھے، پھر جب وہ اپنے اندازے کے مطابق فرض نمازیں قضا کر چکے تو دوسری نفلیں پڑھے۔